حضرت شیخ الحدیث

مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ

مکتبۂ اسلام

حضرت شیخ الحدیث

مولانا محمد زکریا صاحبؒ

یعنی عصر حاضر کے جلیل القدر عالم، محدث، مربّی، اور مرشدِ روحانی
حضرت مولانا محمد زکریا صاحب سہارنپوریؒ کے سوانح حیات، علمی وعملی
کمالات، اور ان کی دینی، اصلاحی، تربیتی خدمات کا مفصل تعارف
وجامع تذکرہ

از

مولانا ابوالحسن علی ندوی

بارسوم

ربیع الثانی ۱۴۲۴ھ — جون ۲۰۰۳ء

کتابت ــــــــــــ ظہیر احمد کاکوروی

طباعت ــــــــــــ کاکوری آفسیٹ پریس لکھنؤ

صفحات علاوہ انڈکس ــــــــــــ ۲۹۴

قیمت ــــــــــــ ۹۰/=

باہتمام

محمد غیاث الدین ندوی

طابع وناشر

مکتبۂ اسلام ۳۷ گوئن روڈ لکھنؤ

فہرست عناوین

"حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا سہارنپوریؒ"

باب سوم

تدریس و تصنیف، چند نازک امتحانات و اجازت و تکمیل ۶۶ - ۸۶

باب چہارم

سہارنپور کا مستقل قیام، تدریس و تصنیف، ارشاد و تربیت، حج کے اسفار اور چند اہم واقعات ۸۷ - ۱۲۱

باب پنجم

حضرت شیخ کی زندگی میں رمضان المبارک کا اہتمام و معمولات اور اس کے غیر معمولی اجتماعات ۱۲۲ - ۱۳۸

باب دہم

تصنیفات ورسائل پر ایک تبصرہ

باب یازدہم

۶۸۶ھ

در دست نہ تیر نیست نہ در دست کمان است
ایں سادگیِ اوست کہ بسمل دو جہان است
در مدرسہ از جُنبش لعلِ تو حکایت
در میکدہ از مستیِ چشمِ تو نشان است

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب کے مطالعہ سے پہلے

الحمد للہ وسلامٌ علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

امابعد!

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب نور اللہ مرقدہ کی سوانح کے سلسلہ کی یہ حقیر کوشش پیش کرتے ہوئے دل ودماغ دو متضاد تأثرات کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں۔ ایک تو مسرت وشکر کا جذبہ کہ خدا کے ایک مخلص ومقبول بندہ کے حالاتِ زندگی خدماتِ دینی وعلمی، اور کمالاتِ ظاہری وباطنی پر کچھ لکھنے کی سعادت حاصل کرنے کے سلسلہ میں جو کوشش کی گئی ہے، شاید وہ سعادت دارین کا سامان ہو جائے، بقول شاعر ؎

حکایت از قدِ آں یار دل نواز کنیم
بایں بہانہ مگر عمر خود دراز کنیم

ہندوستان نہیں بلکہ پورے عالم اسلام میں صدیوں سے جو دینی نظامِ تعلیم وتربیت کارفرما تھا اور جس کے حدود گھروں کی چہار دیواری سے لے کر مدارس وجامعات، حلقہائے درس، گوشہ ہائے تصنیف وتالیف، خانقاہوں کی پرسکون فضاؤں اور سعی وجہد کی متحرک وپرشور رزمگاہوں تک وسیع تھے، اس کی بنیاد اخلاص وللّٰہیت،

ایمان واحتساب، اساتذہ وشیوخ کے معاملہ میں کامل اطاعت وانقیاد، مربیوں ومحسنوں
کے مسئلہ میں مکمل تفویض وتسلیم، مقاصد زندگی کے بارے میں توکل، وقناعت، اعتماد علی اللہ
بلکہ ایثار وقربانی، محنت ومطالعہ اور حصول کمال کے سلسلہ میں استغراق وخود فراموشی،
معاصرین کے ساتھ تعلقات میں تواضع واعتراف، مختلف الخیال عناصر، افراد وجماعتوں
کے سلسلہ میں حسن ظن، التماس عذر اور جمع بین الاضداد کی قوت وصلاحیت، کمالات علمی
اور مدارج باطنی کے حصول میں علو ہمت ومجاہدہ، رفقائے کار وشرکائے حیات کے بارے
میں اپنے فرائض کی ادائیگی سے سروکار اور اپنے حقوق کے مطالبہ سے خاموشی پر تھی، اس
نظام تعلیم وتربیت کا (اپنی محدود معلومات اور کوتاہ نظر میں) بظاہر آخری نمونہ اور
جامع ترین پیکر حضرت شیخ الحدیث کی ذات تھی، اس لئے ان کی زندگی کی کوئی ہلکی سے ہلکی
تصویر پیش کرنا بھی اس دور کے تعلیمی وتربیتی عوامل واثرات کے (جو تدبیر الٰہی سے حضرت
شیخ کے دور طفولیت وشباب اور ان کے ماحول میں جمع ہو گئے تھے) بہترین نتائج کا
خاکہ اور خلاصہ پیش کرنا ہے، اور ایک ایسے دور کی تاثیر وکامیابی کی جلوہ نمائی کی کوشش
ہے، جو بظاہر حضرت شیخ کی وفات پر منتہی ہوتا ہے، اس لئے یہ عصر حاضر کے ایک باکمال
فرد کی سوانح نہیں، ایک مردم خیز دور، ایک مرد آفریں معاشرہ، ایک حیات بخش نظام تعلیم
وتربیت، اور ایک پرثمر اور شاداب شاخ ونہال کی آخری بہار کی کہانی ہے، اس لئے
سوانح نگار کی محنت وقوت مطالعہ اور ذمہ داری فرد واحد کی سوانح نگاری تک
محدود نہیں، اس سے کہیں زیادہ وسیع وعمیق اور نازک ہے، اور ان اوراق کو قارئین
کی خدمت میں پیش کرتے وقت دل ودماغ شدید طور پر اس بارے میں شبہ واضطراب
میں مبتلا ہیں کہ یہ فرض ادا ہو سکا یا نہیں؟

ابھی ساتھ رہ رہ کر یہ خیال دل میں چٹکی لیتا ہے، اور اس سے دل کے داغ تازہ ہو جاتے ہیں کہ اس بات کے پورے قرائن و آثار تھے کہ یہ سوانح خواہر زادہ عزیز گرامی مولوی سید محمد ثانی کے قلم سے نکلے گی، جنھوں نے حضرت شیخ کے حکم سے، پہلے حضرت مولانا محمد یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی ضخیم سوانح "سوانح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ" کے نام سے مرتب کی[۱] اور حضرت شیخ کی خوشنودی اور تحسین کا پروانہ حاصل کیا اور ان کی دعاؤں کی سعادت لی، پھر انھیں کے حکم سے ان کی شدید خواہش پر ان کے محبوب و مطاع، شیخ و مربی حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری کی سوانح حیات "حیات خلیل" کے نام سے تالیف کی،[۲] پھر حضرت شیخ ہی کے ایماء اور ان کی تسکینِ قلب کے لئے ان کے جواں سال و جواں مرگ و باکمال نواسہ مولوی محمد ہارون کی سوانح لکھی،[۳] ان تینوں کتابوں کی ترتیب و تالیف حضرت شیخ کے ان کے ساتھ تعلق خصوصی اور ان کی سوانح نگاری کی صلاحیت پر کلّی اعتماد کی دلیل تھی کہ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب سے تعلق و عقیدت رکھنے والے، ان کے ساتھ سفر و حضر میں رہنے والے سیکڑوں علماء اور بیسیوں اہلِ قلم کی موجودگی میں شیخ نے اس وسیع اور نازک کام کی تکمیل کے لئے ان کا انتخاب کیا، پھر حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی کے جیسے حضرت سہارنپوری کے باختصاص مرید و خلیفہ و کہنہ مشق مصنف کی تالیف کردہ "تذکرۃ الخلیل" کی موجودگی میں حضرت کی سوانح کے از سرِ نو ترتیب دینے کا حکم فرمایا، اور اس کام میں پوری رہنمائی و مدد فرمائی، پھر اس کا لفظاً لفظاً

---

[۱] یہ سوانح ۸۰۲ صفحات پر مشتمل ہے، اور ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ سے شائع ہو چکی ہے۔

[۲] مشتمل بر ۶۳۶ صفحات۔ [۳] مشتمل بر صفحات ۱۴۲

سن کر اظہار اطمینان کیا اور دعائیں دیں، خود اپنے متعلق بھی ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ "پیارے تو میری بھی سوانح لکھے گا"۔

لیکن قضاء وقدر کا فیصلہ دوسرا تھا، یہ کام وہ انجام نہ دے سکے اور اپنے شیخ کی وفات سے تقریباً تین مہینے پہلے خود سفر آخرت اختیار کیا، اپنے شیخ کی سوانح کی ترتیب کا ان کو موقعہ نہ مل سکا، لیکن حقیقت میں اس کام میں جو اس کتاب کی شکل میں آج قارئین کے سامنے ہے، ان کا بنیادی حصہ ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مولانا محمد یوسف صاحب کی وفات کے بعد جب انھوں نے اپنے شیخ کے حکم وایماء پر سوانح یوسفی کی تصنیف کا بیڑہ اٹھایا جو حضرت شیخ کے تذکرہ کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی تھی، تو انھوں نے اپنی فطری سعادت وتواضع کی بنا پر مجھ سے یہ فرمائش کی کہ یہ حصہ میں لکھ دوں، ان کو اپنے قلم سے حضرت شیخ جیسی باکمال ومختلف الجہات شخصیت کا تعارف کرانے میں جو اس وقت فضل خداوندی سے منصۂ حیات اور مسند ارشاد پر متمکن تھی، سخت تذبذب وحجاب محسوس ہوتا تھا، میں نے ان کی اس پریشانی کو دیکھ کر یہ مشکل کام اپنے ذمہ لے لیا، اس موقعہ پر "سوانح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی" کے مقدمہ میں میں نے جس طرح اس کا تذکرہ کیا ہے اس کو نقل کر دیتا ہوں:۔

> "میری یہ خوش بختی ہے کہ میرے بزرگوں اور محسنین نے مجھے اپنی خدمت میں اتنا بے تکلف اور جری بنا دیا ہے کہ میں ان سے ہر طرح کے سوالات کر سکتا ہوں، اور میں نے بارہا ان سے خود ان کے حالات پوچھنے کی جرأت کی، اور ان کی بزرگانہ شفقت نے مجھے مایوس نہیں کیا، حد یہ ہے کہ

مولانا محمد الیاسؒ سے جن کو اس تاریخ نویسی سے اپنے معاصر بزرگوں میں سب سے کم مناسبت تھی، اور جن کی زندگی سرتاپا دعوت وعمل تھی، ان سے پہلی ہی ملاقات میں میں نے ان کے حالاتِ زندگی دریافت کیے، اور انھوں نے نہایت بشاشت وشفقت کے ساتھ نہ صرف ان کا جواب دیا بلکہ مجھے ان کو نوٹ کرنے کا موقعہ بھی دیا، یہی معلومات مولانا کی سوانح کی بنیاد تھی۔

میں نے حضرت شیخ سے خطوط کے ذریعہ سوالات کر کرکے بہت سی قیمتی معلومات حاصل کیں، بہت سی باتیں زبانی پوچھ پوچھ کر نوٹ کیں، قدرتی طور پر ان کے لئے یہ ایک بہت بڑا مجاہدہ وایثار تھا، لیکن اس کو میری خوش قسمتی کہیے یا ہنرمندی، یا ان کی شفقت ودل نوازی، کہ میں نے اکثر ضروری معلومات حاصل کرلیں، اور ان کی مدد سے ان کی سوانح حیات کا ایک سرسری ومختصر خاکہ حاصل کرلیا[1]"۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر یہ ضروری کام تقدیرِ الٰہی سے اس وقت انجام نہ پاگیا ہوتا تو میرے لئے اس سوانح کی تکمیل کا کام بہت مشکل ہوتا اور اگر وہ انجام بھی پاجاتا تو وہ اتنا مستند وقابل اعتماد نہ ہوتا جتنا موجودہ صورت میں نظر آتا ہے، حضرت شیخ نے اپنی "آپ بیتی" میں جو سات حصوں میں مرتب ہوئی ہے، کہیں کہیں اس پر استدراک فرمایا ہے، جس کا جتنی زیادہ تر ان کی تواضع اور یہ جذبہ تھا کہ ذاتی حالات وکمالات سے زیادہ

---

[1] حضرت شیخ کی حالات کا یہ حصہ "سوانح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ" میں ۶۴ صفحات ۷۵-۱۳۹ میں آئے ہیں۔

ان پہلوؤں کو نمایاں کرنا چاہئے جن میں طلبائے علوم دینیہ، فضلائے مدارس اور طالبین اصلاح کے لئے سبق اور پیغام ہے، پھر بھی ناچیز مصنف نے آپ بیتی کے اس پورے سلسلہ کو سامنے رکھ کر ان تشنہ گوشوں کی تکمیل کر دی ہے، جن کی "آپ بیتی" میں نشاندہی کی گئی ہے، یہ پورا حصہ (صرف زمانہ حال کو زمانہ ماضی کے صیغہ میں تبدیل کرکے کہ وہ حالات شیخ کی زندگی میں لکھے گئے تھے) اس سوانح میں تحلیل کر دیا گیا ہے، اور وہی اس سوانح کا اصل تار پود ہے۔

اس مضمون کے علاوہ جو سوانح یوسفی سے اخذ کرکے شامل کیا گیا ہے، حالات کا بڑا ماخذ شیخ کی "آپ بیتی" کا سلسلہ، ان کی اردو تصنیفات، اور شیخ کے باختصاص ارادت مندوں اور معتقدین کے مرتب کئے ہوئے سفروں کے حالات خصوصاً وہ قلمی مواد ہے، جو جنوبی افریقہ اور انگلستان کے سفروں کے موقعوں پر خصوصی خدّام و رفقائے سفر نے قلمبند کئے، آخری مرض و وفات کے سلسلہ میں بھی مصنف کے سامنے وہ مستند معلومات اور خطوط رہے ہیں، جو مدینہ طیبہ سے اہل تعلق کو لکھے گئے تھے، خاندانی معلومات کے سلسلہ میں مصنف نے خود اپنی کتاب "مولانا محمد الیاس صاحبؒ اور ان کی دینی دعوت" پر بنیاد رکھی ہے، جس کا یہ حصہ (خاندانی حالات) دونوں جلیل القدر شخصیتوں کے حالات کا مشترک حصہ ہے، مولانا احتشام الحسن صاحب کاندھلوی کی کتاب "حالات مشائخ کاندھلہ" بھی پیش نظر رہی ہے، جو بعض تاریخی مسامحات اور خامیوں کے باوجود (جن کی طرف کتاب میں اشارہ کر دیا گیا ہے) خاندانی حالات کا اچھا ماخذ ہے، اس سلسلہ میں مصنف نے اسی خاندان والاشان کے ایک صاحب علم و تحقیق جواں سال فرد مولوی نور الحسن راشد صاحب کے اس مقالہ سے استفادہ کیا اور ان کی محنت و تحقیق سے فائدہ اٹھایا جو انھوں نے حضرت شیخ کے

آباؤ اجداد اور خاندان کے تعلق کے سلسلہ میں "الفرقان" کے خصوصی نمبر کے لئے سپرد قلم کیا تھا اور از راہ عنایت مصنف کو بھی اس کی ایک نقل دے دی تھی، بعض دوسری معلومات، اولاد و احفاد اور پس ماندگان کے سلسلہ میں مصنف مولانا محمد شاہد صاحب مظاہری کا ممنون ہے کہ وہ اس کے استفسارات کے جوابات دیتے رہے، اور حضرت شیخ کی تصنیفات و رسائل کا پورا ذخیرہ اس کے پاس بھیج دیا، پس ماندگان پر اس کتاب میں جو نوٹ ہے، وہ پورا انھیں کے قلم کا لکھا ہوا ہے۔

ناچیز مصنف کو حضرت شیخ کی خدمت میں ۱۹۴۰ء کی ابتداء سے نیاز حاصل ہے، ان کی اُس کے حال پر جو شفقت و عنایت خصوصی رہی ہے، اور اپنے گرامی ناموں میں جس طرح اس کا اظہار فرمایا ہے، اس کے بارے میں اس کے سوا کچھ نہیں لکھ سکتا کہ ؎

بہر تسکیں دل نے رکھ لی ہے غنیمت جان کر
جو بوقتِ ناز کچھ جنبش ترے ابرو میں تھی

آمد و رفت و مراسلت کا سلسلہ پورے اکتالیس ۴۱ بیالیس ۴۲ سال قائم رہا، اپنی سی پوری کوشش کی کہ طویل سے طویل مکتوب گرامی سے لے کر چھوٹے چھوٹے پرچے تک کوئی ضائع نہ ہونے پائے یہ دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا کہ یہ شفقت نامے جو ذاتی محبت و تعلق کے علاوہ بیش قیمت آراء، گراں قدر مشوروں و رہنمائیوں اور قیمتی سوانحی معلومات، نیز دلی جذبات و خیالات کے آئینہ دار ہیں، سو فی صدی محفوظ رہے، لیکن ان کی تعداد ۳۵۰ سے کم نہیں، ان خطوط کے مطالعہ سے خاص طور پر اس کتاب کے باب نہم "خداداد کمالات، یگانہ مزاجی و طبعی خصوصیات" میں بڑی مدد ملی۔

آخر میں یہ عرض کر دینا ضروری اور طالب علمانہ اور مصنفانہ دیانت کا تقاضہ ہے کہ

اس کتاب میں ان تفصیلات و جزئیات سے احتراز کیا گیا ہے جو کسی شیخ مقبولِ بارگاہِ الٰہی و رسالت پناہی، اور روحانی مراتب عالیہ پر فائز شخصیت کی سوانح حیات کا اصل مواد و مضمون سمجھا جاتا ہے، یعنی خوارق و کرامات، مبشرات و منامات کی تفصیل جن کا پوری تفصیل و اطناب کے ساتھ ذکر کرنا اولیاء اللہ اور مشائخ پیشین کے قدیم سوانح نگاروں کا شیوہ رہا ہے، اور جن کی وجہ سے صاحب سوانح کے انسانی اخلاق، علمی و ذہنی کمالات، تعلیم و تدریس یا تصنیف و تالیف، معاصرین کے ساتھ تعلقات، روزمرہ کے معمولات، ان کی وسیع النظری، وسیع القلبی، حقیقت پسندی، اسلام کے لئے فکر مندی اور اہل اسلام کے لئے دردمندی پردے کے پیچھے چھپ کر یا ان کے بوجھ کے نیچے دب کر رہ گئی ہے، اور اسی بنا پر ان کے عہد اور ان کے بعد کے زمانہ کا علمی ذوق رکھنے والا اور قابل تقلید نمونہ اور قابلِ اتباع زندگی کا طالب و متجسس طبقہ ان کتابوں کے مطالعہ سے اکثر محروم اور ان کے کمالات کے دیکھنے سے محجوب رہا ہے، اندیشہ ہے کہ بعض قارئین کو اس کتاب میں یہ باب تشنہ نظر آئے گا، ہم اس جنس کے طلب گاروں کو (جو خدا کی ایک موہبت اور نسبت عالی کا کرشمہ ہے) ان رسائل و مقالات کے مطالعہ کا مشورہ دیں گے، جو شیخ کی زندگی اور ان کی وفات کے بعد خاص اسی مقصد کے لئے لکھے گئے ہیں[1] کوشش کی گئی ہے کہ اس کتاب کے ذریعہ اس علمی و فکری طبقہ کو بھی حضرت شیخ کے کمالات، ان کی جامعیت، ان کے علمی و تصنیفی مرتبہ، ان کی اخلاقی بلندی، ان کے علمی و تصنیفی انہماک، دینی کوششوں، اور تعلیمی اداروں سے گہرے تعلق، فکر مندی و دل سوزی، علوم دینیہ، عقائد صحیحہ اور مسلکِ حق کی اشاعت سے دلی شغف، مسلمانوں کے حال و مستقبل کی فکر اور رجوع الی اللہ اور اتباع شریعت و سنت کی دعوت اور اس کے لئے جدوجہد کا اندازہ ہو، اور اس کتاب کو پڑھ کر

[1] مثلاً "محبوب العارفین و بہجۃ القلوب وغیرہ - از صوفی محمد اقبال ہوشیار پوری

اس کے اندر عمل کا جذبہ بیدار ہو، اپنی خامیوں اور کمزوریوں کا احساس ہو، ہمت میں بلندی، قلب و نظر میں وسعت، وقت کی قیمت اور زندگی کی کوتاہی کا شعور، عمل نافع اور باقیات صالحات کے ذخیرہ کا شوق و آرزو پیدا ہو۔

اس کتاب کو پڑھ کر قارئین کو اگر صاحب سوانح اور مصنف سوانح میں وہ تفاوت عظیم اور وہ مسافت طویل نظر آئے جس کی بنا پر ان کو اس سوانح کی تصنیف کے لئے ــــــــ اس بے بضاعت مصنف کے انتخاب پر اعتراض اور انتخاب کرنے والوں کے صحت انتخاب میں (جن میں عزیز گرامی قدر مولوی محمد طلحہ صاحب خلف الرشید حضرت شیخ پیش پیش رہے ہیں) شبہ اور اشکال ہو تو مصنف اس کے جواب میں عرفی کا یہ شعر پڑھ کر خاموش ہو جائے گا ؎

امید ہست کہ بیگانگئ عرفی را
بہ دوستئ سخنہائے آشنا بخشند

ابوالحسن علی
دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

۲۶ محرم الحرام ۱۴۰۳ھ
۱۳ / نومبر ۱۹۸۲ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب اوّل

خاندان، جدّ بزرگوار مولانا محمد اسمٰعیل صاحبؒ اور ان کے صاحبزادگان

شرفائے جھنجھانہ وکاندھلہ

جھنجھانہ اور کاندھلہ کا یہ خاندان جس سے حضرت مفتی الٰہی بخش صاحب اور ان کے اخلاف (مولانا ابوالحسن صاحب، مولانا نورالحسن صاحب، مولانا مظفر حسین صاحب سے لے کر مولانا انعام الحسن صاحبؒ امیر جماعت تبلیغ تک) اور حکیم کریم بخش صاحبؒ اور ان کے اخلاف (جن میں مولانا محمد اسماعیل صاحب اور ان کے فرزندان و نبیرگان مولانا محمد صاحب، مولانا محمد یحییٰ صاحب، مولانا محمد الیاس صاحب اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ اور مولانا محمد یوسف صاحب شامل ہیں) دوآبہ کا مشہور و محترم صدّیقی شیوخ کا خاندان ہے[1] جس میں ہر دور میں صاحب علم و فضل، اہل ارشاد اور اصحاب وجاہت پیدا ہوتے رہے، "حالات مشائخ کاندھلہ" (تالیف مولانا احتشام الحسن صاحب) کے پیش لفظ میں راقم نے اس خاندان کی امتیازی شان اور اس کی مردم خیزی پر حسب ذیل الفاظ میں اظہار خیال کیا تھا، اس موقعہ پر اس کا نقل کرنا بے محل نہ ہوگا:۔

"ہندوستان کے ان چیدہ و برگزیدہ خاندانوں میں جو صدیوں تک علم و فضل

---

[1] مکتوب حضرت شیخ الحدیثؒ

اور ذہانت و ذکاوت کے گہوارے رہے ہیں، صدیقیوں کا ایک وہ خاندان بھی ہے، جس کا اصل وطن جھنجھانہ ضلع مظفر نگر اور وطن ثانی کاندھلہ ضلع مظفر نگر ہے، یہ گھرانہ ان خوش قسمت خاندانوں میں سے ہے، جن کو اللہ تعالیٰ نے قبولیت و عنایت سے نوازا، اس خاندان کی بنیاد کچھ ایسے صدق و اخلاص پر پڑی تھی کہ صدیوں تک یکے بعد دیگرے اس میں علماء و فضلاء، و اہلِ کمال اور مقبولین پیدا ہوتے رہے، علوئے استعداد و علوئے ہمت اس کی خاندانی خصوصیت ہے اور انھیں دو چیزوں نے اس خاندان کو ایسا شرف و امتیاز عطا کیا کہ ہر دور میں اس میں باکمال اور اکابرِ رجال پیدا ہوتے رہے، عُلوِّ استعداد و عُلوِّ ہمت نے اس خاندان کے افراد میں علمی جامعیت اور تبحر کی شان پیدا کی، اور انھوں نے اپنے اپنے وقت میں مروّجہ علوم اور اکثر اصنافِ کمال کی طرف توجہ کی، اور ان میں دست گاہ پیدا کی، اس کی وجہ سے اس میں بلند پایہ فقیہ و مفتی، جامعِ معقول و منقول عالم، قادر الکلام شاعر، اور حاذق طبیب پیدا ہوئے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خاندان کے تلمذ نے اتباعِ سنت، اصلاحِ عقائد و اعمال کا ذوق، اور اشاعتِ علم کا جذبہ پیدا کیا، حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا، اور توحید و اتباعِ سنت کے ساتھ جذبۂ جہاد و سرفروشی کا اضافہ کیا، حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی کے یگانۂ روزگار ورع و تقویٰ اور ان کی بلند ہمتی و جفاکشی نے مردوں کے ماسوا بیبیوں اور بچیوں میں بھی احتیاط و تورّع اور ذکر و عبادت کا ذوق پیدا کر دیا۔

پھر اس خاندان کی بڑی خصوصیت یہ رہی کہ اس نے اپنے موروثی فضل و کمال، اور سلسلۂ روحانی کے باوجود اپنے اپنے زمانے کے مقبول مشائخ اور خاصانِ خدا سے جو اپنے فن کے امام، اور اپنے زمانہ میں مرجع خلائق تھے، استفادہ و انتساب میں تأمل نہیں کیا، حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے بعد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ حضرت شاہ عبد الرحیم صاحب رائے پوریؒ اور دوسرے معاصر بزرگوں سے اس خاندان کے اہلِ کمال اور اہلِ طلب برابر منسلک اور وابستہ ہوتے رہے، اور یہ سلسلہ بحمد اللہ اب تک جاری ہے، اور یہ اس کے صدقِ طلب و علو ہمتی کی دلیل ہے۔

اس خاندان کی قبولیت اور اس پر اللہ تبارک و تعالیٰ کی جو نگاہِ عنایت ہے، اس کی کھلی ہوئی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے اس دور میں اس خاندان سے دعوت و اصلاح کا وہ عظیم الشان کام لیا جس کی نظیر اس وقت عالمِ اسلام میں ملنی مشکل ہے، مشہور تبلیغی دعوت تحریک کا یہی خاندان سرچشمہ و منبع ہے، اسی خاندان میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ جیسی شخصیت پیدا ہوئی جس سے اللہ تعالیٰ نے اس دور میں تجدیدی شان کی خدمت لی، اور جن کے اخلاص، علو ہمت، علو نظر، مجاہدہ اور قربانیوں کے اثرات و برکات، اور فیوض و ثمرات اس وقت دنیا کے ایک بڑے حصہ میں پھیلے ہوئے ہیں، اور ان کے بعد ان کے خلف الرشید مولانا محمد یوسف صاحب اس کی توسیع و تکمیل میں مشغول ہیں[1] ان کا

---

[1] سطور بالا جب لکھی گئیں تو حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ حیات اور اپنی تبلیغی سرگرمیوں اور جماعت کی سرپرستی و نگرانی میں مصروف و سرگرم تھے، رحمہ اللہ تعالیٰ۔

صدق واخلاص، ان کا توکل واعتماد، ان کی صحبت کی تاثیر، ان کا جذبہ و جوش، اور ان کا مجاہدہ و جدوجہد مشاہدہ کی حیثیت رکھتی ہے، جس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں کہ "عیاں راچہ بیان"۔ اسی طرح حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب دامت برکاتہم کی ذات گرامی اسلاف اور ان کے کمالات کی زندہ یادگار، اور اپنے خاندان کے علوہمت، مجاہدہ وجامعیت اور اخلاق کی ایک جیتی جاگتی تصویر، اور دور ماضی کے واقعات کی تصدیق ہے۔[1]

اس خاندان کے بزرگوں میں حکیم محمد اشرف صاحب کے حالات (بزرگان پیشین کے مقابلہ میں) قرب زمانی اور ان کی وجاہت اور شہرت کی وجہ سے زیادہ نمایاں اور محفوظ ہیں اس لئے انہیں سے ابتدا کی جاتی ہے۔

مولانا حکیم محمد اشرف رح

آپ جھنجھانہ ضلع مظفر نگر کے رہنے والے اور عہد شاہجہانی کے مشہور بزرگ تھے، جن کے علم وفضل، زہد وتقویٰ، اتباع شریعت پر ہمعصر علماء اور مشائخ متفق تھے، ان کا سلسلۂ نسب شیخ قطب شاہ تک اس طرح ہے:۔

مولوی محمد اشرف بن شیخ جمال محمد شاہ بن شیخ بابن شاہ، بن شیخ بہاء الدین شاہ بن مولوی شیخ محمد بن شیخ محمد فاضل، بن شیخ قطب شاہ۔[2]

---

[1] "حالات مشائخ کاندھلہ" از مولانا احتشام الحسن صاحب ص ۵-۶ پیش لفظ وتعارف۔ از راقم سطور۔

[2] تحریر قلمی حضرت شیخ الحدیث (خاندانی شجرہ میں صرف شیخ قطب شاہ تک درج ہے "حالات مشائخ کاندھلہ") ص ۹ مولوی نور الحسن صاحب کاندھلوی کی (جو اس خاندان کے ایک ذی علم اور تحقیق کا خاص ذوق رکھنے والے نوجوان ہیں) تحقیق کے مطابق شجرے کے آخر میں مذکورہ دونوں شخصیتوں شیخ محمد فاضل اور شیخ قطب شاہ کا اس خاندان سے کوئی تعلق نہیں یہ دونوں نام الحاقی ہیں، ان کی تحقیق میں خانوادۂ مولانا محمد اشرف جھنجھانوی، قاضی ضیاء الدین سنامی کی اولاد میں ہے۔ (باقی ص ۲۲ پر)

مولانا حکیم محمد اشرف کی اولاد میں کثیر التعداد علماء و فضلاء، مشائخ طریقت، بلند پایہ فقیہ و مفتی، جامع معقول و منقول عالم، قادر الکلام شاعر، اور حاذق طبیب مسلسل پیدا ہوتے رہے، مولانا حکیم محمد اشرف کے حالات نہایت رفیع اور اولیائے کاملین کے سے ہیں، جن سے خوارق کا بھی ظہور ہوا ہے، ان کے مؤثر واقعات اس خاندان کے فرد فرید حضرت مفتی الٰہی بخش نے اپنی قلمی بیاض میں تحریر کئے ہیں، نمونۃً ایک واقعہ تحریر کیا جاتا ہے جس سے ان کے استغناء، اور دنیا سے بے رغبتی کا حال معلوم ہوگا:۔

"شاہجہاں بادشاہ نے جب آپ کے کمالات کا شہرہ سنا تو ملاقات کا مشتاق ہوا، اور آپ کو بلانے کے لئے پالکی اور کچھ لوگوں کو جھنجھانہ بھیجا، آپ علی الصباح نماز فجر پڑھ کر دوپٹہ کمر پر باندھ کر دہلی کی طرف روانہ ہوئے، بادشاہ کی طرف سے شہر کے دروازہ پر آدمی استقبال کے لئے متعین تھے، آپ کی روانگی کی اطلاع پاکر انھوں نے آگے بڑھ کر آپ کا استقبال کیا، اور آپ نے اس امیر کی ہمراہی میں جو آپ سے پہلے سے واقف اور معتقد تھا، بادشاہ سے ملاقات کی، بادشاہ نے اپنے وزیر سعد اللہ خاں علامی سے کہا کہ مولوی صاحب کا امتحان کرنا چاہئے، فاضل وزیر نے متفرق علوم کے متفرق سوالات کئے، اور ہر علم میں یگانۂ روزگار پاکر بادشاہ سے عرض کیا شیخ کو میں نے ایسا بحر ذخار پایا جس کا کہیں کنارہ نہیں۔"

(باقی ص۲۱ کا) ——— مولانا شیخ محمد سے شجرہ اس طرح ہو جاتا ہے:۔

مولانا شیخ محمد ابن مولانا کریم الدین ذکر بن امام تاج ذکر بن امام حاج بن قاضی ضیاء الدین شامی۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ مولانا شیخ محمد سے قاضی ضیاء الدین شامی تک سلسلۂ نسب فرمان سلطان محمد شاہ بن فیروز شاہ تغلق م ۷۹۶ھ (مکتوبہ ۲۲ رجب ۷۹۳ھ) کی پشت پر لکھا ہوا ہے جو خاندان میں محفوظ ہے

شاہجہاں بادشاہ نے اسی وقت علاقہ جھنجھانہ میں دو ہزار بیگہ پختہ زمین کا فرمان تیار کرا کے آپ کی خدمت میں پیش کیا، آپ نے اس کو قبول نہیں فرمایا، اور کہا، ہمارا رازق خدا ہے نہ کہ بادشاہ، بادشاہ کے پاس آیا ہوں، املاک وجائیداد کے حصول کی طلب وخواہش بالکل نہیں، اور نہ اس کے لئے آیا ہوں[1]۔

مولانا حکیم محمد اشرف کے ایک صاحبزادہ ــــ کا نام حکیم محمد شریف تھا، یہ بزرگوار بھی علم وفضل اور اتباع شریعت میں اپنے والد ماجد کے قدم بقدم تھے، مولانا حکیم محمد شریف کے دو صاحبزادے ہوئے، ایک مولانا حکیم عبد القادر جن کی اولاد میں اہل کمال اور علماء وفضلاء بڑی تعداد میں گزرے ہیں، خصوصاً مفتی الٰہی بخش اور ان کے نامور بھتیجے مولانا مظفر حسین کاندھلوی ممتاز ترین علماء وفضلاء وقت میں سے تھے، دوسرے صاحبزادہ مولانا محمد فیض تھے، جن کا قیام جھنجھانہ میں رہا، ان کی اولاد میں مولانا محمد اسماعیل کاندھلوی، مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی، ان کے فرزند شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی، داعی الی اللہ مولانا محمد الیاس کاندھلوی، اور ان کے صاحبزادہ مولانا محمد یوسف کاندھلوی جیسے اہل فضل وکمال، اور بلند پایہ بزرگ پیدا ہوئے۔

جھنجھانہ اور کاندھلہ کی دونوں شاخیں مولوی محمد شریف صاحب پر جاکر مل جاتی ہیں، پھر الگ الگ صدیوں تک بارآور اور پُرثمر رہتی ہیں، اس اتصال اور انفصال کو سمجھنے کے لئے یہاں دونوں شاخوں کا مختصر شجرہ پیش کیا جاتا ہے، جو خود حضرت شیخ الحدیث کا مرتب کیا ہوا ہے[2]۔

---

[1] "حالات مشائخ کاندھلہ" ص ۱۵-۱۶ بحوالہ "عجائب الہند" از مولانا محمد ساجد۔

[2] تحریر قلمی حضرت شیخ؛ محفوظہ مرقومہ خطوط دارائے بریلی، تحریر بعینہٖ نقل کی گئی ہے، اس لئے نام بھی اسی طرح لکھے گئے ہیں، جیسے اس میں درج ہیں۔

مولوی محمد شریف

مولوی محمد فیض — عبد القادر

مولوی محمد فیض
مولوی محمد ساجد
حکیم غلام محی الدین
حکیم کریم بخش
غلام حسین — غلام حسن
غلام حسین
مولوی اسماعیل
مولوی محمد — مولوی محمد یحیٰی — مولانا محمد الیاس صاحب
مولوی محمد یحیٰی
محمد زکریا (شیخ الحدیث)
مولانا محمد الیاس صاحب
مولانا محمد یوسف صاحب

عبد القادر
قطب الدین
شیخ الاسلام
محمود بخش — مفتی الٰہی بخش

محمود بخش
مظفر حسین
بی بی امۃ الرحمٰن
بی بی صفیہ

مفتی الٰہی بخش
مولوی ابو الحسن
مولوی نور الحسن

ضیاء الحسن — محمد صادق — محمد ابراہیم — محمد اکبر — محمد سلیمان
شمس الحسن — رؤف الحسن — صفیہ — آمنہ — امۃ الکریم
صفیہ
محمد الیاس — محمد یحیٰی

کاندھلہ سے تعلق[1]

قاضی شیخ محمد جو سلطان (ابو الفتح) محمد ابن فیروز تغلق کے زمانہ میں کاندھلہ کے قاضی اور خطیب تھے، ان کی اولاد میں انھیں کے ہم نام شیخ محمد مُدرّس ایک بہت بڑے عالم و فاضل اور اپنے وقت کے صاحب درس بزرگ گزرے ہیں، ان کی صاحبزادی خان بی بی کے ساتھ جھنجھانہ کے مذکور الصدر گھرانے کے مولانا حکیم عبد القادر کی جو مولانا حکیم محمد شریف ابن حکیم محمد اشرف کے صاحبزادہ تھے، شادی ہوئی ان کے دو صاحبزادے ہوئے (۱) مولانا حکیم قطب الدین (۲) مولانا حکیم شرف الدین۔

مولانا حکیم قطب الدین جھنجھانہ کے شرفاء و زعماء میں تھے، اور اطراف میں ان کا بڑا اثر تھا، اللہ تعالیٰ نے دینی بزرگی کے ساتھ ساتھ دنیاوی وجاہت بھی عطا کی تھی، ان کی شادی بھی کاندھلہ میں اسی گھرانے میں ہوئی جس گھرانے میں ان کے والد حکیم عبد القادر کی ہوئی تھی، ان کی بیوی شیخ ضیاء الحق ابن شیخ محمد مُدرّس کی بیٹی تھیں، ان کے تین صاحبزادے ہوئے (۱) مولانا حکیم شیخ الاسلام (۲) شیخ محمد مشائخ (۳) شیخ صدر الدین، مؤخر الذکر دونوں بزرگ

---

[1] کاندھلہ کی آبادی کی تقریب اس طرح ہوئی کہ ۲۲ رجب ۷۹۳ھ میں سلطان محمد شاہ بن فیروز شاہ تغلق شکار کے لئے موجودہ کاندھلہ کی آبادی کے قریب آیا، اسی اثناء میں جمعہ کا دن آگیا، سلطان موصوف نے کاندھلہ کی آبادی اور جامع مسجد کی تعمیر کا حکم دیا، فوراً جامع مسجد تعمیر کی گئی، جمعہ کے وقت سلطان نے آکر خود حصہ لیا، اور موجودہ وقت کے ایک فاضل اور باکمال عالم قاضی شیخ محمد ابن مولانا کریم الدین (جو قاضی ضیاء الدین سنامی کی اولاد میں تھے) کو للعسکر بیگہ زمین کا فرمان دے کر قضاء، امامت، خطابت، مناکحت کا منصب عطا کیا، اور قصبہ کی آبادی پر مامور کیا، اور پھر ان کی اولاد نے بود و باش اختیار کر لی۔ ("حالات مشائخ کاندھلہ بترمیم" ص ۱۸)

جھنجھانہ ہی میں رہے۔

مولانا شیخ الاسلامؒ

مولانا شیخ الاسلامؒ علم وفضل میں ممتاز تھے، اور بڑے بڑے علماء ان کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

مولانا شیخ الاسلام کے چارؒ صاحبزادے ہوئے (۱) مفتی الٰہی بخش (۲) شاہ کمال الدین (۳) مولوی امام الدین (۴) مولوی محمود بخش، یہ چاروں صاحبزادے علم وفضل میں یگانۂ روزگار اور مرجع خلائق تھے۔

مولوی امام الدین، مفتی الٰہی بخش سے چھوٹے تھے، اور ذکاوت وذہانت اور علمی قابلیت میں ممتاز تھے "میر زاہد" "ملا جلال" کی شرح "حاشیہ امور عامہ" "رسالہ نسب اربعہ" "مختصر کافیہ" اور منطق وفلسفہ کی مختلف کتابوں پر مختصر حاشیے یادگار ہیں، ——— ایک فرزند مولانا حکیم اشرف یادگار چھوڑا، جو مفتی الٰہی بخش کے داماد ہوئے، وہ طلب علم میں اپنے ہم عصروں میں ممتاز تھے اور نبض شناسی میں فائق، ان کے صاحبزادہ مولوی حکیم محمد مشرف بھی اپنے زمانہ کے مشہور اطباء میں شمار ہوتے تھے۔

مولانا شیخ الاسلام کے دوسرے صاحبزادے مولانا کمال الدین کو ریاضت اور مجاہدہ کا خاص ذوق تھا، اور زہد وتقویٰ میں ممتاز تھے، مفتی الٰہی بخش نے ان کا ایک واقعہ لکھا ہے:-

"سخت سردی کی راتوں میں آدھی رات کو اٹھ کر ٹھنڈے پانی سے وضو کر کے نماز تہجد میں مشغول ہو جاتے' ایک دن میں نے ان سے کہا کہ اس سخت سردی میں اٹھنا اور ٹھنڈے پانی سے وضو کرنا بہت دشوار ہے' تم روزانہ کس طرح کرتے ہو! وہ بولے روزانہ جب میں وضو سے فارغ ہوتا ہوں تو وسوسۂ شیطانی اور نفسانی دل میں آتے ہیں کہ کل کو سردی میں نہ اٹھوں گا، نوافل کے لئے اتنی سخت اذیت اٹھانا دشوار ہوتا ہے' جب اگلی رات آتی ہے' اور چکی پیسنے والیوں کی آواز کان میں آتی ہے تو میں بے قرار ہو کر اٹھ جاتا ہوں کہ سبحان اللہ اس سخت سردی میں اپنے دن کی روزی کی خاطر آدھی رات سے اٹھ کر صبح تک بھاری پتھر کی چکی کے پاٹ کو کس محنت و مشقت کے ساتھ گھماتی ہیں! میرے لئے (جس کی روزی کی کفالت بے محنت و مشقت حق تعالےٰ نے اپنے ذمہ رکھی ہے) ——— مروت سے بعید تر ہے کہ خواب غفلت میں سوتا رہوں' اور اپنے رازق کا شکر ادا نہ کروں' میں نے جب سنا تو سمجھ گیا کہ بیدار دل شخص ہے[1]"

اس کے علاوہ جود و کرم' ایثار' مروت و عفت، خدمت خلق، مسافر کی خبرگیری میں بڑے مستعد تھے عمر بھر سماع، مزامیر اور مجالس لہو و لعب سے پرہیز رکھا۔

مفتی الٰہی بخش صاحب

مولانا حکیم شیخ الاسلام کے نامور فرزند' اور مرجع خلائق بزرگ عالم تھے، ۱۱۶۲ھ میں پیدا ہوئے' اور ۱۲۴۵ھ میں ۸۳ سال کی عمر میں وفات پائی' حضرت شاہ

---

[1] "حالات مشائخ کاندھلہ" صہ ۲۳

عبدالعزیز دہلوی کے ممتاز ترین شاگردوں میں تھے، اپنے وقت کے نامور صاحبِ فتویٰ، صاحبِ درس، و صاحبِ تصنیف تھے، کامل طبیب اور علوم عقلیہ و نقلیہ میں اعلیٰ دستگاہ رکھتے تھے، عربی و فارسی اور اردو نظم پر استادانہ قدرت تھی، جس کی شاہد ان کی تصنیف کردہ کتاب "شرح بانت سعاد" ہے، جس میں حضرت کعب رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے ہر عربی شعر کا ترجمہ عربی، فارسی اور اردو شعر میں کیا ہے، عربی، فارسی کی تقریباً ساٹھ تصانیف یادگار ہیں، "شمیم الحبیب" اور مثنوی مولانا روم کا تکملہ سب سے زیادہ مشہور ہیں۔

حضرت سید احمد شہیدؒ سے تعلق اور ان کی تحریک سے وابستگی

مفتی صاحب تعلیم کے بعد حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ ہی سے بیعت ہو گئے تھے، حضرت سید احمد شہیدؒ کی تشریف آوری[1] پر باوجود کبر سنی[2] اور سید صاحب سے ۳۸-۳۹ سال بڑے ہونے کے رجوع کیا، اور بڑے اخلاص اور للٰہیت کے ساتھ استفادہ کرتے رہے[3]،

---

[1] سید صاحبؒ کے کاندھلہ پہونچنے کی تاریخ ۷ ربیع الاول ۱۲۳۴ھ ہے۔

[2] مصنف "حالات مشائخ کاندھلہ" کی تحریر کے مطابق اس وقت مفتی صاحب کی عمر ۱۷ سال سے متجاوز تھی، مفتی صاحب کی پیدائش ۱۱۶۲ھ کی ہے، اور سید صاحب کی کاندھلہ تشریف آوری ۱۲۳۴ھ میں ہوئی۔

[3] شیخ کامل کی موجودگی میں اس کے قوی النسبت خلفاء سے استفادہ، اور ان سے توجہ اور فیض حاصل کرنے کی مثالیں ائمہ تصوف اور مشائخ کبار کی سوانح و حالات میں بہت ملتی ہیں، بعض اوقات خود شیخ بیعت اپنے کسی خاص مرید کو اس کی ہدایت کرتا ہے کہ میرے فلاں مسترشد سے استفادہ کرو، اس کی ایک واضح مثال وہ ہے جو مولانا کرامت علی صاحب جونپوری نے اپنے رسالہ "نور علی نور" میں لکھی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ "مولانا عبدالحی صاحبؒ بڈھانوی نے فرمایا: کہ میں سلوک الی اللہ مشاہدہ حاصل کرنے کا بڑا اشتیاق تھا، (باقی ص۲۹ پر)

حضرت سید احمد شہیدؒ سے پہلی ملاقات کی داستانِ جذب و شوق خود مفتی صاحبؒ کی زبان سے سنئیے:۔

"ناگاہ از مدد غیبی بہ اعانت سعادت ازلی، صیت کمالات و قوت تکمیل و طنطنۂ ارشادات، و سرعت تاثیر جزیل و جمیل سید احمد حسنی مقتفی آثار و قدم بر قدم محمد مدنی صلے اللہ علیہ و آلہ و سلم جان بخش گوش و ہوش، و دل نواز سامعہ حقیقت نیوشش گردید، و نشۂ اشتیاق درک صحبتِ سر آمد اولیائے آفاق چنداں دو بالا گشت، کہ طائرِ صبر از آشیانۂ دل پرید، و از بے قراری جامۂ آرام بر تن درید۔[۱]

(باقی ص۲۸ کا) میں نے مولانا شاہ عبد العزیز صاحب قدس سرہ سے (جو مولانا کے استاد اور پھوپھا اور خسر بھی تھے) عرض کیا کہ مجھکو آپ سلوک الی اللہ تعلیم دیجئے، میں بہت سے ہندی اور ولایتی فرزندوں سے توجہ لے چکا تھا، مگر میرا مقصود حاصل نہ ہوا تھا حضرت مولانا نے فرمایا کہ میاں میں بہت بوڑھا اور کمزور ہوا، مجھ میں بہت دیر تک بیٹھنے کی طاقت نہیں یہ مقصد تمہارا امیر احمد صاحب سے حاصل ہوگا، میں اور حضرت میاں صاحب (سید صاحب) اور میاں محمد اسمٰعیل مدرسہ کے ایک ہی مکان میں رہا کرتے تھے ایک شب میں نے میاں صاحب سے عرض کیا کہ حضورؐ جیسی نماز صحابۂ کرامؓ ادا کرتے تھے ویسی دو رکعت مجھ سے ادا ہو (اس کے بعد مولانا نے اس خشوع اور استحضار اور کیفیات باطنی کے حصول کا قصہ بیان کیا جو سید صاحب کی توجہ سے ان کو حاصل ہوئیں) وہ فرماتے ہیں کہ میں دن کو حضرت مولانا شاہ عبد العزیزؒ کے پاس گیا، اور رات کا قصہ بیان کیا، اور اپنے سید صاحب سے بیعت کرنے کا ذکر کیا، آپ نے فرمایا "بارک اللہ بارک اللہ" خوب کیا، میں نے عرض کیا کہ حضرت یہ کون طریقہ کہلاتا ہے فرمایا: میاں ایسے لوگ کسی طریقہ کے محتاج نہیں ہوتے ایسے لوگ جو زبان سے کہیں وہی طریقہ ہے۔ (انتہی باختصار تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو سیرت سید احمد شہیدؒ ج اول ص۱۴۵-۱۴۹) [۱] ترجمہ: "مددِ غیبی اور سعادت ازلی کی دستگیری سے سید احمد حسنی (جو حضرت محمد صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے سچے پیرو، اور آپ کی اتباع میں کامل و راسخ القدم ہیں) کے کمالات و قوت تکمیل کا شہرہ، اور ان کے

(باقی ص۳۰ پر)

اس کے ساتھ ہی ساتھ حضرت سید احمد شہیدؒ کی مدح و توصیف میں بکثرت اشعار کہے، دو غزلوں کے چند چند شعر لکھے جاتے ہیں ؎

یارب احوال دل خستہ ندانم چہ شود | میر احمد نرسد گر بمدد گاری ما
اے نشاط ار چہ ضعیفی طلبِ ہمت کن | از و سید بر حق کہ کند یاری ما

جناب سید احمد کہ باشد فیض ربانی | بساں مہر انور می کند ہر ذرہ نورانی
مجدد الف ثانی شد جناب احمد اول | مجدد مائۃ ثالث را جناب احمد ثانی
بخُلق احمدی کامل بنور ایزدی واصل | نمود اندر رضائے حق رضائے خویش را فانی

مفتی صاحبؒ نے حضرت سید احمد شہیدؒ کے طریقہ و اذکار میں ایک کتاب بھی تصنیف فرمائی جس کا نام "ملہمات احمدیہ" ہے، جس کو "صراط مستقیم" کا خلاصہ کہنا صحیح ہوگا۔[1]

مفتی الٰہی بخش کے دونوں صاحبزادے مولانا ابو الحسن صاحب اور مولانا ابو القاسم صاحب سید صاحب کے دست گرفتہ اور معتقد و مخلص تھے، مولانا ابو الحسن حضرت سید صاحب کے ایسے عاشق و محب تھے کہ سید صاحب کے حج سے واپسی پر ایک قصیدہ کہا جو پورا کا پورا عشق و محبت

(باقی ص۲۹ کا) ارشادات و سرعت تاثیر کا غلغلہ اچانک کان میں پڑا، اور جاں بخش اور دل نواز ہوا، اس سر آمد اولیائے روزگار کی زیارت و صحبت کا شرف حاصل کرنے کا شوق اتنا غالب ہوا کہ دامن صبر ہاتھ سے چھوٹ گیا اور سکون و آرام رخصت ہو گیا"۔

[1] کتاب کا پورا نام "ملہمات احمدیہ فی الطریقۃ المحمدیہ" ہے، یہ ۱۲۹۹ھ میں یمین الدولہ وزیر الملک نواب محمد علی خاں والی ٹونک کی فرمائش پر مطبع مفید عام آگرہ سے شائع ہوئی، کتاب کی ضخامت ۴۴ صفحات متوسط سائز ہے، کتاب میں سید صاحب سے ملاقات اور کاندھلہ میں آمد کی تاریخ درج ہے، جو ۷ ربیع الاول ۱۲۳۴ھ ہے (ص ۳۰)

اور تعلق کے جذبات سے بھرا ہے[۱]، اس طویل قصیدہ کے چند شعر بطور نمونہ کے لکھے جاتے ہیں، اہلِ قافلہ (سید صاحب کی جماعت) کے دینی و اصلاحی اثرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

جس طرف دیکھئے تعمیرِ مساجد ہے گی ۔۔۔ ہے ہر اک شخص کی تحقیقِ مسائل پہ نظر
آتی ہر سمت سے ہے بانگِ مؤذن کی صدا ۔۔۔ جس کو سنئے یہی کہتا ہے اللہ اکبر
اس قدر عصر میں تیرے ہوئی افراطِ نماز ۔۔۔ لاکھوں تیار ہوئے ملک میں چھوٹے منبر
قطعِ بدعات ہوئی فیض سے تیرے ایسی ۔۔۔ ہند سے رسمیں بری اٹھ گئیں ساری یکسر
دیکھئے جس کو سو کرتا ہے کلام اللہ یاد ۔۔۔ باندھی ہر شخص نے تہذیب و ہدایت پہ کمر

مفتی صاحب کے دو نواسے مولانا محمد مصطفےٰ جھنجھانوی اور مولانا محمد صابر جھنجھانوی نے جو مفتی صاحب کے شاگرد اور تربیت یافتہ تھے، حضرت سید صاحبؒ سے صرف محبت ہی کا تعلق نہیں رکھا، بلکہ ان کے ہمراہ جہاد کرنے بھی تشریف لے گئے، مولانا مصطفےٰ نے تو شہادت حاصل کرلی[۲]، اور مولانا محمد صابر واپس تشریف لائے اور ساری زندگی اسی جد و جہد میں گزار دی،

[۱] مکمل قصیدہ "سوانح احمدی" (از مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری) میں منقول ہے، "سیرت سید احمد شہیدؒ" جلد اول میں اس قصیدہ کے ۸۲ اشعار نقل کئے گئے ہیں (ملاحظہ ہو پندرھواں باب جلد اول) مہر صاحب کی کتاب "سید احمد شہیدؒ" میں بھی قصیدہ کا بڑا حصہ منقول ہے، آخری شعر میں شاعر کا تخلص آیا ہے ؎

ہو حسن بھی ترے الطاف سے ممنون سدا ۔۔۔ رہے جمعیت باطن سے نہایت خوش تر

اس خاندان کے بزرگوں سے تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ قصیدہ مولانا ابو الحسن صاحب ہی کا ہے، جو حسن تخلص کرتے تھے، اور کاندھلہ کے خاندانی کاغذات میں موجود ہے "حالات مشائخ کاندھلہ" میں بھی اس کے ۳۶ ابیات منقول ہیں ص ۱۳۹-۱۴۲

[۲] حالات مشائخ کاندھلہ ص ۲۰۵ بحوالہ "سفینۂ رحمانی"، "سید احمد شہیدؒ" تالیف مولانا غلام رسول مہر میں شہدائے بالاکوٹ میں، نمبر ۱۳۱ پر ان کا نام درج ہے۔

مولانا حیرت لکھتے ہیں:۔

"ہمہ عمر در سربراہی و امداد و اعانتِ قافلۂ میر سید احمد شہیدؒ مرحوم گزرانید[1]"۔

اسی کا اثر تھا کہ کاندھلہ اور جھنجھانہ کا یہ پورا خاندان حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کی تحریک کا گرویدہ تھا، گھروں میں اندر یا باہر، چھوٹا ہو یا بڑا، مرد ہو یا عورت، سب کی زبانوں پر اسی تحریک کا چرچا، اور حضرت سید احمد شہیدؒ کا تذکرہ تھا۔

مولانا محمد ساجد جھنجھانوی

مولانا حکیم محمد شریف کی اولاد میں دوسری شاخ مولانا محمد فیض سے چلی جن کے نامور فرزند مولانا حکیم محمد ساجد جھنجھانوی تھے، جو ۱۱۲۰ھ میں پیدا ہوئے، بڑے صاحبِ فضل و کمال اور متبحر عالم اور حاذق طبیب تھے، مفتی الٰہی بخش کاندھلوی نے ان کے متعدد دفتاوے نقل کئے ہیں، شاہجہاں بادشاہ نے جو دو ہزار بیگھہ معافی کا فرمان ان کے جدِ امجد مولانا حکیم محمد اشرف کی خدمت میں پیش کیا تھا، اور جس کو موصوف نے قبول نہیں کیا تھا، وہ پھر حکیم مولانا محمد ساجد کی خدمت میں پیش کیا گیا، جو آپ نے قبول فرمالیا[2]، اس طرح آپ دینی اور علمی کمال کے ساتھ ساتھ دنیوی عزت و وجاہت کے مقام پر بھی فائز تھے، آپ نے ایک کتاب بھی تصنیف کی جس کا نام "عجائب الغرائب" تھا، شعر و سخن سے بھی ذوق رکھتے تھے، آپ کے ایک فرزند تھے، جن کا نام حکیم غلام محی الدین تھا، اور ان کے بھی ایک فرزند حکیم کریم بخش نامی تھے، حکیم کریم بخش کے دو فرزند ہوئے۔ (۱) شیخ غلام حسن (۲) شیخ غلام حسین۔

---

[1] "سفینۂ رحمانی"، ترجمہ: "ساری عمر حضرت سید احمد شہیدؒ کے قافلہ کی سربراہی اور اعانت و ہمراہی میں گزار دی"۔

[2] "حالات مشائخ کاندھلہ" ص۲۰۵، مولوی نور الحسن راشد صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ یہ فرمان مولانا محمد اشرف کے صاحبزادگان کے نام ۱۰۵۶ھ میں جاری ہوا تھا، بارھویں صدی ہجری کے وسط میں اس کی تجدید و توثیق ہوئی۔

مولانا محمد صابر اور مولانا محمد مصطفےٰ الشہیدؒ اور ان کی اولاد

شیخ غلام حسن کی شادی حضرت مفتی الٰہی بخش کی صاحبزادی سے ہوئی، جن سے دو فرزند تولد ہوئے (۱) مولانا حافظ محمد صابر (۲) مولانا حافظ محمد مصطفےٰ شہید۔

مولانا محمد صابر درویش صفت، صوفی منش، عابد و زاہد بزرگ تھے، حضرت سید احمد شہیدؒ کے ہمراہ معرکۂ جہاد میں شرکت کی، اور واپسی کے بعد ساری زندگی سید صاحب کے قافلہ کی امداد و اعانت میں گزار دی، ایک فرزند چھوڑا جن کا نام حافظ محمد عبداللہ تھا، جو زہد و تقویٰ میں اپنے والد کے قدم بقدم تھے، دل میں جہاد کا شوق رہتا، آخر میں بینائی جاتی رہی، ہر وقت ان کی زبان پر یہ فقرہ رہتا "کوئی بندوق دے دو جہاد کو جاتا ہوں"[1]۔

آپ نے دو فرزند چھوڑے (۱) حافظ محمد یوسف (۲) حافظ محمد یونس، اللہ تعالیٰ نے ان دونوں بزرگوں کو خیر و صلاح کا وافر حصہ عطا فرمایا تھا، صاحبِ "حالات مشائخ کاندھلہ" نے ان دونوں بزرگوں کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:-

"ان دونوں بزرگواروں کا ابتدائی زمانہ تو بسلسلۂ ملازمت باہر گزرا، لیکن اپنے اخیر دور میں کاندھلہ کی زینت اور نمونۂ سلف تھے، نورانی شکلیں، ایمانی باتیں، اسلامی اطوار و عادتیں، وضع داری، احباب نوازی، ملنساری، ہر ایک کی ہمدردی اور خیر خواہی اور غم گساری، ان دونوں بھائیوں کی نمایاں خصوصیات تھیں، اور دونوں دیندار، متقی، پرہیزگار، تہجد گزار بزرگ تھے"[2]۔

حافظ محمد یوسف کی پہلی اہلیہ سے تین صاحبزادیاں ہوئیں، جن میں دو کی یکے بعد دیگرے

---

[1] حالات مشائخ کاندھلہ ص ۲۰۷ [2] ایضاً

مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی سے شادی ہوئی، جن میں دوسری اہلیہ سے مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیثؒ ہیں۔[1]

جدّ بزرگوار مولانا محمد اسماعیل صاحبؒ اور ان کے صاحبزادگان

حضرت شیخ الحدیث کے دادا مولانا محمد اسماعیل صاحب (بن مولوی غلام حسین صاحب) دہلی کے باہر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مرقد کے قریب چونسٹھ کھمبے کے نام سے جو تاریخی عمارت ہے، اس کے سرخ پھاٹک پر ایک عمارت میں رہا کرتے تھے۔

آپ کا قدیم آبائی وطن (جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے) جھنجھانہ ضلع مظفر نگر تھا، لیکن پہلی بیوی کے انتقال کے بعد آپ نے مفتی الٰہی بخش صاحب کاندھلوی کے خاندان میں (جو آپ کے یک جدی تھے) عقد ثانی کر لیا تھا جس کی وجہ سے کاندھلہ برابر آمد و رفت رہتی تھی، اور وہ بھی وطن کی طرح ہو گیا تھا۔

مولانا محمد اسماعیل صاحب، مرزا الٰہی بخش صاحب (مرزا ہدایت افزا بہادر) کے جو بہادر شاہ کے سمدھی تھے، بچوں کو پڑھاتے تھے، پھاٹک کے اوپر کے مکان میں رہتے تھے، متصل ہی ایک چھوٹی سی مسجد تھی، جس کے سامنے مرزا الٰہی بخش صاحب کی نشست گاہ تھی، جس پر ٹین پڑا ہوا تھا، اسی بناء پر اس کو بنگلہ والی مسجد کہتے تھے، مولانا اپنی زندگی عزلت اور گمنامی اور عبادت میں گزار رہے تھے، خود مرزا الٰہی بخش صاحب کو ان کے مرتبہ کا احساس اس وقت ہوا جب مولانا کے مستجاب الدعوات ہونے کا ان کو ذاتی تجربہ ہوا۔

---

[1] خاندان کے تعارف میں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ زیادہ تر خواہرزادۂ عزیز مولوی محمد ثانی مرحوم کی کتاب "سوانح مولانا محمد یوسفؒ" سے معمولی لفظی ترمیم اور چند اضافوں کے ساتھ منقول ہے۔

ذکر و عبادت، آئے گئے مسافروں کی خدمت اور قرآن مجید و دین کی تعلیم شب و روز کا مشغلہ تھا، خدمت و تواضع کا یہ عالم تھا کہ جو مزدور بوجھ لادے ہوئے پیاسے ادھر آنکلتے ان کا بوجھ اتار کر رکھ دیتے، اپنے ہاتھ سے ڈول کھینچ کر ان کو پانی پلاتے پھر دو رکعت نماز شکرانہ ادا کرتے کہ اے اللہ تو نے مجھے اپنے بندوں کی اس خدمت کی توفیق دی، میں اس قابل نہ تھا، عام اجتماع و ہجوم کے زمانہ میں پانی اور لوٹوں کا خاص اہتمام رکھتے، اور رضائے الٰہی اور قربت خداوندی کا ذریعہ سمجھ کر خلق خدا کی راحت رسانی، اور خدمت میں مشغول رہتے۔[1]

مولانا ہر وقت ذاکر و باخدا رہتے تھے، مختلف اوقات و حالات کے متعلق حدیث میں جو اذکار و اوراد آئے ہیں ان کی پابندی کرتے تھے، اور آپ کو اس طرح مرتبۂ احسان حاصل تھا۔[2]

ایک مرتبہ آپ نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے طریق سلوک کے حصول کی خواہش کی، مولانا نے فرمایا کہ آپ کو اس کی حاجت نہیں، جو اس طریق اور ان ذکر و اذکار کا مقصود ہے، وہ آپ کو حاصل ہے، اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص قرآن مجید پڑھنے کے بعد یوں کہے کہ قاعدہ بغدادی میں نے نہیں پڑھا اس کو بھی پڑھ لوں۔[3]

مولانا کو قرآن مجید کی تلاوت، اور ورد سے خاص شغف تھا، پرانی تمنا تھی کہ بکریاں چراتا رہوں، اور قرآن پڑھتا رہوں، رات کو اس کا خاص اہتمام تھا کہ گھر والوں میں سے کوئی نہ کوئی جاگتا رہے، ۱۲-۱ بجے تک منجھلے صاحبزادہ مولانا محمد یحییٰ صاحب مطالعہ میں مشغول رہتے، اس وقت مولانا محمد اسماعیل صاحب بیدار ہو جاتے، اور مولانا محمد یحییٰ صاحب سو جاتے، پچھلے پہر بڑے صاحبزادے مولانا محمد صاحب کو بیدار کر دیتے۔[4]

---

[1] روایت مولانا محمد الیاس صاحبؒ [2] ارواح ثلاثہ [3] روایت مولانا محمد الیاس صاحبؒ، بعض تاریخی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی سے بیعت اور غالباً صاحب اجازت تھے، دار العلوم دیوبند کی روداد ۱۳۱۶ھ میں آپ کو جانشین مولانا مظفر حسین لکھا گیا ہے (افادہ مولوی راشد صاحب کاندھلوی) [4] ایضاً

طبیعت اتنی صلح کل واقع ہوئی تھی کہ کسی کو آپ سے کوئی شکایت نہ تھی، بے ہمہ ایسے تھے کہ اللہ نے با ہمہ بنا دیا تھا، آپ کی للّٰہیت، خلوص و بے نفسی ایسی آشکارا تھی کہ دہلی کی مختلف الخیال جماعتیں جو اس زمانہ میں ایک دوسرے سے سخت متوحّش و متنفر تھیں اور ان میں سے ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنے کا روادار نہ تھا، ان کے پیشواؤں کو آپ پر یکساں اعتماد اور آپ کی ذات سے بلا اختلاف عقیدت تھی۔[1]

میوات سے تعلق بھی آپ کی حیات میں شروع ہوا، اس کی تاریخ یہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ تلاش و فکر میں نکلے کہ کوئی مسلمان آتا جاتا نظر پڑے تو اس کو مسجد میں لے آئیں، اور اس کے ساتھ جماعت سے نماز پڑھ لیں، چند مسلمان نظر آئے، ان سے پوچھا کہ کہاں جاتے ہو؟ انھوں نے کہا مزدوری کے لئے! کہا کیا مزدوری ملے گی؟ انھوں نے مزدوری بتائی، فرمایا اگر اتنی مزدوری یہیں مل جائے تو پھر جانے کی کیا ضرورت! انھوں نے منظور کر لیا، آپ ان کو مسجد میں لے آئے، اور نماز سکھانے اور قرآن پڑھانے لگے، یومیہ مزدوری ان کو دے دیتے، اور ان کو پڑھنے اور سیکھنے میں مشغول رکھتے، کچھ دنوں کے بعد نماز کی عادت پڑ گئی، اور مزدوری چھوٹ گئی، یہ بنگلہ والی مسجد کے مدرسہ کی بنیاد تھی، اور یہ پہلے طالب علم تھے، اس کے بعد ۱۰-۱۲ میواتی طالب علم برابر مدرسہ میں رہتے، اور ان کا کھانا مرزا الٰہی بخش مرحوم کے یہاں سے آتا۔[2]

۴ر شوال ۱۳۱۵ھ (۲۶ فروری ۱۸۹۸ء) مولانا محمد اسماعیل صاحب نے انتقال فرمایا "غُفِرلہٗ" تاریخ وفات ہے آپ نے دہلی شہر میں بہرام کے تراہے کی کھجور والی مسجد میں وفات پائی، مقبولیت عامہ کا اندازہ اس سے ہو گا کہ جنازہ کے ساتھ چلنے والوں کا اتنا ہجوم تھا کہ اگرچہ جنازہ میں دونوں طرف بلّیاں بندھی ہوئی تھیں، تاکہ لوگوں کو کاندھا دینے میں سہولت ہو،

---

[1] روایت مولانا محمد الیاس صاحبؒ [2] روایت مولانا احتشام الحسن صاحب کاندھلوی۔

مگر اس کے باوجود بہت سے لوگوں کو دہلی سے نظام الدین تک (جو تقریباً ساڑھے تین میل ہے) کاندھا دینے کا موقعہ نہیں ملا۔[1]

جنازہ میں مختلف جماعتوں کے لوگ بکثرت شریک تھے، اور مختلف العقیدہ اور مختلف الخیال مسلمان جو کم ایک جگہ جمع ہو سکتے تھے اس موقعہ پر مجتمع تھے، مولانا کے منجھلے صاحبزادہ مولانا محمد یحییٰ صاحب فرماتے تھے کہ میرے بڑے بھائی مولانا محمد صاحب بڑے نرم مزاج اور متواضع بزرگ تھے، مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ کسی بزرگ کی تواضع فرمائیں، اور نماز پڑھانے کے لئے اس کو اشارہ کردیں، اور دوسری جماعت کے لوگ اور ان کے پیشوا ان کے پیچھے نماز نہ پڑھیں، اس طرح اس موقعہ پر ایک نامناسب صورت پیش آئے، اس لئے میں خود آگے بڑھ گیا، اور میں نے کہا کہ میں خود نماز پڑھاؤں گا، سب نے اطمینان کے ساتھ میرے پیچھے نماز پڑھی اور کوئی اختلاف و انتشار نہیں پیدا ہوا۔[2]

جنازہ میں اتنا ہجوم اور ایسی کثرت تھی کہ لوگوں نے بار بار نماز پڑھی جس کی وجہ سے دفن میں کچھ تاخیر ہوئی، اس عرصہ میں ایک صاحبِ ادراک بزرگ نے یہ دیکھا کہ مولانا محمد اسماعیل صاحبؒ فرماتے ہیں کہ "مجھے جلدی رخصت کردو، میں بہت شرمندہ ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہؓ کے ساتھ میرے انتظار میں ہیں۔"[3]

مولاناؒ کے صاحبزادے

مولانا محمد اسماعیل صاحبؒ کے تین صاحبزادے تھے، پہلی بیوی سے مولانا محمد صاحب

---

[1] از حضرات نظام الدین۔ [2] از شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔

[3] روایت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ (منقول از "مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت" از مصنف ص ۳۳-۳۹)

جو سب سے بڑے بھائی تھے اور اپنے والد کے جانشین ہوئے، دوسری بیوی سے (جو مولانا
مظفر حسین صاحب کی نواسی تھیں اور جن سے پہلی بیوی کے انتقال کے بعد نکاح کیا تھا)
دو صاحبزادے مولانا محمد یحییٰ صاحب اور مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہم تھے۔

مولانا محمد صاحبؒ

مولانا محمد صاحب ایک فرشتہ سیرت انسان تھے، حلم و تواضع، رحمت و شفقت،
اور خشیت و انابت کی مجسم تصویر اور "عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا"
(الآیات) کا ایک نمونہ، کم گو، بے آزار، عزلت پسند، اور اپنے کام سے کام رکھنے والے
بزرگ تھے، متوکلانہ و زاہدانہ زندگی بسر کرتے تھے، نظام الدین کی بنگلہ والی مسجد میں اپنے
والد ماجد کی جگہ قیام تھا، ایک مدرسہ تھا، جو ان کے والد مرحوم کا جاری کیا ہوا تھا، جس میں
ابتدائی تعلیم ہوتی تھی، اور زیادہ تر میوات کے بچے پڑھتے تھے، توکل و قناعت پر مدرسہ کا کام
چلتا تھا، دہلی اور میوات میں آپ سے بہت لوگ ارادت و عقیدت رکھتے تھے، اور دونوں
جگہ آپ سے فیض تھا[1]، مولانا محمد صاحب کی صورت سے تقوے کا سبق ملتا تھا، انوار کی
چہرہ پر نہایت کثرت تھی، اکثر وعظ بھی فرماتے تھے، مگر بیٹھ کر جیسے کہ کوئی باتیں کرتا ہو،
مسلسل تقریر کی صورت نہیں ہوتی تھی، بلکہ اخلاق و زہد کی احادیث سناتے اور ان کا
سادہ ترجمہ اور مطلب بیان فرما دیتے۔

کسی زمانہ میں آنکھ کے قریب کوئی پھنسی نکلی تھی، جس پر کچھ بعد دیگرے سات
شگاف آئے، ڈاکٹروں نے کلورا فارم ضروری بتایا، مگر انھوں نے شدت سے انکار کیا،

---

[1] از حاجی عبدالرحمٰن صاحب (شاگرد مولانا محمد صاحب) وغیرہ۔

اور یونہی بے حس و حرکت لیٹے رہے، ڈاکٹر متحیر تھے کہ ہم نے عمر بھر اس کی نظیر نہیں دیکھی۔

مولانا محمد صاحب نہایت ذاکر شاغل اور خوش اوقات بزرگ تھے، حدیث مولانا گنگوہی سے پڑھی تھی، انتقال سے پہلے ۱۶ سال تک ان کی تہجد فوت نہیں ہوئی، آخر وقت تک نماز جماعت سے پڑھی، عشاء کی نماز کے بعد وتر کے سجدہ میں انتقال ہوا۔[1]

مولانا محمد الیاس صاحبؒ

مولانا محمد اسماعیل صاحبؒ کے چھوٹے صاحبزادہ مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے حالات و کمالات، اور ان کی دعوت، اور اس کے اثرات و فتوحات کے تذکرے کی یہ کتاب متحمل نہیں کہ۔ ع

سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے

اس موضوع پر ناچیز مصنف کی مستقل کتاب "حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت" کا مطالعہ مفید ہوگا۔[2]

حضرت شیخ کے والد ماجد مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ

آپ مولانا محمد اسماعیل صاحب کاندھلوی کے منجھلے صاحبزادہ تھے، آپ کی

---

[1] تحریر مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی، (مولانا محمد الیاس صاحبؒ اور ان کی دینی دعوت" ص۵۵-۵۶) [2] اس کتاب کے کئی ایڈیشن ہندوستان، پاکستان میں نکل چکے ہیں، انگریزی و عربی میں ترجمہ ہو چکا ہے، انگریزی ترجمہ "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ" سے شائع ہوا ہے۔

والدہ صاحبہ بی بی صفیہ[1] مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی کی نواسی اور بی امۃ الرحمٰن کی صاحبزادی تھیں[2]، بڑی پاکیزہ صفت، عابدہ اور زاہدہ، اور ذکر و شغل کرنے والی خاتون تھیں، مولانا محمد یحییٰ صاحب بروز پنجشنبہ غرۂ محرم ۱۲۸۸ھ مطابق ۲۳ مارچ ۱۸۷۱ء کو پیدا ہوئے تاریخی نام بلند اختر تھا[3]، آپ فطرتاً ذہین و ذکی اور طبعاً لطیف المزاج پیدا ہوئے تھے، سات برس کی عمر میں قرآن شریف حفظ کر لیا، اور اس کے بعد والد صاحب کا ارشاد تھا کہ ایک قرآن روز پڑھ لیا کرو، باقی سارے دن چھٹی، مولانا محمد یحییٰ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ میں صبح کی نماز پڑھ کے انّی بی[4] کے مکان کی چھت پر قرآن شریف کی تلاوت کرتا، اور جب تک ختم نہ کر لیتا روٹی نہ کھاتا، پھر ایسا نہ ہوتا کہ قرآن شریف کے ختم پر وہ آرام کرتے ہوں، بلکہ علم کا ذوق ان کو مزید کتابوں کے مطالعہ پر آمادہ کرتا، اور اسی تازگی اور نشاط سے کتابوں کا مطالعہ کرتے، وہ خود فرماتے تھے:۔

> "میں عموماً ظہر سے قبل پورا قرآن مجید ختم کر لیا کرتا، اور پھر کھانا کھا کر چھٹی کے وقت میں اپنے شوق سے فارسی پڑھا کرتا تھا"[5]

---

[1] مولانا محمد یحییٰ صاحب کی والدہ صاحبہ کے رفیع حالات، اوراد و اشغال، اور حفظ و تلاوت قرآن کے غیر معمولی خصوصیات کے لئے ملاحظہ ہو "مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت" ص۴۱-۴۲

[2] بی امۃ الرحمٰن صاحبہ ایک رابعہ سیرت بی بی تھیں، حالات کے لئے ملاحظہ ہو "مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت" ص۴۰-۴۱ [3] بلند اختر سے ۱۲۸۷ھ نکلتا ہے، شاید اختلاف رویت اس کا سبب ہو، ولادت اخیر ذی الحجہ میں ہوئی ہو، اس بناء پر یہ تاریخ نکالی گئی، اور دوسری جگہ محرم کی رویت ثابت ہو گئی ہو، اس لئے تاریخ ولادت ۱۲۸۸ھ درج کی گئی ہے۔ [4] یعنی بی امۃ الرحمٰن صاحبہ۔

[5] "حالات مشائخ کاندھلہ" ص۲۲۱

آپ کے والد مولانا محمد اسماعیل صاحب چونکہ بڑے شب زندہ دار بزرگ تھے، اور نماز تہجد کا بڑا اہتمام فرماتے تھے، اس لئے آپ کو اور آپ کے بڑے بھائی مولانا محمد صاحب کو اخیر شب میں سویرے ہی سے اٹھا دیا کرتے تھے کہ شروع ہی سے اس کی عادت پڑے، مولانا محمد صاحب تو اٹھ کر طویل نفلیں پڑھا کرتے تھے، مگر مولانا محمد یحییٰ صاحب مختصر نوافل پڑھ کر کتاب دیکھنے میں لگ جاتے کہ طبیعت اس پر مجبول تھی۔

مولانا محمد یحییٰ صاحب خود فرماتے تھے کہ والد صاحب کو وضو کے اوراد کا خاص اہتمام تھا، اور ہم پر بھی اصرار تھا کہ پابندی کریں، مگر مجھے علم کی دھن تھی، اس لئے میں وضو کرتا ہوا بھی فارسی اور عربی کے لغات یاد کیا کرتا، والد صاحب میری رٹائی کو سنتے تو ملامت کے طور پر فرمایا کرتے "خوب وضو کی دعائیں پڑھی جا رہی ہیں شرم کی بات ہے"۔[1]

ادب کے متعلق مولانا خود فرماتے تھے:۔

"تمام ادب میں استاد سے میں نے صرف "مقامات حریری" کے نو مقامے پڑھے ہیں، اور وہ بھی اس طرح کہ استاد نے کہلایا تھا کہ میرے مکان کو آتے جاتے راستہ میں پڑھ لیا کرو، اس لئے میں ساتھ جاتا اور راستہ میں پڑھا کرتا۔ اور اکثر جگہ استاد فرما دیا کرتے کہ اس لفظ کے معنی مجھ کو معلوم نہیں خود دیکھ لینا"۔[2]

آپ کی علمی استعداد اور علوم نقلیہ کے ساتھ فنون عقلیہ کی مہارت تامہ اس نوعمری ہی میں مسلّم اور مشہور ہونے کے ساتھ علمائے عصر میں حیرت کی نظروں سے دیکھی گئی کہ بڑوں بڑوں کو مولانا سے علمی مکالمہ میں فخر تھا،[3] عربی ادب میں آپ کو اتنی مہارت تھی کہ نظم و نثر دونوں بے تکلف لکھ لیتے تھے۔

---

[1] تذکرۃ الخلیل ص۲۰۰ (طبع ۱۹۷۵ء) [2] ایضاً ص۲۰۱ [3] ایضاً ص۲۰۰-۲۰۱

شوال ۱۳۱۱ھ میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کی خدمت میں حدیث پڑھنے تشریف لے گئے، چونکہ بڑے بھائی مولانا محمد صاحب نے حدیث شریف حضرت گنگوہی سے پڑھی تھی، اور مولانا محمد یحییٰ صاحب کو حضرت گنگوہی سے بڑی عقیدت تھی اس لئے انھیں کی خدمت میں حدیث شریف پڑھنے گئے، لیکن اس زمانہ میں حضرت گنگوہی کو نزول ماء کی شکایت ہو چلی تھی، اس لئے حدیث کا درس بند ہو چکا تھا لیکن مولانا محمد یحییٰ صاحب نے وہیں کا قیام اختیار کر لیا، اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری کی درخواست پر دورۂ حدیث پھر شروع ہو گیا، یہ حضرت کا آخری درس تھا جس کی رونق اور روح رواں مولوی یحییٰ صاحب ہی تھے، جب تک باہر رہتے درس رُکا رہتا، مولانا کا ایسا اعتماد اور دل میں جگہ حاصل تھی کہ بیش کار ہو گئے، تھوڑی دیر کے لئے کہیں جاتے تو مولانا بے چین ہو کر فرماتے، مولوی یحییٰ نابینا کی لاٹھی ہیں[۱]۔

مولانا محمد یحییٰ صاحب نے اثنائے درس میں اس کا بھی اہتمام کیا تھا کہ حضرت مولانا گنگوہی کی تقریروں کو جو سبق میں سنتے خارج وقت میں ضبط کر کے نقل فرما لیتے، اور لکھ لیا کرتے جو ہر کتاب حدیث کی ایک مستقل تعلیق اور نادر الوجود شرح بن گئی تھی[۲]، پورے بارہ[۱۲] سال حضرت گنگوہی کی خدمت میں گزارے اور اس پوری مدت میں حضرت گنگوہی کی محبت و شفقت کی آغوش میں پلے، اور اس وقت گنگوہ سے رخصت ہوئے، جبکہ حضرت گنگوہی وصال فرما گئے، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری چونکہ آپ کی ذکاوت اور ذہانت اس وقت جانچ چکے تھے، جبکہ آپ دہلی میں طالب علم تھے، اس لئے آپ مدت سے متمنی تھے کہ کسی طرح مولانا محمد یحییٰ صاحب مدرسہ مظاہر العلوم میں درس حدیث

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تذکرۃ الخلیل ص ۲۰۳-۲۰۴" [۲] ایضاً ص ۲۰۶

کے لئے آجائیں، مولانا کو چند روز کے لئے بلایا، اور تیسرے سال مستقل قیام پر زور دیا، چنانچہ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۶ھ میں مولانا مدرسہ مظاہر العلوم میں درس حدیث کے لئے مستقل تشریف لائے، اور اس وقت سے لے کر ساڑھے پانچ سال کامل مدرسہ میں برابر درس حدیث دیتے رہے، اور کبھی کوئی معاوضہ نہیں لیا[1]۔

معاش کے لئے ایک تجارتی کتب خانہ قائم کر رکھا تھا، جس کا کام اپنے ہاتھ سے کرتے، عجیب باغ و بہار طبیعت لے کر آئے تھے "بکّاء باللیل، بسّام بالنہار" (رات کو بہت رونے والے، دن کو بہت مسکرانے والے) آپ کی صفت تھی، اِدھر گریہ طاری ہے، اُدھر دوستوں کو اپنے نکتوں اور بذلہ سنجیوں سے ہنسا رہے ہیں، دیدۂ گریاں، روئے خنداں، اور زبان گل افشاں کا پورا مجموعہ تھے، دل کے سوز و گداز، اور راتوں کے راز و نیاز کی خبر بہت کم لوگوں کو تھی، معمولی آدمیوں کی طرح رہتے۔

قرآن شریف سے بڑا شغف تھا، مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھیؒ "تذکرۃ الخلیل" میں لکھتے ہیں:-

"ایک مرتبہ میری درخواست پر آپ رمضان میں قرآن شریف سنانے کے لئے میرٹھ تشریف لائے تو دیکھا دن بھر میں چلتے پھرتے پورا قرآن مجید ختم فرما لیتے تھے، اور افطار کا وقت ہوتا تو ان کی زبان پر "قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ" ہوتی تھی، ریل سے اترے تو عشا کا وقت ہو چکا تھا، ہمیشہ باوضو رہنے کی عادت تھی، اس لئے مسجد میں قدم رکھتے ہی مصلے پر آ گئے، اور تین گھنٹے میں دس پارے ایسے صاف اور رواں پڑھے کہ نہ کہیں لکنت تھی، نہ تشابہ، گویا قرآن شریف سامنے کھلا رکھا ہے، اور

---

[1] تذکرۃ الخلیل ص ۲۰۷

باطمینان پڑھ رہے ہیں، تیسرے دن ختم فرماکر روانہ ہوگئے کہ دور کی ضرورت تھی نہ سامع کی حاجت[۱]۔"

مولانا احتشام الحسن صاحب کاندھلوی "حالات مشائخ کاندھلہ" میں لکھتے ہیں:۔

"حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب کا معمول تھا کہ ہر رمضان المبارک میں اپنی والدہ صاحبہ اور نانی صاحبہ کو قرآن شریف سنانے کے لئے کاندھلہ تشریف لے آتے، اور ہمیشہ تین شب میں پورا قرآن شریف سناکر واپس تشریف لے جاتے جس سال ذی قعدہ میں آپ کا وصال ہوا اس رمضان میں ایک ہی شب میں پورا قرآن مجید سنایا، اور اگلے ہی دن واپس تشریف لے گئے[۲]۔"

قرآن کریم کے شغف اور درس حدیث کے علاوہ خدمتِ خلق، حسنِ سلوک وظیفۂ زندگی تھا بیواؤں اور یتیموں نادار طلبہ کے ساتھ عمر بھر حسن سلوک فرماتے رہے اور اتنے پوشیدہ طریقہ سے یہ کام کرتے کہ کسی دوسرے کو کانوں کان خبر نہ ہوتی، سادگی اور اپنے نفس کی طرف سے استغناء کا یہ عالم تھا کہ گھر میں شاید پانچ روپے کا غلہ بھی ایک دفعہ نہیں ڈلوایا، مگر مصارفِ خیر پر خرچ کا یہ عالم تھا، کہ جس وقت انتقال ہوا تو آٹھ ہزار روپے کے مقروض تھے، اور کسی کو خبر بھی نہ تھی کہ کس مد میں خرچ ہوا[۳]۔

۱۰ ذی قعدہ ۱۳۳۴ھ کو انتقال فرمایا، انتقال کے وقت چھیالیس[۴۶] سال کی عمر تھی، (جو گویا جوانی ہی کا زمانہ ہے) سہارنپور کے مشہور قبرستان حاجی شاہ میں جہاں مولانا محمد مظہر صاحب بانی مدرسہ مظاہر العلوم اور مدرسہ مظاہر العلوم کے اور دوسرے اکابر بھی آرام فرما ہیں، مدفون ہوئے۔

---

۱ تذکرۃ الخلیل ص ۲۰۴ ۲ حالات مشائخ کاندھلہ ۳ تذکرۃ الخلیل ص ۲۰۵

مولانا محمد الیاس صاحب کا معمول تھا کہ جب مرحوم بھائی کا ذکر کرتے تو ایک محویت سی طاری ہو جاتی اور سب کچھ بھول جاتے، ان کے اوصاف، کمالات اور ان کے واقعات کا مزا لے کر ذکر کرتے اور فرماتے حضرت میرے بھائی ایسے تھے! خصوصیت کے ساتھ ان کی جامعیت، مصالحانہ روش، اعتدال طبیعت، مختلف عناصر اور بظاہر اضداد کو جمع کرنے اور جمع رکھنے کی خداداد قابلیت، غیر معمولی ذکاوت، اور سلامت فہم کے واقعات بڑی تفصیل اور دلچسپی سے سناتے تھے، علوم میں آپ کے بعض تحقیقی کلمات اور کلیات کا حوالہ دیتے۔[1]

مولانا محمد یحییٰ صاحب کے کچھ حالات اور خصوصیات حضرت شیخ الحدیث کی زبان سے

مرزا ثریا جاہ مرحوم (فرزند مرزا الٰہی بخش) کو مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سے بڑی عقیدت اور محبت تھی، اور انھوں نے مولانا سے باصرار اور بہ تکرار اپنی اس خواہش کا ذکر کیا کہ میں اپنی لڑکی قیصر جہاں بیگم کا نکاح عزیز مولوی محمد یحییٰ سلمہ سے کرنا چاہتا ہوں، مولانا محمد اسماعیل صاحب فقیر منش بزرگ تھے وہ اس شاہی خاندان سے رشتہ کیا پسند کرتے؟ ان کے شدید اصرار پر انھوں نے نوعمر صاحبزادہ سے استمزاج کیا، انھوں نے معذرت کر دی اور جواب دیا کہ "شہزادی سے نکاح کرنے کے بعد بوریئے پر لیٹنا تو کبھی نصیب نہ ہوگا"[2] جس کا صاحبزادی موصوفہ کو بہت قلق تھا۔

تعلیم اور تربیت کے سلسلہ میں مولانا محمد یحییٰ صاحب کے یہاں سب سے زیادہ زور ترکِ تعلقات پر تھا، ان کا مقولہ تھا کہ "آدمی چاہے کتنا ہی غبی اور کند ذہن ہو اگر اس میں تعلقات کا

---

[1] "حضرت مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت" ص ۶۲ [2] "آپ بیتی" حصہ اول ص ۱۱-۱۲

مرض نہیں تو وہ کسی وقت ذی استعداد بن کر رہتا ہے، اس کے برخلاف وہ جتنا بھی ذی استعداد، ذہین، اور علم کا شوقین ہو، اگر اس کو تعلقات کا چسکہ ہے تو وہ اپنے جوہر وں کو کھو کر رہے گا۔[1] یہ بھی اکثر فرمایا کرتے تھے کہ صاحبزادگی کا زعم بہت دیر میں نکلتا ہے، حضرت شیخ بیان کرتے ہیں کہ گنگوہ کے قیام اور اپنے بچپن میں مجھے اپنے چچا جان مولانا محمد الیاس صاحب کو دیکھ کر طویل نوافل کا شوق ہوا، میں نے مغرب کے بعد حضرت گنگوہی قدس سرہ کے حجرہ کے سامنے لمبی نفلوں کی نیت باندھ لی، ابا جان نے آکر زور سے تھپڑ مارا اور فرمایا کہ سبق یاد نہیں کیا جاتا؟[2]

مولانا محمد یحییٰ صاحب کے یہاں تعلیم میں جدت تھی، ان کے یہاں درس نظامی کی پابندی نہیں تھی، ہر شخص کی حیثیت کے مطابق کتاب تجویز ہوتی تھی، الفیہ ابن مالک کا سبق روزانہ حفظ سنا کرتے تھے،[3] ان کے یہاں پہلے قواعد زبانی یاد کرائے جاتے تھے، اس کے بعد ان قواعد کا اجرا تختی یا ردی کاغذوں پر کرایا جاتا تھا، رمضان میں تعطیل نہیں ہوتی تھی، البتہ رمضان کی کتابیں علیحدہ ہو جایا کرتی تھیں، ادب پر بہت زور تھا، نحو میر کے ساتھ ہی عربی سے اردو، اردو سے عربی بولنے کا اہتمام تھا، ادب میں چہل حدیثوں کا بہت دستور تھا، ادب کی کتابوں میں وہ محشی کتابوں کے پڑھانے کے مخالف تھے۔[4]

مولانا محمد یحییٰ صاحب مدارس کے موجودہ طرز تعلیم کے بہت خلاف تھے، فرمایا کرتے تھے اس سے استعداد پیدا نہیں ہو سکتی، مدرس تو رات بھر مطالعہ دیکھے اور سبق میں ساری تقریر یہ کرے، طلبائے عظام کا احسان ہے کہ وہ سنیں یا نہ سنیں، ادھر ادھر مشغول رہیں، ان کے یہاں سارا بار طالب علم کے اوپر رہتا تھا، وہ مطالعہ دیکھے، سبق پر تقریر کرے، فرماتے تھے کہ استاد کا کام

---

[1] آپ بیتی حصہ اول ص ۱۳ [2] ایضاً ص ۱۷ [3] ایضاً ص ۱۹-۲۰ [4] ایضاً ۲ ص ۴۳-۴۴

صرف یہ ہے کہ وہ ہوں کرے یا او ہوں[1]۔

مولانا یحییٰ صاحب کی علالت ایک دن سے بھی کم رہی ۹ ذی قعدہ جمعہ کی صبح سے طبیعت میں اضمحلال اور افسردگی تھی، جمعہ کی نماز دار الطلبہ میں اطمینان سے پڑھائی، جمعہ کے بعد حسب معمول کھانا کھا کر لیٹ گئے، تو کچھ معمولی اسہال کا سلسلہ شروع ہوا، جو عشاء تک بڑھتا رہا، عشاء کے بعد مولوی عبد اللہ جان صاحب وکیل کی کوٹھی پر ایک سفارش کے لئے جانے کا ارادہ کیا، لیکن لوگوں نے روک دیا، اسہال بند ہو گئے، اور احتباس ہو گیا، اگلے دن صبح کو (۱۰ ذی قعدہ ۱۳۳۴ھ) جان جان آفریں کے سپرد کر دی، اخیر وقت میں زبان پر ضرب کے ساتھ بغیر جہر اسم ذات کا ذکر شدت سے جاری تھا، چند منٹ کے بعد وصال ہو گیا، قبرستان حاجی شاہ میں تدفین ہوئی، انتقال ۸ بجے ہوا، اور دس بجے تدفین سے فراغت ہو گئی، شنبہ کی صبح کو مولانا یحییٰ صاحب کا انتقال ہوا، اور دوپہر کو حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کا جہاز بمبئی پہونچا[2]۔

مولانا کی زندگی بڑی سادہ تھی، ان کے لباس یا طرز معاشرت سے کوئی ان کو مولوی بھی نہیں سمجھتا تھا، کپڑے زیادہ تر ململ خورہ پہنتے تھے[3]۔

شیخ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے اکابر میں بہت بے تابی سے رونے والا حضرت مدنی قدس سرہٗ اور اپنے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کو دیکھا، قرآن شریف پڑھنے کا بہت ہی کثرت سے معمول تھا، خالی اوقات میں حفظ قرآن شریف پڑھتے رہتے تھے، اور آخر شب میں جہر و بکاء کے ساتھ[4]۔

مولانا محمد یحییٰ صاحب فرماتے تھے، کہ میرے بھائی مولوی محمد صاحب نے چونکہ حدیث پاک گنگوہ میں پڑھی تھی، اس لئے میں حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کا بہت معتقد ہو گیا تھا، اور طے کر لیا تھا کہ

---

[1] آپ بیتی حصہ دوم ص ۵۷ [2] ایضاً ۵ ص ۱۰۶-۱۱۲ [3] ایضاً ۶ ص ۳۰ [4] ایضاً ۴ ص ۱۳۶

اگر حدیث پڑھوں گا تو حضرت سے ورنہ نہیں، اور اعلیٰ حضرت گنگوہی امراض کی کثرت اور بہت سے عوارض کی وجہ سے کئی سال پہلے سے حدیث کے اسباق بند فرما چکے تھے، مولانا خلیل احمد صاحب نے حدیث کے امتحان میں جو مدرسہ حسین بخش میں ہوا تھا، اور مولانا نے مطالعہ اور محنت سے اس کی تیاری کی تھی[۵۱] کے جوابات دیکھ کر حضرت گنگوہی سے سفارش فرمائی کہ حضرت نے اعذار کی وجہ سے سبق بند کر دیئے، مگر ایک سال دورہ میری درخواست پر اور پڑھا دیں کہ مولانا اسماعیل صاحب کاندھلوی ثم دہلوی کے لڑکے مولوی یحییٰ کا میں نے امتحان لیا ہے، ایسا ذہین طالب علم بڑی مشکل سے ملتا ہے، حضرت نے یکم ذی قعدہ ۱۱ھ سے ترمذی شروع فرما دی، اس کے بعد بخاری شریف شروع ہوئی۔[۵۲]

حضرت سہارنپوری جس دن بمبئی پہونچے اسی دن مولانا یحییٰ صاحب کا انتقال ہوا، مولانا کے انتقال کا تار حضرت کو بمبئی میں ملا، حضرت سن کر سکتے میں رہ گئے، تین چار دن پہلے حضرت کا عدن سے تار آیا تھا کہ فلاں جہاز سے تشریف لا رہے ہیں، اس پر مولانا نے رائے پور اطلاع کا جو خط لکھا تھا، اس کی ابتدا اس شعر سے کی تھی ؎

مژدہ اے دل کہ دگر باد صبا باز آمد
ہدہد خوش خبر از شہر سبا باز آمد[۵۳]

---

[۵۱] تفصیل ملاحظہ ہو "آپ بیتی" نمبر ۶ ص ۱۴۵-۱۴۶ [۵۲] ایضاً ص ۱۴۶ [۵۳] ایضاً ص ۱۵۱
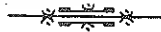
باب دوم

پیدائش سے فراغت علمی تک[1]

ولادت وطفولیت

جیساکہ اوپر گزر چکا ہے، مولانا محمد یحییٰ صاحب کی شادی حافظ یوسف صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی تھی، حضرت شیخ الحدیث ۱۳۱۵ھ میں رمضان کی گیارہویں شب میں گیارہ بجے رات کو ———— کاندھلہ میں پیدا ہوئے، ولادت کی نوید ملی تو خاندانی مسجد میں خاندان کے شرفاء و بزرگ اور اہل محلہ تراویح سے فارغ ہو رہے تھے اس لئے بجائے اپنے اپنے گھر جانے کے پہلے اس مکان پر آئے جہاں اس مبارک بچہ کی ولادت ہوئی تھی، بچہ کی ولادت پر مبارک بادپیش کی، پھر اپنے اپنے گھر واپس گئے۔

بچہ کے دادا حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب نظام الدین دہلی میں تھے، پوتے کی پیدائش کی خبر سنی تو برجستہ زبان سے نکلا کہ "ہمارا بدل آگیا" اور اسی سال شوال میں دنیا سے رحلت فرمائی۔

ساتویں روز آپ کے والد مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلہ تشریف لائے گھر پہونچ کر

---

[1] اس باب کا مواد و معلومات تمام تر مصنف کے استفسارات کے جواب میں شیخ کے مکاتیب اور آپ بیتی سے ماخوذ ہیں، جن سے زیادہ مستند ذریعہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

بچہ کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی، اس زمانہ میں قدیم خاندانوں میں بڑی حیا اور حجاب تھا، باپ بزرگوں کے سامنے بچوں کو لینے اور ان سے اظہار تعلق کرنے میں بڑا حجاب محسوس کرتے تھے، اور اس کا دستور نہیں تھا کہ اس طرح بچہ کو دیکھنے کے لئے لایا جائے، وہاں گھر میں عقیقہ کے لئے کچھ نہ کچھ اہتمام ہونا ضروری تھا، خاص طور پر رشتہ کی ایک انّی نے جن کا نام بی بی مریم تھا، بچہ کے عقیقہ کے لئے بڑا منصوبہ بنا رکھا تھا، اور ان کو اپنے دل کے ارمان نکالنے کی بڑی خوشی تھی، مولانا یحییٰ صاحب کے اچانک پہونچنے اور بچہ کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کرنے سے بیبیوں کو یک گونہ حیرت اور یک گونہ مسرت ہوئی، اور بعض نے یہ کہہ کر اپنی حیرت دور کی کہ آخر باپ ہیں، اگر دیکھنے کو جی چاہا تو کیا بے جا ہے؟ مولانا حجّام اپنے ساتھ لائے تھے، بچہ آیا تو حجام کو اشارہ کیا، اس نے بال تراش لئے، مولانا نے بال والدہ کے پاس بھجوا دیئے، اور فرمایا کہ بال میں نے بنوا دیئے، بکرے آپ ذبح کروا دیجئے، اور بال کے وزن بھر چاندی صدقہ کر دیجئے۔

بچہ کے دو نام رکھے گئے محمد موسیٰ، محمد زکریا، اسی دوسرے نام نے شہرت عام پائی، آپ اسی سے مشہور و مقبول عوام و خواص ہوئے۔

اس وقت مولانا محمد یحییٰ صاحب کا قیام حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کی خدمت میں مستقل طور پر گنگوہ رہا کرتا تھا، ضرورتاً کاندھلہ اور دہلی آتے جاتے، شیخ الحدیث کی عمر ڈھائی سال کی تھی کہ وہ بھی اپنی والدہ صاحبہ کے ساتھ گنگوہ چلے گئے، مولانا محمد یحییٰ صاحب کے ساتھ حضرت کا جو سرپرستانہ، مربیانہ بلکہ پدرانہ تعلق تھا[1]، اس کی بنا پر اس خوش نصیب اور اقبال مند بچہ کو (جس کے لئے مستقبل میں حضرت کے کمالات باطنی کا حامل و امین اور آپ کے علوم ظاہری کا ناشر اور شارح بننا مقدر تھا) آپ کی خصوصی شفقتوں، محبت کی

---

[1] اس کی تفصیل مولانا محمد یحییٰ صاحب کے حالات میں گزر چکی ہے۔

نگاہوں، اور مقبول دعاؤں کا جو حصہ ملا ہو، وہ ہر طرح قرین قیاس ہے، شیخ فرماتے ہیں کہ ابھی میں ڈھائی سال ہی کا تھا، حضرت گولر کے درخت کے نیچے چار زانو بیٹھے ہوتے تھے، میں حضرت کے پیروں پر کھڑا ہو کر حضرت سے خوب لپٹتا، فرماتے تھے کہ جب میں کچھ اور بڑا ہو گیا، راستہ میں کھڑا ہو جاتا، جب حضرت سامنے سے گزرتے تو میں بڑی قراءت سے اور بلند آواز کے ساتھ کہتا، السلام علیکم، حضرت بھی ازراہ محبت و شفقت اسی لہجہ اور آواز میں جواب مرحمت فرماتے، شیخ فرماتے ہیں کہ حضرت گنگوہی کی گود میں کھیلنا حضرت کے گھٹنوں پر پاؤں رکھنا اور گردن میں ہاتھ ڈال کر کھڑا ہونا حضرت کے ساتھ عیدین کے موقع پر پالکی میں بیٹھ کر عیدگاہ آنا جانا جس کے اٹھانے والے بڑے بڑے علماء اور مشائخ ہوتے تھے، اور بسا اوقات حضرت کے ساتھ کھانا کھانا اور حضرت کے پس خوردہ کا تن تنہا وارث بننا، اب بھی آنکھوں کے سامنے ہے[1]۔

اس وقت گنگوہ صلحاء و علماء کا مرکز بنا ہوا تھا، حضرت کی تربیت باطنی اور شہرۂ آفاق درسِ حدیث نے طالبین صادقین اور علمائے کاملین کو دور دور سے کھینچ کر اس قصبہ میں جمع کر رکھا تھا، اور وہاں ایک ایسی روحانی و علمی فضا در و دیوار پر چھائی ہوئی تھی، جس کی نظیر اس مبارک عصر میں بھی دور دور ملنی مشکل تھی[2]، شیخ کے بالکل بچپن کا وہ زمانہ جو غیر شعوری طریقہ پر اچھے برے اثرات کے جذب کرنے اور ابتدائی نقوش کے مرتسم ہونے کا زمانہ ہے، اسی مبارک ماحول میں گزرا، وہ بارہ ۱۲ سال کی عمر تک گنگوہ رہے، اس عمر تک ان کا زیادہ تر وقت گنگوہ ہی میں گزرا، جب کبھی کسی تقریب میں شرکت کی غرض سے

---

[1] فضائل زبان عربی صـ۳-۴ [2] گنگوہ کے اس دور کا کسی قدر تفصیلی نقشہ "تذکرۃ الرشید" اور "حضرت مولانا محمد الیاس کی سوانح" میں ملاحظہ ہو۔

یا کسی ضرورت کے ماتحت والدہ صاحبہ کا عارضی طور پر کاندھلہ جانا ہوتا تو وہ بھی جاتے پھر گنگوہ واپسی ہو جاتی، خود ان کا وطن کاندھلہ ایک بڑا دینی و علمی مرکز تھا جس میں گھر کے اندر اور باہر عبادت کا ذوق، نوافل و تلاوت کا اہتمام، اہل اللہ اور مردانِ خدا سے وابستگی و شیفتگی، درس و مطالعہ کا انہماک، تہذیب و متانت، اور وضعداری و سنجیدگی، بلند ہمتی و جفاکشی ہوا و فضا میں رچی بسی ہوئی تھی، اور اس سے اس ہونہار بچہ کے حسّاس اور بیدار دل و دماغ کا متاثر ہونا بالکل قدرتی تھا، گنگوہ سے کاندھلہ جاتے ہوئے مختلف قصبات و مقامات سے خاندان کے دیرینہ تعلقات تھے اور مولانا محمد یحییٰ صاحب کے بعض بے تکلف اور مخلص احباب، ہم درس اور ہم عمر موجود تھے، کئی کئی روز قیام رہتا کبھی کبھی بڈولی کے راستہ سے جہاں خاندان کی قرابتیں بھی تھیں اور بعض عزیز قریب اور ہم مذاق لوگ موجود تھے، جانا ہوتا، یہاں بھی کئی کئی دن تک بڑی یادگار صحبتیں رہتیں، یارانِ بزم اور شرکائے محفل سب بڑے مخلص، باوقار، باوضع و باکمال لوگ تھے، جن میں سے ہر ایک اپنے اپنے فن میں کامل تھا، کبھی کبھی ان درمیانی منزلوں میں چار چار پانچ پانچ دن لگ جاتے، شیخ بڑی دلچسپی اور لطف کے ساتھ گنگوہ، کاندھلہ، اور راستہ کے مقامات، اور منزلوں کے واقعات سناتے تھے، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ حافظہ کے ساتھ ان کی قوت مشاہدہ کتنی تیز تھی اور ان مشاہدات اور گزشتہ صحبتوں نے ان کی سیرت اور ذوق کی تشکیل میں کتنا حصہ لیا تھا۔[1]

---

[1] اس زمانہ کے بزرگ بچوں کی اخلاقی تربیت اور ان کے خاص طرح کے ذہنی نشو و نما کے لئے بعض ایسے طریقے اختیار کرتے تھے، جن پر آج کل کے ماہرین نفسیات اور ماہرین تعلیم (جو بچے کی ہر طرح کے خواہشات کی تکمیل اور اس کو مکمل آزادی دینے کی تلقین و تبلیغ کرتے رہتے ہیں) چیں بہ جبیں ہوں گے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا

(باقی ص ۵۳ پر)

شیخ آٹھ سال کے تھے کہ ۲۳ جمادی الاولی ۱۳۲۳ھ کو حضرت گنگوہی نے وفات پائی، اور وہ آفتاب رشد و ارشاد غروب ہوا جس نے گنگوہ کی سرزمین کو مطلع انوار بنادیا تھا، اور جس کے دم سے اس چھوٹے سے قصبہ کو یہ مرکزیت و مقبولیت حاصل تھی، حضرت کی وفات پر علماء و صلحاء جو بڑی تعداد میں جمع تھے، متفرق ہو گئے، لیکن مولانا محمد یحییٰ صاحب جنھوں نے حضرت کو اپنے والدین پر، اور گنگوہ کو اپنے وطن پر ترجیح دی تھی، وہیں پڑے رہنے کا فیصلہ کیا، اور بدستور وہیں مقیم رہے۔

تعلیم کا آغاز

اس زمانہ کے اکثر قدیم گھرانوں اور شرفاء کے خاندانوں میں رواج تھا کہ ۴-۵ سال کی عمر میں بچہ مکتب بٹھادیا جاتا تھا، اور اس کی تسمیہ خوانی ہو جاتی، شیخ کے والد مولانا محمد یحییٰ صاحب کا معاملہ تو اور بھی خصوصی تھا کہ خود شیخ کی روایت کے مطابق جب دودھ چھٹا تو پاؤ پارہ حفظ تھا، اور سات برس کی عمر میں قرآن مجید کا حفظ مکمل ہو چکا تھا، لیکن شیخ کی سات برس کی عمر تک بسم اللہ بھی نہیں ہوئی، بچہ کا نشو و نما اور اٹھان اچھا تھا، اس عمر تک

(باقی ص۵۲ کا) محمد یحییٰ صاحب کو خاص طور پر اس کا اہتمام تھا، شیخ نے سنایا کہ ایک مرتبہ جب میری عمر ۱۳ سال کی تھی والد صاحب نے کاندھلہ بھیجنے کا وعدہ فرمایا، میں خوشی کے مارے پھولے نہیں سماتا تھا، وہاں جانے کے لئے دن گننے لگا، اور عید کے چاند کی طرح اس کا انتظار کرنے لگا، چند دن کے بعد والد صاحب نے یہ ارادہ ملتوی فرمادیا، مجھے اس پر تعجب بھی ہوا، اور ملال بھی، ایک روز فرمایا کہ تجھے کاندھلہ جانے کی بے حد خوشی تھی، اور تجھ پر اس کا شوق اتنا غالب آگیا کہ میں نے اسی وجہ سے اس کو ملتوی کر دیا کہ اس پر اتنا خوش ہونا، اور اس کا اتنا شوق و ارمان ٹھیک نہیں۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "آپ بیتی ۱" ص۲)

تعلیم شروع نہ ہونے پر خاندان کے بزرگوں کو تعجب تھا، دادی صاحبہ نے (جو خود حافظ قرآن تھیں) ایک مرتبہ اپنے لائق فرزند سے فرمایا کہ "یحییٰ اولاد کی محبت میں اندھے نہیں ہوتے تو نے تو سات سال کی عمر میں حفظ کر لیا تھا، یہ اتنا بڑا ایل پھر رہا ہے آخر اس کو تم گھونٹ کر کیا کروگے؟" مولانا نے اس کے جواب میں فرمایا کہ "جب تک کھیلے اس کو کھیل لینے دیجئے، جس دن یہ کولھو میں سر دے گا قبر ہی میں دم لے گا۔"

بالآخر وہ مبارک دن آیا کہ بچہ کی بسم اللہ ہوئی، گنگوہ قیام تھا، اس زمانہ میں مظفر نگر کے ایک نیک صالح بزرگ ڈاکٹر عبدالرحمن صاحب مقیم تھے، جن کے ساتھ مولانا محمد یحییٰ صاحب کی بڑی نشست و برخواست رہتی تھی، ڈاکٹر صاحب کے گنگوہ کے قیام کا ایک ہی مقصد معلوم ہوتا تھا اور وہ حضرت گنگوہی کی خدمت تھی، مولانا محمد یحییٰ صاحب نے بچہ کو انھیں کے یہاں پڑھنے کے لئے بٹھایا، اور شیخ نے قاعدہ بغدادی انھیں سے ختم کیا۔

قرآن مجید کا حفظ اس خاندان کا خصوصی شعار اور تعلیم کا پہلا ضروری مرحلہ تھا، اسی کے مطابق حفظ کا سلسلہ شروع کرایا گیا، مولانا محمد یحییٰ صاحب کا تعلیم و تربیت میں نرالا ہی دستور تھا، وہ ایک صفحہ کا سبق دے دیتے، اور فرماتے کہ اس کو سو مرتبہ پڑھ لو پھر دن بھر چھٹی ہے، فطرتِ انسانی اور تقاضائے عمر سے بڑے سے بڑا ہونہار بچہ (خصوصاً جس میں ذہانت کا جوہر بھی ہو) مستثنیٰ نہیں ہوتا، شیخ فرماتے ہیں کہ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ایک صفحہ سو مرتبہ پڑھنے میں کتنا وقت لگتا ہے، میں بہت جلدی آکر کہہ دیتا کہ سو مرتبہ پڑھ لیا، والد صاحب اس پر کچھ زیادہ جرح قدح نہ فرماتے، اگلے دن کہتا کہ کل تو کچھ یونہی سا پڑھا تھا، آج ٹھیک ٹھیک سو مرتبہ پڑھا ہے، فرماتے کہ آج کے سچ کی حقیقت تو کل معلوم ہوگی، سہارنپور آجانے اور عربی شروع ہو جانے کے بعد بھی یہ حکم تھا کہ ایک پارہ کو اتنی مرتبہ پڑھ لو، مغرب کے بعد

ایک صاحب اس کو سنتے تھے، اس میں خوب غلطیاں نکلتی تھیں، اس پر سہارنپور کے مشہور وکیل مولوی عبداللہ جان صاحب نے جن کو اس خاندان سے بڑا گہرا تعلق تھا، مولانا محمد یحییٰ صاحب سے ایک روز کہا کہ زکریا کو قرآن یاد نہیں، مولانا نے فرمایا کہ بالکل نہیں، انھوں نے کہا کہ کیا بات ہے؟ فرمایا کہ اسے عمر بھر کرنا ہی کیا ہے، قرآن ہی پڑھنا ہے، یاد ہو جائے گا۔

۱۳۲۸ھ تک یعنی ۱۲-۱۳ سال کی عمر تک گنگوہ قیام رہا، اس عرصہ میں اردو کے دینی رسائل بہشتی زیور وغیرہ اور فارسی کی ابتدائی کتابیں گنگوہ میں رہ کر پڑھیں، جو زیادہ تر شفیق اور بزرگ چچا مولانا محمد الیاس صاحب نے پڑھائیں۔

مولانا محمد الیاس صاحب کے یہاں سبق اس طرح ہوتا کہ سبق میں اپنے ہی مطالعہ پر مدار تھا، فاش غلطی پر کتاب بند کر دیتے، فرماتے، زکریا اگر تو چھ ہفتے چپ رہے تو میں تجھے ولی کر دوں، شیخ فرماتے تھے، چھ ہفتے تو درکنار، چھ دن بھی چپ رہنا مصیبت ہے۔

سہارنپور کا قیام اور عربی تعلیم کا آغاز

عربی تعلیم کا باقاعدہ سلسلہ سہارنپور آکر ۱۳۲۸ھ میں شروع ہوا، مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ زندگی کے اکثر شعبوں، بالخصوص تعلیم کے مسئلہ میں مجتہدانہ دماغ رکھتے تھے، وہ مروجہ نصاب اور عام طریقۂ تعلیم اور درسی کتابوں کی متعارف ترتیب کے خلاف تھے، انھوں نے اپنی تجویز اور تجربہ، ذہانت اور خداداد ملکۂ تعلیم کی مدد سے خود ایک نصاب تجویز کر رکھا تھا، مولانا محمد الیاس صاحبؒ کا بھی عمل اسی پر تھا، شیخ کی تعلیم کے سلسلہ میں بھی اسی اجتہاد و انتخاب سے کام لیا گیا، ان کا دستور تھا کہ وہ بغیر کتاب کے زبانی قواعد لکھواتے تھے، اس کے بعد دو چار حرف بتا کر مثال، اجوف، ناقص، مضاعف چاروں قاعدوں پر بہت صیغے بنواتے

اوران کو رٹاتے، شیخ کا بیان ہے کہ "صرف میر" "پنج گنج" دس بارہ دن میں سنا دی تھی "البتہ فصول اکبری" میں بہت وقت لگا تھا، اسی طرح صرف ونحو کی درسی متداول کتابیں خاص طرز اور ترمیم واضافہ کے ساتھ پڑھیں، کافیہ کے ساتھ مجموعۂ اربعین' اور نفحۃ الیمن کی جگہ (جس سے مولانا بہت ناراض تھے[1]) پارۂ عم کا ترجمہ پڑھایا، نفحۃ الیمن کے صرف باب ثالث کے قصائد پڑھے، اس کے بعد قصیدۂ بردہ، بانت سعاد، قصیدۂ ہمزیہ، مقامات سے پہلے پہلے پڑھ لئے۔

حضرت گنگوہی کی وفات کے بعد مولانا محمد یحیٰی صاحب تقریباً ہر سال کتب حدیث کے باقی ماندہ حصے کی تکمیل کرانے کے لئے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کی دعوت پر مظاہر العلوم سہارنپور تشریف لے جایا کرتے تھے، لیکن ۱۳۲۸ھ میں مولانا کے اصرار اور تقاضہ پر گنگوہ کا قیام ترک کر کے سہارنپور کا مستقل قیام اختیار فرمالیا، اور مدرسہ کے اساتذہ اور مدرسین میں شامل ہو گئے، یہ تعلق اعزازی تھا، اس طرح شیخ کی تعلیم کا سلسلہ سہارنپور میں شروع ہو گیا آپ نے بقیہ درسیات کی تکمیل کی، کتب منطق مولانا عبدالوحید صاحب سنبھلی سے (استاد مظاہر العلوم جو معقولات کے جیّد الاستعداد استاد تھے) اور زیادہ تر مولانا عبداللطیف صاحب ناظم مظاہر العلوم سے (جن کو معقولات سے خصوصی مناسبت تھی) پڑھیں۔

درسیات کی تکمیل

شیخ نے نصاب کی منتہیانہ کتابیں خود مولانا محمد یحیٰی صاحب سے ختم کیں، مولانا کی تدریس کا

---

[1] فرماتے تھے کہ ایک فاسد العقیدہ آدمی نے ایک انگریز کی فرمائش پر یہ کتاب لکھی، معلوم نہیں ہمارے بزرگوں نے اس کو اس قدر اعزاز کیوں بخشا" حیرت کی بات ہے کہ ابھی تک ہمارے مدارس عربیہ میں (زبان کی مفید سبق آموز اور زبان آموز کتابوں کی موجودگی میں) یہی کتاب چل رہی ہے (مؤلف)

خاص اصول اور طریقہ تھا، ان کے یہاں استاد کے خود تقریر کرنے، اور سارے مطالب کو خود حل کر کے دے دینے کا دستور نہ تھا، جیسا کہ اس وقت بڑے بڑے عربی مدرسوں میں رواج پڑ گیا ہے کہ استاد شرح وبسط کے ساتھ تقریر کرتے ہیں، اور مطالب کے حل کرنے کی ساری ذمہ داری انھیں پر ہوتی ہے، طلبہ کی حیثیت صرف سامع اور شریک مجلس کی ہوتی ہے، مولانا کے یہاں طالب علم کا مطالعہ کر کے سبق کو پورے طور پر حل کر کے لانے کی پابندی تھی، وہ صرف وہیں رہنمائی اور مدد فرماتے تھے، جہاں طالب علم کی قوت مطالعہ اور فہم کی رسائی نہ ہو، اور شرح وحواشی سے مدد نہ ملتی[1]، اس لئے ان کے یہاں اہمیت کتاب کے حرفاً حرفاً ختم کرنے کے بجائے، کتاب کے مطالب اور موضوع پر حاوی ہو جانے اور مطالعہ میں ملکہ پیدا ہو جانے کی تھی، اور جس وقت ان کو اطمینان ہو جاتا تھا، وہ کتاب کو بائے بسم اللہ سے تائے تمت تک ختم کرانے کو ضروری نہیں سمجھتے تھے، اور دوسری کتاب شروع کرا دیتے تھے۔

اس زمانہ میں مولانا ماجد علی صاحب[2] کی معقولات کے درس وتعلیم میں خاص شہرت تھی، انھوں نے معقولات کی اعلیٰ کتابیں خیر آبادی اساتذہ سے بڑی تحقیق ومحنت سے پڑھی تھیں، اور ان کو معقولات کی تعلیم میں بڑا توغل اور انہماک تھا، دور دور سے لوگ ان سے منطق وفلسفہ کی اعلیٰ کتابیں پڑھنے بینڈھو ضلع علی گڑھ وغیرہ جایا کرتے تھے، مولانا ماجد علی صاحب

---

[1] قدیم اساتذہ کا یہی دستور تھا، اور اس وقت تک کے تجربوں اور تعلیمی نظریات کے مطابق یہی بہترین اصول تعلیم ہے۔

[2] مولانا ماجد علی صاحب مانی کلاں ضلع جونپور کے رہنے والے تھے، معقولات کی تعلیم مولانا عبد الحق صاحب خیر آبادی سے پائی، حدیث گنگوہ جا کر پڑھی، بینڈھو گلاوٹھی اور مدرسہ عالیہ کلکتہ میں عرصہ تک مدرس رہے، علوم عقلیہ اور کتب منطق کے درس وتدریس میں نامور اور مرجع طلبہ تھے، ۱۹۳۴ء میں عید الفطر کے دن وفات پائی اور اپنے وطن میں مدفون ہوئے۔

حدیث حضرت گنگوہیؒ سے پڑھی تھی، اس درس میں مولانا محمد یحییٰ صاحب ان کے رفیق تھے، اور دونوں میں بڑی دوستی اور بے تکلفی تھی، اس تعلق کی بناء پر اور کچھ شیخ کی غیر معمولی ذہانت اور علمی مناسبت دیکھ کر انھوں نے مولانا محمد یحییٰ صاحب سے فرمایا کہ شیخ کو ایک سال کے لئے ان کے حوالہ کر دیا جائے، وہ ان کی معقولات کی تکمیل کرا دیں گے، یہ بھی فرماتے تھے کہ مجھے امید ہے کہ وہ بخاری شریف بھی مجھی سے پڑھنے کی خواہش کرے گا، لیکن اس کی نوبت نہ آئی، اور شیخ کو اپنی تعلیمی تکمیل اور حصول علم کے لئے سہارنپور سے کہیں باہر جانے کی ضرورت پیش نہ آئی۔

تعلیم میں انہماک و یکسوئی

مولانا محمد یحییٰ صاحب کو تعلیم سے کہیں زیادہ تربیت کا اہتمام تھا[1]، ان کے یہاں پڑھنے،

---

[1] مولانا محمد یحییٰ صاحب کی تربیت کے نرالے انداز، اور ان کی ذہانت اور سلامت فہم کے عجیب واقعات ہیں، یہاں پر ایک واقعہ درج کیا جاتا ہے، جب شیخ کی فقہ کی تعلیم شروع ہوئی تو اس افتتاح کے موقعہ پر مولانا نے شیخ کو بیس روپے عطا فرمائے، پھر ارشاد فرمایا کہ ان کا کیا کرو گے؟ شیخ نے جواب دیا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ اکابر اربعہ، سہارنپوری، دیوبندی، رائے پوری، تھانوی کی خدمت میں پانچ پانچ روپے کی مٹھائی پیش کردوں، بڑی مسرت کے ساتھ اس کی تصویب فرمائی، پھر دریافت فرمایا، کہ کون سی مٹھائی؟ شیخ نے متفرق مٹھائیوں کے نام لئے، فرمایا لاحول ولا قوۃ، ان میں سے کون ایسا ہے، جو مٹھائی کھاتا، تمہاری خاطر میں ایک آدھ ڈلی چکھ لیں گے، باقی سب دوسروں کی نذر ہو جائے گی، ایسا کرو کہ پانچ روپے کی مصری (شکر) خرید کر حضرت کی خدمت میں پیش کر دو، ایک مہینہ تک تمہاری ہی مصری کی چائے نوش فرمائیں گے، چنانچہ تعمیل کی گئی، بقیہ اکابر ثلاثہ کی خدمت میں پانچ پانچ روپے نقد مختلف اوقات میں پیش کر دیئے گئے، ان سب حضرات نے بڑی مسرت سے قبول فرما کر دعائیں دیں۔

اور محنت کرنے سے زیادہ اس بات کی نگرانی ہوتی تھی کہ شیخ کسی لڑکے یا اپنے کسی رفیق، یا کسی نوجوان کے ساتھ بے تکلف نہ ہوں، اور کسی سے ان کا خلا ملا نہ ہونے پائے، اس پر ان کی بڑی کڑی نگاہ رہتی تھی کہ شیخ کسی سے ہنستے بولتے یا کسی ساتھی، یا اہل محلہ سے راہ و رسم تو نہیں پیدا کرتے، راستہ چلتے اگر کوئی ان کو خصوصیت کے ساتھ سلام کرتا، یا ایک نماز سے زیادہ نمازوں میں کوئی ہم عمر، یا نوجوان دو ایک بار ان کے برابر کھڑا ہو جاتا تو اس پر جواب طلب ہو جاتا، اور تنبیہ کی نوبت آتی، اس ڈر سے شیخ بھی اس کی بڑی احتیاط رکھتے، اور سب سے الگ تھلگ اپنے کام میں مشغول رہتے، مولانا محمد یحییٰ صاحب کی احتیاط اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ اپنے یا مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی ہمراہی کے بغیر مدرسہ سے باہر جانے یا مجلس میں بیٹھنے کی اجازت نہ تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کبھی سیر و تفریح کا شوق پیدا نہ ہوا، اور وہ طبیعت ثانیہ بن گئی، سہارنپور میں بڑے بڑے جشن کا موقعہ آتا اور نمائش ہوتی، آپ والد صاحب کی اجازت کے باوجود اس میں شریک نہ ہوتے، یہ یکسوئی اور تنہائی پسندی اتنی بڑھی کہ ایک مرتبہ مدرسہ قدیم سے چھ مہینے تک باہر جانے کی نوبت نہ آئی۔[۱]

---

[۱] مدرسۂ قدیم میں ابتدا سے سب ضروریات کا انتظام ہے، مدرسہ، کتب خانہ، مسجد، غسل خانہ، اور بیت الخلاء سب موجود ہیں، بیت الخلاء کے لئے کچھ ٹوٹے پھوٹے جوتے بھی پڑے رہتے ہیں، اس طرح بعض اوقات شیخ کو ہفتوں اور مہینوں اپنا جوتا استعمال کرنے، یا نیا جوتا خریدنے کی بھی ضرورت پیش نہ آئی۔

شیخ فرماتے ہیں "ایک مرتبہ میرا نیا جوتا مدرسہ میں سے کسی نے اٹھا لیا تو تقریباً چھ ماہ تک مجھے دوسرا جوتا خریدنے کی ضرورت نہیں ہوئی، کیونکہ اس مدت میں مجھے مدرسہ سے باہر قدم نکالنے کی نوبت ہی نہیں آئی، مدرسہ ہی کی مسجد میں جمعہ ہوتا تھا، اور مدرسہ کے بیت الخلاء میں ایک دو جوتے جو کسی کے پرانے ہو جاتے ہیں وہ ڈال دیتا، جواب تک بھی دستور ہے، اس وجہ سے مجھے کسی ضرورت کے واسطے بھی مدرسہ کے دروازے سے نہ تو باہر قدم رکھنا پڑا، نہ جوتے کی ضرورت ہوئی" (الاعتدال ص ۳۱-۳۲)

حدیث کا آغاز

بالآخر وہ مبارک دن، اور وہ مبارک ساعت آئی کہ اس علم کی تعلیم کا آغاز ہوا جس کے دامن سے ساری عمر وابستہ رہنے، اور اسی کی خدمت کے لئے وقف ہو جانے کا فیصلہ قضا و قدر میں ہو چکا تھا، اور جس کی نسبت پیدائشی نام پر اس طرح غالب ہو کر رہنے والی تھی کہ "شیخ الحدیث" نام کا قائم مقام اور نام سے بھی زیادہ مشہور ہوا، اس دن حدیث کے خادموں اور اس کے ناشرین اور شارحین کی صف میں ایک وقیع اضافہ ہونے والا تھا، اور کیا عجب ہے کہ اس "نووارد" کی آمد پر اس فن اور اس کے مخلص خدمت گزاروں کی روح نے کہا ہو کہ۔ ع

آمد آں یارے کہ ما می خواستیم

اس سلسلہ کا آغاز بھی بڑے اہتمام کے ساتھ ہوا، ۷ محرم ۱۳۳۲ھ کو ظہر کی نماز کے بعد مشکوٰۃ شریف شروع ہوئی، پہلے مولانا محمد یحییٰ صاحب نے غسل فرمایا، پھر مشکوٰۃ شریف کی بسم اللہ کرائی، خطبہ پڑھا، پھر رو بہ قبلہ ہو کر دیر تک دعا کی، شیخ فرماتے ہیں کہ یہ تو نہیں معلوم ہو سکا کہ والد صاحب نے کیا کیا دعائیں کیں، لیکن میری ایک ہی دعا تھی، اور وہ یہ کہ "حدیث کا سلسلہ دیر میں شروع ہوا، خدا کرے کبھی چھوٹے نہیں[1]"۔

مولانا محمد یحییٰ صاحب حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ایسے شاگرد تھے کہ استاد کو بھی اپنے اس شاگرد پر ناز تھا، حضرت کے عمیق مطالعہ، دقیق فہم، اور خصوصی تحقیقات علمیہ کے ماسوا کہ مولانا محمد یحییٰ صاحب نے ان کو قلم بند بھی کیا، اور ان کی شرح و وضاحت بھی فرمائی[2]، وہ اپنی

---

[1] اس دعا کی قبولیت کے آثار سب کے سامنے ہیں، عیاں را چہ بیاں [2] ملاحظہ ہو ترمذی کی تقریر درس و تعلیمات، موسوم بہ "الکوکب الدری" اور بخاری کی تعلیقات معروف بہ "لامع الدراری"۔

خداداد علمی مناسبت، وذکاوت، فن حدیث سے شغف وانہماک، اور اپنی نکتہ رس طبیعت، اور ذوق سلیم کی وجہ سے حدیث کی تدریس، اور (فقہ وحدیث کی تطبیق میں) خاص مقام رکھتے تھے، اور ان کے شاگرد رشیدان کے درس کے بعد کم کسی کے درس حدیث کے قائل ہوتے تھے۔

دورۂ حدیث

۱۳۳۳ھ میں دورۂ حدیث کی ابتدا ہوئی، یہی سال تھا جب حضرت سہارنپوری نے طویل قیام کے ارادہ سے حجاز کا قصد کیا، شیخ کا خیال تھا کہ مجھے نہ ملازمت کرنی ہے اور نہ کوئی عجلت ہے، ایک سال میں دورۂ حدیث مکمل کرنے کی کوئی پابندی نہیں، اس لئے اپنے والد مولانا محمد یحییٰ صاحب کے درس میں ابوداؤد شروع کردی، ترمذی شریف کو حضرت سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ کی واپسی پر ملتوی رکھا تھا، لیکن بعض اسباب کی بناء پر ترمذی، بخاری اور (ابن ماجہ کے سواء) بقیہ کتب صحاح والد صاحب ہی سے پڑھیں، یہ سال بڑی محنت اور انہماک کا تھا، اس کا بڑا اہتمام تھا کہ کوئی روایت بھی بے وضو نہ پڑھی جائے، مسلسل پانچ چھ گھنٹے سبق ہوتا تھا، اس میں کبھی کبھی ہفتہ عشرہ میں سبق کے درمیان وضو کی ضرورت پیش آتی تھی، اور اتنی دیر کے لئے اٹھنا ہوتا تو ہم درس وہم مذاق رفیق کوشش کرتے کہ حرج نہ ہو، اور سبق آگے نہ بڑھنے پائے۔

حضرت سہارنپوری سے بیعت

شوال ۱۳۳۳ھ میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب طویل قیام کے ارادہ سے حجاز کا

قصد فرمارہے تھے، اور لوگ کثرت سے بیعت ہو رہے تھے، شیخ فرماتے ہیں کہ بچوں کی طرح سے دیکھا دیکھی اپنے اندر بھی جذبہ پیدا ہوا، حضرت سے عرض کیا، حضرت نے ارشاد فرمایا کہ جب میں مغرب کے بعد نفلوں سے فارغ ہو جاؤں، اس وقت آجانا، مولانا عبداللہ صاحب گنگوہی جو خلافت سے سرفراز ہو چکے تھے، انھوں نے بھی تجدید کی درخواست کر رکھی تھی، حضرت نے فراغت کے بعد دونوں کو قریب بلایا، اور اپنے دونوں ہاتھ دونوں کے ہاتھوں میں پکڑا دیئے اور بیعت کے الفاظ کہلوانا شروع کئے، مولانا عبداللہ صاحب نے ہچکیوں کے ساتھ دھاڑیں مار کر رونا شروع کیا، جس کا اثر حضرت پر بھی تھا، حضرت کی آواز بھرّا گئی، اس وقت مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ اور حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ اوپر بیٹھے ہوئے تھے، وہ یہ آواز سن کر منڈیر پر دیکھنے کے لئے آئے، دیکھا تو شیخ بھی بیعت ہو رہے ہیں، اس پر مولانا کو تعجب اور احساس ہوا، کہ بلا علم و اطلاع کے انھوں نے اتنا بڑا کام کر لیا، لیکن حضرت رائے پوریؒ نے اس جرأت کی بڑی تصویب فرمائی، اور بہت دعائیں دیں۔

مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ کی وفات پر شیخ کی بلند ہمتی

باکمال مشفق و مربی والد ماجد کی وفات کے سانحۂ عظیم کو شیخ نے اپنی نوعمری کے باوجود ضبط و تحمل اور قوت ایمانی سے نہ صرف برداشت کیا، جو اہل الیقین اور اصحاب نسبت کی شان ہے، بلکہ پورے خاندان، اور غمزدہ گھر کے لئے تسکین و تقویت کا ذریعہ بن گئے، مولانا نے آٹھ ہزار کا قرض چھوڑا تھا، شیخ نے اس موقعہ پر بڑی مردانگی، اور بلند ہمتی کا ثبوت دیا، جن کا بھی علم ہو سکا، ان کو فوراً یہ خطوط لکھ دیئے کہ مرحوم قرضہ سے بری ہیں، وہ قرضہ میرے ذمہ ہے، اس وقت شیخ کی عمر انیس ۱۹ سال کی تھی، عام طور پر سب قرض خواہوں کو

قدرتاً یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ رقم ضائع ہو جائے گی، اس لئے بہت شدت سے مطالبے شروع ہو گئے، شیخ ایک سے لے کر دوسرے کو ادا کر دیتے تھے، یہ سال بہت شدت کا گزرا، مولانا مرحوم کا قرض تو دو تین مہینے میں ختم ہو گیا، اور وہ اس سے بالکل سبکدوش ہو گئے، البتہ شیخ مقروض ہو گئے، ۱۳۴۴ھ تک اس قرضہ کا، جو مولانا کے قرض کی ادائے گی میں ہو گیا تھا، ایک ہزار شیخ کے ذمہ باقی تھا، جس کی ادائیگی ۱۳۴۴ھ میں حج کے سفر کے موقعہ پر مولوی نصیر الدین صاحب کے حوالہ کر کے گئے، جو اس وقت ناظم کتب خانہ تھے۔

طالب سے زیادہ مطلوب

ذی قعدہ ۱۳۳۴ھ میں مولانا محمد یحییٰ صاحب نے انتقال فرمایا تو صدمہ کی شدت اور محبت کے جذبہ سے لائق فرزند کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ بس اب دوبارہ بخاری، ترمذی پڑھنے کی ضرورت نہیں، لیکن حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نے واپسی پر حکم فرمایا کہ ترمذی، و بخاری دوبارہ پڑھنی ہے، شیخ فرماتے ہیں کہ طبیعت بالکل نہیں چاہتی تھی، لیکن انکار کی کوئی صورت نہ تھی، اسی دوران میں خواب دیکھا کہ حضرت شیخ الہند (مولانا محمود حسن دیوبندیؒ) فرماتے ہیں کہ مجھ سے بخاری پڑھ لو، سوچتا رہا کہ حضرت مالٹا میں اسیر ہیں، ان سے پڑھنے کہاں جاؤں؟ حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے خواب سنا تو فرمایا کہ اس کی تعبیر یہی ہے کہ مجھ سے دوبارہ پڑھو۔

بالآخر حضرت کے یہاں کتابیں شروع ہوئیں، یہ سال انتہائی انہماک کا دور تھا، فرماتے ہیں، جہاں تک مجھے یاد ہے، شب و روز میں دو ڈھائی گھنٹے سے زیادہ سونا نہیں ہوتا تھا، ساری رات شروح حدیث کا مطالعہ کرتے، اور سبق میں پورے طور پر تیار ہو کر جاتے،

اس محنت وانہماک، اور فطری سعادت، اور خوش بختی نے حضرت کی نظر انتخاب کو متوجہ کر دیا، اور وہ تقریب پیدا ہوئی، جو شیخ کامل کے قرب واختصاص، اور استاذ فاضل کے انتخاب واعتماد کی موجب ہوئی، اور اس سے شیخ کی زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا جو ان کے مستقبل کی کامیابیوں، اور اقران واماثل میں خصوصیت وامتیاز کا راز ہے۔

"بذل المجہود" کی تالیف میں اعانت وشرکت

درس میں شرکت کو دو مہینے گزرے تھے، حضرت ایک دن سبق پڑھا کر دارالطلبہ سے مدرسہ قدیم آ رہے تھے، شیخ حسب معمول ساتھ تھے، راستہ میں ایک جگہ کھڑے ہو کر ارشاد فرمایا:-

"ابوداؤد پر ہمیشہ کچھ لکھنے کی خواہش رہی، تین مرتبہ شروع کر چکا ہوں، لیکن مشاغل کے ہجوم نے چلنے نہ دیا، حضرت گنگوہی قدس سرہ کی حیات میں بار بار شروع کیا، یہ جی چاہتا رہا کہ کسی طرح لکھ لوں، اور جو اشکال ہو حضرت قدس سرہٗ سے حل کر لوں، حضرت کے وصال کے بعد یہ جذبہ سرد ہو گیا، لیکن پھر یہ خیال ہوا کہ ہمارے مولانا یحییٰ صاحب تو حیات ہیں، ان سے بحث ومباحثہ کرتے رہیں گے، مگر ان کی وفات پر یہ ارادہ بالکل نکال دیا تھا، اب مجھے یہ خیال ہو رہا ہے کہ اگر تم دونوں[1] میری مدد کرو، تو میں شاید لکھ لوں۔"

شیخ نے بے ساختہ جواب دیا کہ حضرت ضرور شروع کریں، "اور یہ میری دعا کا اثر ہے" حضرت نے فرمایا، کیسی دعا؟ شیخ نے کہا کہ میں نے مشکوٰۃ شروع کرتے وقت یہ دعا کی تھی کہ یا اللہ حدیث پاک کا سلسلہ بہت دیر میں شروع ہوا ہے، یہ اب مجھ سے چھوٹے نہیں، مگر اس کو

---

[1] یعنی شیخ الحدیث اور ان کے رفیق قدیم مولوی حسن احمد مرحوم جو محلہ کھالے پار سہارنپور کے رہنے والے تھے، اور نہایت خاموش متین اور سنجیدہ مسکین طبع نوجوان تھے، جوانی ہی میں انتقال ہو گیا، رحمہ اللہ۔

میں محالات سے سمجھتا تھا، اور یہ سوچتا تھا کہ اگر میں پڑھنے کے بعد مدرس بھی ہو گیا، تو حدیث تک نہ معلوم کتنے سال میں پہونچوں گا، اس لئے کہ قدیم مدرسین جو کئی سال سے پڑھا رہے ہیں ان کو حدیث ابھی تک پڑھانے کی نوبت نہ آئی، اب صورت سمجھ میں آگئی، حضرت کی شرح میں اس ناکارہ کا اشتغال رہے گا، اور جب تک وہ مکمل ہو گیا بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ حدیث کی تدریس تک پہونچا دے، یہ واقعہ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ کا ہے، یہی "شرح بذل المجہود" کی ابتدا ہے۔

حضرت نے اسی وقت شروح حدیث کی ایک لمبی چوڑی فہرست بتادی، اور کتب خانہ سے لینے کا حکم فرمادیا۔
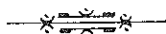
باب سوم

تدریس و تصنیف، چند نازک امتحانات و اجازت و تکمیل

تدریس پر تقرر

یکم محرم ۱۳۳۵ھ کو حضرت شیخؒ کا بحیثیت مدرس مدرسہ مظاہر العلوم میں تقرر ہوا، اور ۱۵ روپے[1] تنخواہ مقرر ہوئی۔

ابتداءً دو سبق ("اصول الشاشی" جو پہلے مولانا محمد الیاس صاحب کے یہاں ہو رہی تھی، اور "علم الصیغہ" جو مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی کے پاس تھی) منتقل ہو کر آئے، اس کے علاوہ چار، پانچ سبق نحو و منطق اور فقہ اور عربی کی ابتدائی کتابوں کے تھے، اس وقت شیخ کی عمر

---

[1] اس زمانہ کے قدیم مدارس میں تنخواہوں کا معیار آج سے بہت مختلف تھا، خصوصاً ابتدائی مدرسین کی تنخواہیں اتنی کم ہوتی تھیں، جو آج کل کے لوگوں کے قیاس میں مشکل سے آئیں گی، چنانچہ مولانا منظور احمد صاحب کی جو بعد میں مدرسہ کے بڑے اساتذہ میں سے ہوئے، ابتدائی تنخواہ للعہ ۴ روپے تھی، بہت عرصہ کے بعد وہ ۱۲ تک پہونچے، شیخ فرماتے ہیں کہ میری (۱۵ کی) تنخواہ پر سب کی انگلیاں اٹھتی تھیں، حضرت شاہ عبد الرحیم صاحب رائے پوری قدس اللہ سرہ نے جو مدرسہ کے سرپرستوں میں سے تھے، بحیثیت سرپرست کے فرمایا کہ شیخ پر والد صاحب کے انتقال کے بعد جو بار ہے اس کے لحاظ سے یہ تنخواہ کم ہے، کم سے کم پچیس ۲۵ روپے ہونی چاہئے تھی، لیکن شیخ سے فرمایا کہ جب اللہ توفیق دے تو یہ تنخواہ چھوڑ دینا، چنانچہ شیخ نے اس پر عمل کیا، اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

بیس٢٠ سال تھی، اور مدارس کی روایات اور دستور کے لحاظ سے ان کو اصول الشاشی گویا قبل از وقت مل گئی تھی، لیکن بہت جلد شیخ نے اپنی محنت، ذہانت اور مطالعہ و تیاری سے اپنی غیر معمولی اہلیت اور استحقاق کا ثبوت دیا، اور طلبہ اتنے مطمئن اور گرویدہ ہوئے کہ انھوں نے پڑھا ہوا حصہ بھی شیخ سے دوبارہ پڑھنے کی خواہش کی۔

اگلے تعلیمی سال شوال ۳۵ھ میں پہلے سال سے اونچی اور درسی و فنی لحاظ سے اہم کتابیں پڑھانے کو ملیں، تیسرے سال شوال ۳۶ھ میں مقامات حریری اور سبع معلقہ بھی درس میں آئے، سبعہ معلقہ منتظمین نے بڑے شک و تذبذب کے ساتھ دیا تھا، اس جماعت میں وہ طلبہ بھی تھے، جو حدیث کے بعض اسباق میں شیخ کے ہم درس رہے تھے، لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد مدرسہ کے قابل احترام اور مخلص ناظم مولانا عنایت الٰہی صاحب نے ان لفظوں میں شیخ کی کامیابی کا اعتراف کیا کہ "مولوی زکریا! تم نے تو میری آنکھیں نیچی کردیں" ۱۳۳۷ھ میں ہدایہ اوّلین، حماسہ وغیرہ اور رجب ۴۱ھ میں بخاری شریف کے تین۳ پارے بھی حضرت سہارنپوری کے حکم و اصرار سے منتقل ہوکر آئے، اور ان کے پڑھانے میں بھی شیخ سے غیر معمولی اہلیت، قوت مطالعہ، اور فنی مناسبت کا اظہار ہوا، اس کے بعد آپ کو مشکوٰۃ مل گئی، ۴۴ھ تک مشکوٰۃ آپ کے زیر درس رہی۔

"بذل المجہود" کے کام کا انہماک اور حضرت سہارنپوری کی خصوصی شفقت و اعتماد

شیوخ کاملین سے استفادہ اور باطنی ترقیات میں اس بات کو بڑا دخل ہے کہ ان کی مفوضہ خدمت کی تکمیل، اور ان کے ذوقی مشغلہ میں (جو ان کو دل و جان سے عزیز ہوتا ہے) نہ صرف خود فراموشی، اور جانکاہی سے رفاقت و اعانت کی جائے، اہل بصیرت کے

نزدیک ایک مسترشد کو اس سے اپنے شیخ کی جو محبوبیت و اعتماد حاصل ہوتا ہے، اور اس سے جو باطنی ترقیات حاصل ہوتی ہیں، اور جس سرعت کے ساتھ سلوک کے مدارج طے ہوتے ہیں، وہ عام طور پر کسی اور راہ سے، اور بعض اوقات بڑے بڑے مجاہدات سے بھی طے نہیں ہوتے، اس زمانہ میں حضرت سہارنپوری ہمہ تن "بذل المجہود" کی تالیف کی طرف متوجہ تھے، اور اس کی تکمیل کا جذبہ اور ذوق ہر چیز پر غالب تھا، یہ شیخ کی بڑی خوش قسمتی اور اسی کے ساتھ ان کی بڑی ذہانت، اور حقیقت شناسی تھی کہ انھوں نے اپنے کو اس کام کے لئے وقف کر دیا، اور دنیا و مافیہا سے بے خبر اور بے تعلق ہو کر اپنی پوری صلاحیتوں کے ساتھ اس میں لگ گئے، تالیف کا طرز یہ تھا کہ حضرت شروح حدیث، اور مآخذ کی نشاندہی فرما دیتے، شیخ ان کا مطالعہ کر کے متعلقہ مواد جمع کر لیتے اور حضرت کی خدمت میں اس کو پیش فرما دیتے، حضرت اپنے الفاظ میں اس کو منتخب اور مرتب کر کے مصنفانہ حیثیت سے لکھواتے، تسوید اور تحریر کا یہ کام شیخ انجام دیتے، اس نتیجہ میں حضرت کا قرب و اختصاص روز بروز بڑھتا چلا گیا۔

انسانی فطرت کے مطابق اس چیز نے شیخ کے ہم عمروں اور ان نوجوان علماء یا ان کے سرپرستوں کے دل میں رشک و منافست کا جذبہ پیدا کیا، جو حضرت کا قرب و اختصاص چاہتے تھے، ان میں سے بعض حضرات نے کہا کہ اس مشغولیت سے تدریس پر اثر پڑتا ہے، اس کے لئے کسی ایسے معین کا انتخاب ہونا چاہیے جس پر تدریس کا بار نہ ہو، اور وہ مدرسہ کا ملازم نہ ہو، چنانچہ ایک دوسرے صاحب اس کام کے لئے مقرر ہوئے، لیکن جن کو مقرر کیا گیا، وہ جلدی جلدی گھر چلے جاتے تھے، حضرت کو اس سے گرانی ہوتی، اس پر شیخ نے پھر اپنی خدمات کی پیش کش کی، حضرت نے ارشاد فرمادیا کہ میرا کام دوسرے سے نہیں چلتا،

اس طرح وہ خدمت پھر شیخ کے سپرد ہوگئی، دوسری مرتبہ تسوید و تحریر کے لئے ایک ایسے صاحب کو مقرر کیا گیا جو زیادہ خوش خط تھے لیکن کاپی نویس نے کہدیا کہ مجھے شیخ کے خط سے نقل کرنے میں زیادہ آسانی ہوتی ہے اس لئے کہ اس میں نقطوں وغیرہ کا اہتمام رہتا ہے اس طرح گھوم پھر کر یہ خدمت شیخ ہی کے پاس آگئی۔

شیخ نے اس عرصہ میں سوائے شدید مجبوری کے ہر طرح کے سفر، نقل و حرکت، اور ہر اس چیز سے جس سے اس کام میں حرج واقع ہو گریز کیا، ان کو پہلے بھی سفر سے وحشت اور عدم مناسبت تھی، اس زمانۂ تالیف میں تو انھوں نے اپنے کو گویا بالکل پابہ زنجیر بنالیا، بعض مرتبہ ایسا ہوا کہ بعض بزرگوں اور عزیزوں کے اصرار سے حضرت نے کسی سفر میں اپنے ساتھ لے لیا، شیخ نے موقعہ دیکھ کر راستہ میں عرض کیا کہ اگر اس سفر میں ہم رکابی رہی تو بذل کی کاپیوں کی تصحیح میں حرج واقع ہوگا، اس لئے راستہ ہی سے واپسی کی اجازت دی جائے، حضرت نے یہ سن کر بخوشی اجازت دے دی، اور شیخ راستہ ہی کے کسی اسٹیشن سے واپس آگئے۔

جب بذل کی طباعت کا مرحلہ شروع ہوا تو پہلے اس کا انتظام میرٹھ میں کیا گیا، اس کے بعد تھانہ بھون میں مولانا شبیر علی صاحب کے پریس میں اس کو منتقل کر دیا گیا، اس وقت شیخ کا معمول تھا کہ جمعرات کی شام کو تھانہ بھون جاتے، اور سنیچر کی صبح کو واپس آتے، یہ سفر ہر ہفتہ یا پندرہ دن میں ایک مرتبہ پیش آتا، اس میں کبھی کبھی جو اتوار کو پریس کو چھٹی نہ ہوتی تو ایک آدھ دن بڑھ جاتا، عرصہ تک یہ معمول رہا، اس کے بعد ۴۲ھ سے ۱۳۴۴ھ تک دہلی کے ہندوستانی پریس میں طباعت کا کام ہوتا رہا، اس زمانہ میں اکثر ہفتہ وار، اور کبھی پندرہ ۱۵ دن میں دہلی جانا ہوتا تھا، جمعہ کی شب میں بارہ بجے کی گاڑی سے روانہ ہوتے،

بارہ بجے تک اپنا کام کرتے، پھر تنہا پیادہ پا اسٹیشن جاتے، بذل کی کاپیاں سینہ سے لگا کر سو جاتے، دہلی اسٹیشن سے سیدھے مطبع جاتے، شام کو مطبع کے بند ہونے کے بعد شیخ رشید احمد صاحب مرحوم کے یہاں تشریف لے آتے، اور دوسرے دن اتوار کی شب میں دہلی سے روانہ ہو کر ایک بجے سہارنپور پہونچ جاتے، یہ ان دو تین سال کا مستقل معمول رہا، شیخ فرماتے ہیں کہ "اتوار کو پریس کی چھٹی ہوتی تھی، لیکن ہندوستانی پریس کے مالک جو ایک شریف اور خلیق ہندو تھے، اس ناکارہ کے ساتھ ضرورت سے زیادہ مدارات کرتے، وہ کبھی کبھی میرے کام کی اہمیت کی وجہ سے ایک دو مشینوں کی چھٹی موقوف کر دیتے، اور کارکنوں کو اوور ٹائم (OVER TIME) دیتے، اس صورت میں بجائے اتوار کی شب کے پیر منگل کو واپسی ہوتی، شمائل ترمذی کا ترجمہ خصائل نبوی انھیں ایام میں صرف دہلی کے قیام میں لکھا گیا، جب دہلی جاتا تو حاجی محمد عثمان صاحب مرحوم کی دکان سے جو پریس کے بالکل قریب تھی یہ اوراق اٹھا لیتا، اور پروفوں کی تصحیح سے جو وقت بچتا اس میں ایک آدھ صفحہ کا ترجمہ لکھ لیتا، اور جب واپس آتا تو ان اوراق کو انھیں کی دکان پر رکھ کر چلا آتا گویا یہ تالیف صرف ایام سفر کی ہے، البتہ نظر ثانی میں طباعت کے وقت کچھ اضافے ہوئے۔

عقد نکاح

مولانا محمد یحییٰ صاحب کے انتقال پر معاً شیخ کی والدہ صاحبہ کو بخار شروع ہو گیا تھا، اور اس نے بڑھتے بڑھتے دق کی صورت اختیار کر لی، انھوں نے مولانا کے انتقال کے بعد ہی سے شدت سے شیخ کی شادی کا تقاضہ کیا، اور فرمایا کہ میں جلد ہی

جانے والی ہوں، میرا دل چاہتا ہے کہ تیرا گھر کھلا رہے، شیخ کی نسبت مولانا رؤف الحسن صاحب کی صاحبزادی بی بی امۃ المتین صاحبہ سے تھی[1] انھوں نے اپنی اس خواہش کا اظہار حضرت سہارنپوری سے کیا، حضرت نے کاندھلہ لکھوا دیا، کہ میرا خیال ہے کہ عزیز زکریا کا نکاح جلد ہو جائے، امتثال حکم میں ان حضرات نے لکھ دیا کہ جب چاہیں تشریف لے آئیں، چنانچہ حضرت چند آدمیوں کو لے کر کاندھلہ تشریف لے گئے، نکاح کے بعد شیخ نے کہلوایا کہ کاندھلہ تو میرا وطن ہے، رخصتی کرا کے لے جانے کی ضرورت نہیں، میں دو تین روز کاندھلہ ٹھہر کر چلا آؤں گا، کاندھلہ والوں نے قدرتاً اس کو بہت پسند کیا، لیکن جب حضرت کو یہ فقرہ پہونچا تو فرمایا کہ "وہ کون ہے لے جانے والا؟ باپ بن کر تو میں آیا ہوں[2]، لڑکی کل میرے ساتھ جائے گی" چنانچہ دوسرے دن رخصتی ہو گئی، اور یہ حضرات سہارنپور واپس آئے، ۲۷ رمضان ۱۳۳۵ھ کو والدہ ماجدہ نے انتقال کیا، حضرت سہارنپوری نے نماز جنازہ پڑھائی۔

---

[1] ایک صاحبزادی مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے نکاح میں تھیں، جو مولانا محمد یوسف صاحب کی والدہ تھیں، اس طرح شیخ اور مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہم زلف بھی تھے، ان اہلیہ سے شیخ کی پانچ صاحبزادیاں تولد ہوئیں (۱) زکیہ۔ زوجۂ اولیٰ مولانا محمد یوسف صاحبؒ (۲) ذاکرہ۔ زوجۂ مولانا انعام الحسن صاحبؒ (۳) شاکرہ۔ زوجۂ مولوی احمد حسن صاحب ابن حاجی محمد محسن (۴) راشدہ۔ زوجۂ مولوی سعید الرحمن ابن مولانا لطیف الرحمن (مولوی سعید الرحمن کی وفات کے بعد ان کا نکاح مولانا محمد یوسف صاحبؒ سے ان کی زوجۂ اولیٰ کے انتقال کے بعد ہوا) (۵) شاہدہ زوجۂ مولوی حکیم محمد الیاس سہارنپوری۔ [2] حضرت شیخ کے ساتھ جو پدرانہ اور سرپرستانہ تعلق تھا، اس کی مزید تصدیق اس واقعہ سے ہو گی جو شیخ نے لکھا ہے، فرماتے ہیں کہ:۔

"ایک اجنبی نے میرے ہر وقت کی حاضری پر حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سے کہا یہ حضرت کے صاحبزادہ ہیں، حضرت نے ارشاد فرمایا صاحبزادہ سے بڑھ کر" (رسالہ فضائل زبان عربی ص۳)

عقد ثانی

شیخ کی پہلی اہلیہ محترمہ کی وفات جو مولانا رؤف الحسن صاحب کی صاحبزادی تھیں، ۵ ذی الحجہ ۱۳۵۵ھ (۱۷ فروری ۱۹۳۷ء) میں ہوئی، ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ کے قلب پر اس کا طبعی اثر تھا، اور ان کی طبیعت اب بالکل یکسوئی اور علمی و تصنیفی انہماک کی طرف مائل تھی، اور عقد ثانی کا کوئی خیال نہیں تھا[1] لیکن شفیق چچا نے جو باپ کے قائم مقام تھے، شیخ کے اس تجرد کو پسند نہیں کیا، دوسرے شفیق بزرگوں اور بہی خواہوں کی بھی خواہش تھی کہ شیخ کا گھر پھر آباد ہو اس لئے چار مہینے بھی پورے نہیں گزرے تھے کہ شیخ کا عقد ثانی حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کی صاحبزادی (مولانا محمد یوسف صاحب کی ہمشیرہ) عطیہ صاحبہ سے ۸ ربیع الثانی ۱۳۵۶ھ (۱۸ جون ۱۹۳۷ء) کو ہو گیا[2] نکاح نظام الدین دہلی میں ہوا، اس موقعہ پر حضرت مولانا عبد القادر صاحب رائے پوری بھی تشریف لے آئے، حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی کو سہارنپور اسٹیشن پر معلوم ہوا تو پیغام بھیجا کہ نکاح میں ہی پڑھوں گا، چنانچہ دہلی تشریف لائے، اور بعد نماز جمعہ نکاح پڑھایا۔[3]

پہلا حج

۱۳۳۸ھ میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری نے پھر حج کا عزم فرمایا،

---

[1] اپنی "آپ بیتی" میں لکھتے ہیں کہ "مرحومہ کے انتقال کے بعد میں اپنے مشاغل علمیہ کی وجہ سے بالکل ہی بیٹھے کر چکا تھا کہ دوسرا نکاح نہیں کروں گا کہ بڑا حرج ہوگا۔" (آپ بیتی ج۳ ص۸۵) [2] ان اہلیہ محترمہ سے شیخ کے فرزند ارجمند مولوی محمد طلحہ سلمہ اللہ تعالیٰ اور دو صاحبزادیاں، صفیہ، خدیجہ ہوئیں۔
[3] آپ بیتی ج۳ ص۱۶۱-۱۶۲

شیخ کو اب تو یہ یاد نہیں کہ ان پر حج فرض تھا یا نہیں؟ لیکن بیت اللہ کا شوق، اور مرشد کی ہم رکابی کا جذبہ رفاقت کا محرک ہوا، یہ شیخ کا حج اسلام (پہلا حج) تھا، شعبان ۱۳۳۸ھ کی کسی تاریخ کو روانگی ہوئی، حضرت نے بمبئی میں اعلان فرما دیا کہ جس کو جس سے مناسبت ہو وہ اس کے ساتھ کھانے میں شریک ہو، شیخ مولوی مقبول صاحب کی اجازت و منظوری سے جو حضرت کے منتظم کار تھے، حضرت ہی کے شریک طعام، اور خادم خاص رہے، جس کو حضرت نے بخوشی منظور کر لیا، شیخ نے مصارف کے لئے اپنی پوری رقم بلا حساب کتاب مولوی مقبول صاحب کے حوالہ کر دی، جہاز ہی میں رمضان شروع ہو گیا، تراویح کا انتظام ہوا، حضرت اور شیخ دونوں قرآن شریف سناتے تھے، مکہ معظمہ حاضری ہوئی تو مولانا محب الدین صاحب[1] نے جلد ہندوستان واپس جانے کا مشورہ دیا، اور فرمایا کہ یہاں تو ایک قیامت آنے والی ہے[2].

رمضان مبارک میں شیخ کا معمول تھا کہ تراویح سے فراغت کے بعد، روزانہ احرام کی چادریں لے کر، پیدل اپنے چند ہم عمر نوجوان ساتھیوں کے ساتھ "تنعیم" جاتے اور "عمرہ" لاتے، ساری رات اسی مبارک معمول میں گزرتی، اس زمانہ میں حجاز میں سخت بدامنی تھی، قافلے لٹتے تھے، اور حجاج سخت خطرات، اور مصائب سے گزر کر مدینہ طیبہ پہونچتے تھے، شوال کا مہینہ شروع ہوا، تو حضرت نے فرمایا کہ میں تو مدینہ طیبہ کئی بار حاضری دے چکا ہوں، معلوم نہیں تم لوگ پھر حاضر ہو سکو یا نہیں، اس لئے مدینہ طیبہ کی زیارت کر آؤ، شیخ کو یہ کہہ کر کہ "الائمۃ من قریش" قافلہ کا امیر بنا دیا، خدا کے فضل و کرم سے راستہ

---

[1] آپ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ممتاز خلیفہ، اور بڑے صاحبِ کشف و ادراک بزرگ تھے،

[2] شریف حسین کی بغاوت، اور نجدیوں کے حملہ کی طرف اشارہ ہے.

بڑے امن و اطمینان کے ساتھ طے ہوا، رفقائے سفر، اور عرب جمال، شیخ سے بہت مانوس اور بے تکلف رہے، اور انھوں نے بڑی خدمت کی، مدینہ طیبہ میں صرف تین دن کا قیام کا ارادہ تھا لیکن بعض غیبی اسباب کی بنا پر ایک ماہ کا قیام رہا، اس زمانہ میں مدت مقررہ سے زائد رہنے پر فی یوم ایک گنّی ادا کرنی پڑتی تھی، لیکن یہ مدت قیام نہ صرف مفت، بلکہ امیر مدینہ کی معذرت کے ساتھ پوری ہوئی، اس سفر میں اور بھی غیبی مدد دیں، اور عنایات خاص رہیں، جن کے واقعات شیخ بڑے لطف اور کیفیت سے بیان فرماتے تھے۔

شیخ کے منشا کی تکمیل میں سعی و جانفشانی

اسی سفر (۳۸-۱۳۳۹ھ) میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نے علی جان والوں کے یہاں "مصنف عبدالرزاق" کا قلمی نسخہ دیکھا، حضرت نے مدرسہ مظاہر العلوم کے لئے اس کے خریدنے کی خواہش ظاہر فرمائی، انھوں نے سو گنّی اس کی قیمت بتلائی، قیمت بہت زیادہ تھی، حضرت نے اس کے خریدنے کا ارادہ ترک فرما دیا، شیخ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ حضرت اس کی اجازت ملے تو شاید ہم لوگ اس کو نقل کر لیں، حضرت نے فرمایا واپسی کے چند دن باقی ہیں، اتنے میں کیسے نقل ہوگی؟ میں نے عرض کیا کہ انشاء اللہ ضرور ہو جائے گی، آپ اجازت لے لیں، حضرت نے اُن سے نقل کی اجازت مانگی، انھوں نے یہ سمجھ کر کہ یہ تو ممکن ہی نہیں ہے، دس بارہ دن واپسی کے رہ گئے ہیں، کیوں انکار کریں، یہ کہہ دیا کہ بڑے شوق سے نقل کرائیں، شیخ نے قیام گاہ پر لا کر اس کی جلد توڑ دی، اس کا زیادہ حصہ اپنے ذمہ اور بقیہ رفقاء کے ذمہ تقسیم کر دیا، جو اس سفر میں ساتھ تھے، صبح سے لے کر ظہر تک سب اس کو نقل کرتے، اور عصر سے مغرب تک شیخ اور حضرت اس کا مقابلہ کرتے،

دسؔ پندرہ۱۵ دن میں نقل مکمل ہوگئی، اور واپسی سے ایک دو دن پہلے اس کی جلد بندھوا کر کتاب واپس کردی گئی۔[1]

ظاہر ہے کہ شیخ کی اس عالی ہمتی، جفاکشی اور حضرت کی دلی خواہش کی تکمیل میں اپنی راحت و آرام اور دوسرے مشاغل کو قربان کرنے سے حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ کو کیسی دلی مسرت ہوئی ہوگی، اور ان کے دل کی گہرائی سے کیسی دعائیں نکلی ہوں گی۔

محرم ۱۳۳۹ھ میں سہارن پور واپسی ہوئی۔

چند نازک امتحان، اور توفیق الٰہی

شیخ کو شروع سے پے در پے ایسے نازک امتحانات پیش آئے جن میں اچھے اچھے لوگوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں، اور کوہ گراں بھی اپنی جگہ سے جنبش کر جاتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے شیخ کو ثابت قدم، اور راسخ العزم رکھا، ایسے امتحانات، اور توفیق الٰہی سے ان میں ثابت قدمی، بعض اوقات پورے مستقبل کا فیصلہ کردیتی ہے، اس عالم اسباب میں اس کے بڑے دور رس نتائج نکلتے ہیں، ایک چھوٹا سا واقعہ بعض اوقات زندگی میں حد فاصل کا کام دے دیتا ہے، اور بہت سی ترقیات، اور فتوحات کا مستحق بنا دیتا ہے۔

(۱) مولانا محمد یحییٰ صاحب کے انتقال کے تیسرے ہی دن حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری نے، جن کو معلوم تھا کہ مولانا محمد یحییٰ صاحب پر قرض کا بڑا بار تھا، ذرائع آمدنی اور ترکہ میں وہ ایک چھوٹا سا کتب خانہ چھوڑ کر گئے ہیں، جس کی بکری نہ ہونے کے برابر ہے اپنی والدہ اور ہمشیرہ کی کفالت اس نو عمر یتیم (شیخ الحدیث) کے ذمہ ہے، ارشاد فرمایا کہ

---

[1] آپ بیتی ۲ صفحہ ۲۳۴-۲۳۵

یہ امور بہت قابل فکر ہیں، تم ابھی بچے ہو تجارت کا تجربہ نہیں، مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی کو تجارت کا بڑا تجربہ ہے، تم اپنا کتب خانہ لے کر میرٹھ منتقل ہو جاؤ، اور مولانا عاشق الٰہی صاحب کے زیر نگرانی مکتبہ چلاؤ انشاء اللہ قرض بھی جلد ادا ہو جائے گا، اور متعلقین کی کفالت بھی سہولت سے ہو جائے گی، شیخ فرماتے ہیں کہ مجھے خوب یاد ہے کہ اس وقت میرے پاؤں کے نیچے کی زمین نکل گئی، میں نے آبدیدہ ہو کر عرض کیا کہ حضرت یہ حکم ہے تو میرے سر آنکھوں پر اور اگر مشورہ ہے تو میری تمنا تو یہ ہے کہ حضرت سہارنپوری کی زندگی میں کسی دوسری جگہ نہ جاؤں [۵۲]، حضرت رائے پوری نے یہ جواب سن کر فرمایا کہ بس بس آگے کچھ کہنا نہیں ہے، میری بھی یہی خواہش تھی، مگر مولانا عاشق الٰہی صاحب نے فرمایا کہ میرے کہنے کا تو اثر نہ ہوگا آپ حکم فرمائیں، اس کے ساتھ بڑی دعائیں دیں [۵۳]۔

(۲) شیخ کے خاندان کا تعلق مدرسۃ العلوم علی گڑھ سے (جو بعد میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام سے مشہور رہوا) بہت قدیم اور گہرا تھا، علی گڑھ تحریک کے بانی سر سید احمد خاں مولانا نور الحسن صاحب کاندھلوی کے شاگرد تھے، اور انھوں نے اس تلمذ کا ہمیشہ بڑا احترام کیا، جس کے نتیجہ میں اس خاندان کے ذہین اور شریف نوجوان مختلف دوروں میں علی گڑھ کالج سے استفادہ کرتے رہے، ان میں بیسویں صدی کے ابتداء میں دو بھائی مولوی بدر الحسن صاحب (جو سب ججی کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے) اور مولوی علاء الحسن صاحب (جو ڈپٹی کلکٹری کے عہدہ پر فائز ہوئے) خاص طور پر ممتاز و نامور ہوئے، شیخ کے اکثر ہم عمر، اور قریبی عزیز

---

۵۱ آپ بیتی ص ۲۵ ۵۲ حضرت سہارنپوری اس وقت حج سے واپس آئے تھے، اور نینی تال جیل میں تحقیقات کے سلسلہ میں مقیم تھے، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "حیات خلیل" ص ۲۲۱-۲۲۲

۵۳ یاد رہے کہ اس وقت شیخ کی عمر انیس [۱۹] سال تھی۔

علی گڑھ میں تعلیم پاتے تھے، مولوی بدرالحسن صاحب نہ صرف علی گڑھ کے اولڈ بوائے (OLD BOY) تھے، بلکہ کالج کے ٹرسٹی، اور اس کے اہم ارکان میں سے تھے، اس وقت لکھنؤ میں سب جج تھے، شیخ کی تنخواہ صرف ۱۵ پندرہ روپے ماہانہ تھی، آئندہ کی ترقیات کا بھی حال معلوم تھا، والد صاحب کا انتقال ہو چکا تھا، خاندان کا معیار زندگی، زمینداری، اور اعلیٰ سرکاری عہدوں کی وجہ سے خاصا بلند تھا، مولوی بدرالحسن صاحب نے ازراہ شفقت یہ منصوبہ بنایا کہ شیخ جن کی ذہانت، اور ادبیت خاندان میں مشہور اور مسلّم تھی، پرائیویٹ طریقہ پر علوم مشرقیہ کا اور اس کے ذریعہ یونیورسٹی کا امتحان دیدیں، اس کے بعد کالج میں تین سو ۳۰۰ روپے کی ملازمت یقینی ہے، خاندان کے بزرگوں کی طرف سے اس بارے میں نہ صرف تائید تھی، بلکہ اصرار تھا، جو ناراضگی کی حد تک پہونچ گیا، لیکن شیخ نے ادب، مگر شدت کے ساتھ اس سے انکار کیا، اور فرمایا کہ رزق اللہ کے ہاتھ میں ہے، اور اس میں کمی و بیشی کا تعلق صرف مقدر سے ہے، اگر اللہ کو رزق کی کشائش، اور روزی کی فراخی منظور ہے تو یہیں بیٹھے بیٹھے وہ حاصل ہو گی، ورنہ ہزار جتن کرنے کے بعد بھی اس کی کوئی ضمانت نہیں، شیخ کا یہ جواب سن کر خاندان کے ایک بزرگ (مولوی شمس الحسن صاحب) نے جو شیخ کو سمجھانے آئے تھے، بڑی مسرت کا اظہار کیا اور بڑی داد دی[1]۔

(۲) اس سے بڑا امتحان چند دنوں کے بعد پیش آیا، کرنال میں نواب عظمت علی خاں مظفر جنگ کے مشہور وقف کی جانب سے ایک بڑا تبلیغی دارالعلوم قائم کیا گیا، جس کی خصوصی غرض و غایت یہ تھی کہ اسلام کی تبلیغ، اور اس کی حقانیت ثابت کرنے کے لئے، نیز جدید بد شبہات، اور مخالفین اسلام کے اعتراضات کا جواب دینے کے لئے، جو اس وقت

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "آپ بیتی" ۲ ص ۸۷ تا ۸۹

اپنی تبلیغی کوششوں میں بہت سرگرم تھے، ایسے فضلاء تیار کئے جائیں، جو عربی وانگریزی دونوں سے واقف، اور علوم قدیم وجدید دونوں کے جامع ہوں، اس کے لئے یہ تجویز ہوئی کہ بڑے وظائف دے کر مستند عربی مدارس کے فضلاء کو انگریزی، اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کے فارغین کو عربی پڑھائی جائے، مولانا سر رحیم بخش صاحب مرحوم، جو ریاست بہاولپور کے صدر کونسل اور ریجنٹ تھے، اس تحریک کے بڑے سرپرستوں میں تھے، ان کا تعلق گنگوہ، رائے پور، اور سہارنپور سے خادمانہ اور مخلصانہ تھا، اور وہ مظاہر العلوم کے بھی سرپرستوں میں تھے، انھوں نے ابتدائی مدرس حدیث کے لئے شیخ کا انتخاب کیا، اور اس کے لئے سہارنپور کا مستقل سفر کیا[1]، ضابطہ کی تین سو ماہانہ تنخواہ کے علاوہ، انھوں نے زیادہ سے زیادہ سہولتیں دینے کا وعدہ فرمایا، مثلاً رمضان کی چھٹی، حضرت کی خدمت میں رہنے کے لئے ہر سال تین ماہ کی چھٹی بلا وضع تنخواہ، اجناس کی سہولت، ان سب کے ساتھ ان کی صرف ایک شرط یہ تھی کہ حضرت پر ظاہر نہ ہو کہ یہ تحریک ان کی ہے، اس لئے کہ مظاہر العلوم کے ایک سرپرست کی حیثیت سے ان کے لئے یہ مناسب نہیں تھا کہ مدرسہ کے مدرس کو کسی اور جگہ کے لئے آمادہ کریں، انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ ایک دو سال کی چھٹی لے لو، اور یہ کہو کہ قرض کا بار زیادہ ہے، شادی بھی ہو چکی ہے، اور بچے بھی ہیں، مدرسہ کی تنخواہ میں گزارا نہیں ہوتا۔

اس وقت شیخ کی تنخواہ بیس روپے تک پہونچی تھی، مولانا سر رحیم بخش صاحب کے دیرینہ تعلقات ان کی بزرگانہ ومخدومانہ حیثیت، ان کا پرخلوص اصرار، قرض کا بار تنخواہ کی قلت، اور ترقی کے امکانات کا فقدان، یہ سب وہ "حقائق" تھے، جو اس پیشکش کو

---

[1] مدرسۂ کرنال کی ملازمت کی پیش کش کا قصہ ۴۰ھ اور ۴۲ھ کے درمیان کا ہے۔

قبول کرنے کی ترغیب بھی دیتے تھے، اور ان کے لئے شرعی، اخلاقی، و علمی دلائل بھی پیش کرتے تھے، یہ ایک نوجوان عالم کے لئے جو ذہانت کے جوہر سے آراستہ، اور حدیث و ادب میں شہرت یافتہ تھا، ایک بڑی آزمائش تھی، شیخ اس وقت حقیقتاً ایک دوراہے پر کھڑے تھے، اگر وہ اثبات میں فیصلہ کرتے، تو ان کی زندگی کا نقشہ ہی دوسرا ہوتا، اور آج شاید ان سطور کے لکھنے کی نوبت نہ آتی کہ عرصہ ہوا کہ وہ اسکیم فیل ہو چکی، مدرسہ کا نام و نشان باقی نہیں رہا، اس کے لائق مدرسین کچھ تو پیوند خاک ہو گئے، اور کچھ گمنامی کی زندگی گزار رہے ہیں، نظر بہ اسباب ظاہر شیخ کا معاملہ اس سے کچھ مختلف نہ ہوتا.

لیکن توفیق الٰہی نے دست گیری فرمائی، اور جس کو شیخ الحدیث کے لقب سے مقبول خاص و عام ہونا تھا، اور جس سے خدا کو حدیث کی خدمت، طلبائے علوم دینیہ کی تربیت، اور ایک عالمگیر دینی تحریک (تبلیغ) کی سرپرستی، اور مشائخ عصر کی جانشینی کا اہم کام لینا تھا، اس کو اس معاملہ میں صحیح فیصلہ کرنے کی توفیق عطا فرمائی گئی، شیخ کے الفاظ ہی میں سنئے، فرماتے ہیں:۔

> "اس ناکارہ نے مولانا مرحوم سے کہا کہ آپ کے مجھ پر احسانات بہت زیادہ ہیں، ان احسانات کے مقابلہ میں مجھے آپ سے معذرت کرنی، نہایت ہی نامناسب ہے، لیکن اس سب کے باوجود آپ تو مجھ سے یہ فرماتے ہیں کہ میں حضرت سے اجازت لوں، لیکن آپ کے براہ راست کہنے پر اگر حضرت مجھے حکم بھی فرمائیں گے، تو میں عرض کر دوں گا کہ اس حکم کی تعمیل سے معذور ہوں۔"

عزیمت کا یہ جواب سن کر مولانا رحیم بخش صاحب جو بڑے جوہر شناس، اور جہاں دیدہ تھے، کبیدہ خاطر نہیں ہوئے، بلکہ انھوں نے جواب کی بڑی قدر کی،

اور فرمایا کہ "میں تمہارا معتقد تو پہلے سے تھا، لیکن اس جواب سے میں اور زیادہ معتقد ہوگیا"۔

(۴) ۱۳۴۶ھ میں جب دورہ کے اسباق شیخ کے ذمہ تھے، اور خاص طور پر ابوداؤد کئی سال سے بڑی قابلیت سے پڑھا رہے تھے، ان کے ایک شاگرد مولوی عادل قدوسی گنگوہی کا جو دائرۃ المعارف حیدرآباد میں تصحیح کے کام پر ملازم تھے، ایک طویل خط آیا، اس میں لکھا تھا کہ دائرہ میں بیہقی کے اسماء رجال پر مستقل تالیف کا فیصلہ ہوا ہے، یہاں کی مجلس کی نظر اس کام کے لئے دو فاضلوں پر پڑی ہے، ایک مولانا انور شاہ صاحب پر، ایک آپ پر، کام چونکہ پُر مشقت اور طویل ہے، اس کے لئے جفاکش و جوان عمر آدمی کی ضرورت ہے، اس لئے دائرہ کا رجحان آپ کی طرف ہے، تنخواہ آٹھ سو روپے ماہوار ہوگی، سرکاری موٹر بھی ملے گی، اور مکان بھی دیا جائے گا، ملازمت صرف چار گھنٹے کی ہوگی، باقی آپ آزاد رہیں گے، کتب خانہ آصفیہ سے استفادہ کی بھی آزادی رہے گی (یاد رہے کہ شیخ اس وقت "اوجز المسالک" کی تالیف میں مشغول تھے، جس کے لئے وسیع کتب خانہ کی ضرورت تھی) اس پیش کش میں متعدد اقتصادی، اخلاقی و علمی ترغیبات تھیں، جن میں سے ہر ایک کے ساتھ بڑے قوی دلائل اور وجوہ جواز تھے، لیکن شیخ نے مسئلہ کو قابل غور اور لائق مشورہ بھی نہیں سمجھا اور اس کے جواب میں برجستہ ایک کارڈ لکھ دیا جس میں صرف یہ مصرعہ تھا۔ ع

مجھ کو جینا ہی نہیں بندۂ احسان ہو کر

نیچے دستخط تھے[1]

(۵) اس سے بڑا امتحان یہ پیش آیا کہ چاٹگام یا ڈھاکہ[2] کے مدرسۂ عالیہ سے

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "آپ بیتی" ج۱ ص۹-۱۰ [2] شیخ نے خود اس بارے میں تردد کا اظہار کیا ہے۔

واپسی کا کوئی ارادہ نہ تھا، رفقائے خاص کو اس کا علم تھا، اور کہتے تھے کہ آپ تو یہاں بقیع میں آسودۂ خاک ہونے کے لئے آئے ہیں، مدرسہ کے شیرازہ کو مجتمع رکھنے، اور اس دور پُرفتن کے آفات وشرور سے اس کو الگ رکھنے کے لئے، نیز ارشاد وتربیت کے اس سلسلہ کو جاری رکھنے کے لئے جو حضرت کی ذات سے وابستہ تھا، شیخ کی واپسی ہندوستان ہی کو مناسب تھی، مولانا سید احمد صاحب[1] مدنی نے اپنے مدرسہ شرعیہ کے لئے شیخ کو روکنے کی بڑی کوشش فرمائی، ان کا اصرار تھا کہ واپس نہ جائیں، وہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس کرایہ کی رقم بھیج دیں گے، تاکہ وہ شیخ کے متعلقین کو مدینۂ طیبہ پہونچا دیں، لیکن حضرت سہارنپوری نے مظاہر العلوم کی اہمیت کے پیش نظر اس کو قبول نہیں فرمایا، بلکہ شیخ کے لئے "شیخ الحدیث" کے عہدہ اور "نائب ناظم" کے منصب کی تحریر لکھ کر دے دی، جس پر شیخ نے بڑی عرض ومعروض کی، آخر میں حضرت مولانا عبد القادر صاحب رائے پوری کو بیچ میں ڈالا، مولانا نے ایک لطیف عنوان سے خدمت میں عرض کر کے "نائب ناظم" کی ذمہ داری سے ان کو سبکدوش کرا دیا، "شیخ الحدیث" کے منصب کے لئے حضرت نے اپنے دست مبارک سے تحریر لکھ کر کتاب میں رکھ دی، اور ایسا انتظام فرمایا، کہ شیخ کی نظر اس پر پڑ جائے۔

رخصت کرنے سے پہلے چاروں سلسلوں میں بیعت وارشاد کی عام اجازت عطا فرمائی، اور اس کے لئے بڑا اہتمام فرمایا، اپنے سر سے عمامہ اتار کر مولانا سید احمد صاحب کو دیا کہ شیخ کے سر پر باندھیں، جس وقت وہ عمامہ شیخ کے سر پر رکھا گیا، شیخ پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ چیخیں نکل گئیں، حضرت بھی آبدیدہ ہو گئے، شیخ نے بعض مجلسوں میں فرمایا کہ

---

[1] برادر اکبر حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رح و بانی مدرسہ علوم شرعیہ مدینہ منورہ۔

عمامہ رکھتے ہی مجھے اپنے اندر کوئی چیز آتی محسوس ہوئی، اس سے میں سمجھا انتقال نسبت کی شاید یہی حقیقت ہے، شیخ نے اس اجازت کو بہت پوشیدہ رکھا اور شاید عرصہ تک ہندوستان میں اہلِ تعلق کو اس کا علم نہ ہوتا، لیکن حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تشہیر کردی، پھر بھی عرصہ تک بیعت لینے سے انکار کرتے رہے، لیکن عم معظم مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حکم سے اس کا سلسلہ شروع کیا، سب سے پہلے خاندان کی چند بیبیوں نے بیعت کی درخواست کی، شیخ نے حسب عادت انکار و معذرت کی، انھوں نے مولانا محمد الیاس صاحب سے عرض کیا، مولانا نے شیخ کو بٹھایا اور حکم دیا کہ وہ بیعت کریں، شفقتاً اپنا عمامہ بھی سر پہ رکھ دیا، رفتہ رفتہ اہل صلاح و علم کا رجوع ہوا، اور وہ بڑھتا ہی چلا گیا۔

بابِ چہارم

سہارنپور کا مستقل قیام، تدریس و تصنیف، ارشاد و تربیت، حج کے اسفار، اور چند اہم واقعات

حجاز سے واپسی اور سہارنپور کے مشاغل

حجاز سے واپسی پر آپ ہمہ تن تدریس و تصنیف میں مشغول ہوگئے، واپسی کے بعد سے ابوداؤد کا درس بھی آپ ہی کے پاس آگیا، "بذل" کی ترتیب میں شریک رہنے، اور حضرت سہارنپوری کی خصوصی توجہ کی وجہ سے اس کی تدریس میں قدرتی طور پر آپ کو امتیاز حاصل تھا، "اوجز" کی تالیف کا سلسلہ بھی جاری تھا، حضرت گنگوہی اور والد ماجد کی تحقیقات و تقریرات کی اشاعت کا بھی شغل رہتا تھا، اس کے علاوہ دوسرے دینی و تبلیغی رسائل جو زیادہ تر بزرگوں و سرپرستوں بالخصوص عم بزرگوار حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے ارشاد و تاکید سے لکھے گئے، تحریریں آتے رہے۔

ان تدریسی و تصنیفی مشاغل کے علاوہ مدرسہ کے انتظام میں آپ شریک غالب اور مولانا حافظ عبد اللطیف صاحب کے قوتِ بازو اور دست راست تھے، بحث طلب مسائل و امور میں اکثر آپ ہی کی رائے فیصلہ کن اور قطعی ہوا کرتی تھی[1]، پھر مشائخ عصر اور اکابر سلسلہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی، حضرت مولانا عبد القادر صاحب رائے پوری، حضرت مولانا محمد الیاس صاحب

[1] مولانا عبد اللطیف صاحب ناظم مظاہر العلوم نے ۲ ذی الحجہ ۷۳ھ (۱۲ اگست ۱۹۵۴ء) کو وفات پائی۔

کاندھلوی، حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی، حضرت حافظ فخر الدین صاحب پانی پتی اور شاہ محمد یٰسین صاحب نگینوی، سب کی بکثرت آمد ورفت رہتی تھی، اور آپ سب کے معتمد علیہ، محبوب، مشیر، اور محرم راز تھے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو فطری جامعیت، اعتدال وتوازن، اور "بے ہمہ اور باہمہ" ہونے کی صفت عطا فرمائی تھی، اس کی وجہ سے آپ کی ذات اور آپ کا مستقر سب کا مرکز اور سب کے لئے "نقطۂ جامعہ" تھا، اور کلّیات سے لے کر جزئیات تک آپ اکثر مشیر و دخیل رہتے۔

اس سب کے ماسوا مہمانوں کا ہجوم جو اس مقبولیت کا قدرتی نتیجہ تھا، واردین اور صادرین کی کثرت، اور دسترخوان کی وسعت بڑھتی چلی گئی، اور اس نے آپ کی مشغولیت میں روز افزوں اضافہ کیا یہاں تک کہ وہ آپ کا ایک ایسا امتیاز بن گیا، اور اس نے ایک ایسی شہرت حاصل کرلی، جو بہت سے لوگوں کے لئے موجب حیرت ہے، مولانا حافظ عبد اللطیف صاحب کی وفات کے بعد جو ایک کہن سال، اور تجربہ کار مخلص اور مستعد ناظم تھے، مدرسہ کے انتظام اور انصرام، اور اس کی بقا وقیام کا سب سے بڑا بوجھ آپ پر پڑ گیا، اگرچہ حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب سابق صدر مدرس اپنے علم وفضل، اور اخلاص وللّٰہیت کی بناء پر مدرسہ کے قدیم شیوخ واکابر اور ذمہ داروں کے صحیح جانشین تھے، اور ان کا وجود مدرسہ کے لئے ایک بڑی نعمت تھی[1] لیکن ان کے گوناگوں امراض، بڑھتی ہوئی معذوری، اور طبعی ضعف کی بناء پر شیخ کو مدرسہ کے نظم ونسق اور جزئیات وکلّیات کے لئے خاصہ وقت دینا پڑتا، اور ان کی ذات، ان کی قوت فیصلہ اور ان کا شخصی اثر ہی مدرسہ کا پشت پناہ تھا۔

اِدھر خدا کا ان کے ساتھ خاص معاملہ یہ تھا کہ جو شیخ و مربّی دنیا سے جاتا وہ اپنے مسترشدین ومتعلقین کو یا تو خود شیخ کے سپرد کر جاتا، یا وہ خود کسی اشارۂ غیبی سے، یا اس

[1] ۱۵ر رجب ۱۳۹۹ھ (۱۱ر جون ۱۹۷۹ء) میں مولانا نے اس دارِ فانی سے رحلت فرمائی رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

شیخ الحدیث کے منصب کی پیش کش ہوئی، جس کی بارہ سو[۱۲] روپے تنخواہ تھی، اور صرف ترمذی اور بخاری پڑھانا تھا، پہلے خط آیا پھر ارجنٹ تار کہ خط کے جواب کا سخت انتظار ہے، شیخ فرماتے ہیں کہ تار کے جواب میں میں نے صرف یہ لکھدیا کہ معذوری ہے، خط میں مفصل لکھا کہ جن دوستوں نے آپ کو میرا نام دیا ہے، انھوں نے محض حسن ظن سے کام لے کر غلط روایات پہونچائی ہیں، یہ ناکارہ اس کا اہل نہیں ہے[لہ]۔

اس کے بعد پھر غالباً کوئی اور ایسا امتحان پیش نہیں آیا، اور نہ اس کا کوئی موقعہ تھا کہ شیخ کی بلند ہمتی، ان کا طرز زندگی، خداداد مقبولیت، اور خدا کی مسبّب الاسبابی کا غیبی مشاہدہ، جو ہر جانے والے، اور ہر آنے والے کو کھلی آنکھوں ہوتا رہتا تھا کسی کے اندر اس کا خیال بھی نہیں ہونے دیتا تھا کہ ایسا مشورہ دیا جائے، یا کوئی ایسی پیش کش کی جائے، نو عمری اور مدرسی کے آغاز ہی میں ان کی بلند ہمتی، اور عالی حوصلگی ایسے سب لوگوں کو یہ کہہ کر مایوس کر دیتی۔ ع

برو ایں دام بر مرغِ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

اور اس کے بعد جب اللہ تعالےٰ کی نصرت اور کفالت کا اور بھی مشاہدہ اور تجربہ ہو گیا، اور اللہ تعالےٰ نے مدارج عالیہ سے سرفراز فرمایا، اور اپنی محبت و رضا کی دولت سے نوازا، تو اب تو زبانِ حال، امیر خسرو کی زبان میں اس طرح گویا ہے کہ ؎

ہر دو عالم قیمتِ خود گفتئی
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز!

لہ "آپ بیتی" ۲ صفحہ ۱۱

(۶) ان امتحانات کے علاوہ جن کا تعلق معاشیات، زہد وقناعت اور فراغت ووسعت میں سے کسی ایک کے انتخاب سے تھا، ایک امتحان ابتدائے عمر میں اور بھی پیش آیا تھا، اور اس زمانہ کے حالات اور عمر کے لحاظ سے آسان امتحان نہ تھا، وہ یہ کہ مرزا ثریا جاہ کی صاحبزادی قیصر جہاں بیگم سے مولانا محمد یحییٰ صاحب کے رشتہ کو جب خود مولانا محمد اسماعیل صاحب، اور مولانا محمد یحییٰ صاحب نے قبول نہیں کیا، اور ان کی شادی اپنے گھرانہ میں ہو گئی، تو اس خاندان سے تعلق وعقیدت کی بناء پر ان کی تمنا ہوئی کہ وہ اپنی لڑکی کا نکاح شیخ الحدیث سے کر دیں، جن کی اس گھر میں بچوں کی طرح آمد ورفت تھی، مولانا محمد یحییٰ صاحب نے اس کو پسند نہیں کیا، مگر ان کے شدید اصرار پر ایک مرتبہ امتحاناً شیخ سے دریافت کیا، شیخ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ "پاندان لئے لئے پھرنا میرے بس کا نہیں" اس لئے کہ وہ یہ منظر اور قیصر جہاں مرحومہ کے شوہر مرزا شاہ مرحوم کا ان سے یہ والہانہ اور نیازمندانہ معاملہ دیکھتے تھے[۱] اس طرح وہ آزمائش سے بچ گئے، جو بہت سے غریب یا متوسط الحال شریف گھرانوں کے نوجوانوں کو کسی رئیس خاندان کا داماد بننے سے بارہا پیش آئی ہے، اس عمر میں ایسا خوددارانہ اور مبصرانہ جواب ایک غیر معمولی مستقبل کی پیشین گوئی کرتا تھا، اور فارسی کے اس شعر کی تفسیر تھا ؂

بالائے سرش زہوشمندی
می تافت ستارۂ بلندی

---

[۱] آپ بیتی ج۱ ص۱۱-۱۲

دوسرا سفرِ حج، حضرت کی رفاقت اور مدرسہ کی تنخواہ کا معاملہ

۱۳۴۴ھ میں حضرت سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ نے حج کا قصد فرمایا، اپنی غیرموجودگی میں مدرسہ کا انتظام اس طرح کیا کہ مولانا حافظ عبداللطیف صاحب کو مدرسہ کا ناظم[1]، اور شیخ کو صدر مدرس مقرر کیا، مظاہر العلوم کے صدر مدرس کی ذمہ داریوں، اور روایات میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ مختلف شہروں میں ہونے والے ان تبلیغی اور دینی جلسوں میں شرکت بھی کرے جہاں سے دعوت آئے، نیز مدارس کے سالانہ اجتماعات وغیرہ میں بھی شریک ہو، شیخ کو سفر سے شروع ہی سے وحشت اور عدم مناسبت تھی، یہ معلوم کرکے کہ حضرت نے صدر مدرسی کے لئے ان کو نامزد فرمایا ہے، اس عہدہ کی جلالتِ شان، اور اس کی ذمہ داریوں کے خیال سے شیخ کو فکر پیدا ہوئی، انھوں نے حضرت سے عرض کیا کہ حضرت "بذل" کے کام کا کیا ہوگا؟ اس کا سلسلہ تو سفر میں منقطع ہو جائے گا، فرمایا، ہاں! مجھے بھی اس کا خیال ہے، عرض کیا کہ میں ساتھ چل سکتا ہوں، اس خدمت کو انجام دوں گا، فرمایا، مصارفِ سفر کا کیا انتظام ہوگا؟ عرض کیا کہ قرض لے لوں گا، فرمایا! تمہاری تنخواہیں بھی تو باقی ہیں، میں نے عرض کیا کہ میں نے تو یہ اجارہ فسخ کر دیا، فرمایا، فسخ دونوں طرف سے ہوتا ہے، تم نے تو فسخ کیا، ہم نے تو منظور نہیں کیا، حضرت کے اس حکم پر شیخ نے ان مہینوں کی تنخواہیں وصول کیں، جن کو وصول نہیں کیا تھا[2]، جن کی مجموعی رقم ۹۴۰ یا ۹۴۲ ہوتی تھی، شیخ نے اس حکم کی تعمیل تو کی، اور اس سے سفر کا بآسانی انتظام ہو گیا، لیکن حجاز پہونچکر ایک ہزار کا وصیت نامہ

---

[1] بعض دوسرے عربی مدارس میں مہتمم کی اصطلاح مروّج ہے۔ [2] دوران ملازمت میں شیخ کبھی تنخواہ لیتے تھے کبھی نہیں لیتے تھے، جن مہینوں کی تنخواہیں لیتے تھے ان کے متعلق بھی یہی نیت تھی کہ واپس کردیں گے۔

مدرسہ کو بھیج دیا کہ میری واپسی تک مولوی نصیر الدین صاحب میرے کتب خانہ سے بالاقساط ادا کرتے رہیں، چنانچہ اس پر عمل ہوا، واپسی پر شیخ نے یہ حساب مع اس اضافہ کے جو بعد میں ہوا، اور جس کی میزان ۲۷۱۷ (دو ہزار سات سو سترہ روپیہ) ہوتی تھی، ادا کر دی۔

حج کا یہ سفر، اور استاد و مرشد کی مسلسل و ہمہ وقت رفاقت ایک عالی استعداد، سراپا محبت و اطاعت مسترشد کے لئے جس کے سفر کا اصل مقصد ہی شیخ کی خدمت و اعانت، اور استفادہ تھا، جیسی روحانی اور باطنی ترقیات، اور حصول کمالات کا ذریعہ بنی ہوگی، اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں، شیخ نے مدینہ طیبہ کے طویل قیام میں بھی حضرت کی خدمت میں حاضر رہنے "بذل" کی تالیف میں مدد دینے کے علاوہ کسی مشغلہ اور دلچسپی سے سروکار نہیں رکھا، اس مصروفیت و انہماک کی وجہ سے وہ مسجد نبوی کی حاضری، اور بقیع کی زیارت کے علاوہ کہیں آجا نہیں سکے۔

"بذل" کے کام کے علاوہ انھوں نے (غالباً مدینہ طیبہ کی رعایت سے) امام دار الہجرۃ امام مالکؒ کی مشہور و مقبول کتاب "مؤطا" کی شرح لکھنی شروع کی، جو "اوجز المسالک" کے نام سے بعد میں چھ جلدوں میں مکمل ہوئی،[1] مکہ مکرمہ کے قیام میں بھی اگر حضرت نے کسی کتاب کی نقل، یا کوئی علمی خدمت سپرد کر دی، تو شیخ نے اس کی تکمیل کو بھی اپنا وظیفہ، اور اپنی ترقی کا ذریعہ سمجھا، اور اس میں پورے انہماک سے کام لیا۔

اجازت و رخصت

حضرت سہارنپوری مدینہ طیبہ میں مستقل قیام کے ارادہ سے گئے تھے، آپ کا

---

[1] شیخ فرماتے ہیں کہ اس کی تصنیف کا کام مواجہ شریف کے قریب ہوتا تھا، اور جتنا حصہ مدینہ طیبہ کی مختصر مدت قیام میں لکھا گیا، وہ ہندوستان کے مہینوں اور برسوں کے قیام میں بھی نہ ہو سکا۔

جس پر ۲۵۔۳۰ سے لے کر ۴سو ۵سو تک کا مجمع نہ ہو، چونکہ ایر کنڈیشنڈ کی وجہ سے اس کی کھڑکیاں نہیں کھل سکتی تھیں، اس لئے ہر اسٹیشن پر اٹھ کر دروازہ تک آنا پڑتا تھا، مجھے تو رات میں لیٹنے کی بھی نوبت نہ آئی، سنا ہے کہ اس ہجوم میں میری پاکستان میں پہلی آمد کو بھی دخل ہے۔

حرمین شریفین تو جا کر معلوم ہوا تھا کہ یہ سیاہ کار محدث ہے، ہر دو جگہ کے مشائخ واساتذہ کا اجازت حدیث کا اتنا زور بندھا کہ میں اپنی نااہلیت کی وجہ سے معذرت اور لعل وسوف کرتا تھک گیا، پاکستان آکر معلوم ہوا کہ یہ روسیاہ پیر بھی ہے، معتقدین کے ہجوم نے ایسا محبوس رکھا کہ زیادہ اوقات چاروں طرف کے کواڑ بند کئے اندر بند رہنا پڑا، بدھ کو عصر کے بعد لائل پور سے سرگودھا روانگی ہوئی، اور جمعرات کی شام کو عصر کے بعد سرگودھا سے ڈھڈیاں شریف، لائل پور اور سرگودھے کی گرمی اس قدر ناقابلِ برداشت تھی کہ باوجود چاروں طرف برف کی سلّیوں اور کئی کئی بجلی کے پنکھوں کے اس کم ہمت کو سکون نہ ہوتا تھا، لائل پور میں ۱۱۷ اور سرگودھا میں ۱۲۱ درجہ بتایا جا رہا تھا، ڈھڈیاں سے ہر شخص ڈراتا تھا کہ وہاں نہ بجلی ہے نہ پنکھا اور وہ گرمی میں سرگودھا کا تابع ہے، اس لئے اپنے کو بھی بہت ہی فکر تھا، مگر حضرت نور اللہ مرقدہٗ کو زندگی میں ہمیشہ اس ناکارہ کی راحت کی فکر رہی اور اب بھی اس کا ظہور ایسا ہوا کہ ڈھڈیاں کے ۳ دن منصوری بلکہ چکر دتہ کے حکم میں تھے، رات کو کپڑا اوڑھنا پڑتا تھا، دن کو بھی عین دوپہر میں وہ ٹھنڈی ہوائیں زوردار چلتی تھیں کہ لطف آجاتا تھا، اوقات ایسے آخر تک گھرے ہوئے ہیں کہ وہاں کے ۳ دن بھی بہت سے احباب کا دل برا کر کے تجویز ہوئے تھے، اس لئے اضافہ کی

گنجائش نہیں تھی، وہاں کے ۳ دن تو بلا مبالغہ حضرت اقدس رائے پوری قدس سرہٗ کے روانگی پاکستان کے آخری ایام تھے، کھڑکیوں اور دروازوں پر عورتوں اور مردوں کا سارا دن اسقدر ہنگامہ رہتا کہ بار بار کواڑ لگانے کی نوبت آتی تھی، لیکن پھر بھی مجمع بند کواڑوں پر مسلط رہتا، بھائی اسمٰعیل لائل پوری بہت زور لگا کر ان کو چلتا کرتے تھے، کواڑ کھلنے پر پھر ہجوم کا وہی حال، حضرت مولانا فضل احمد صاحب کئی دن پہلے ڈھڈیاں پہونچ چکے تھے، حضرت حافظ عبد العزیز صاحب گمتھلوی جمعہ کی صبح کو ڈھڈیاں تشریف لے گئے تھے، شام کو واپس آگئے تھے، اس کے بعد اتوار کی صبح کو تشریف لے گئے تھے، اور پیر کی صبح کو ہمارے ساتھ ہی واپس ہوئے، مولانا عبد العزیز صاحب رائے پور گوجراں، ان کے بھائی، مفتی عبد اللہ صاحب، ماسٹر منظور صاحب، مولوی سعید احمد ڈونگہ بونگہ تو کراچی ہی خبر سن کر پہنچ گئے تھے، آزاد صاحب بھی ہمارے ساتھ سرگودھے سے گئے، اور ساتھ ہی واپس ہوئے اور بھی حضرت کے مخصوص حضرات میں سے ایک بڑا مجمع جمع رہا، دسمبر میں جو اجتماع رائے پور میں جایا تھا، ہمارا مقدر وہاں تو نہ ہو سکا، بلکہ وہ ایک طوفان بن گیا لیکن ڈھڈیاں میں تین روز ذاکرین کا خوب ہجوم رہا، یہاں رات پہنچے، جمعہ کی صبح کو یہاں سے لاہور روانگی ہے، وہاں سے ایک شب رائے ونڈ کی ہے، اور ۱۵ر جولائی کو بذریعہ طیارہ لاہور سے دہلی، دہلی کا ارادہ آپ حضرات بالکل نہ کریں، بڑا ہجوم ہوگا، ملاقات بھی نہ ہو سکے گی، انشاء اللہ دیوبند کے کسی اجتماع میں اس ناکارہ کے لئے وقت نکال لیں، اطمینان سے ملاقات ہو جائے گی، بخدمت مولانا منظور احمد صاحب

مضمون واحد۔ فقط محمد زکریا پنڈی، ۷ جولائی منگل بقلم احسان۔

چوتھا حج

مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد ایک سال خالی گیا، اگلے سال ۱۳۸۶ھ (۱۹۶۷ء) حجاز میں کام کرنے والوں کا تقاضا ہوا کہ حجاز، نیز بیرونی ممالک میں کام اور کام کرنے والوں کی ضرورت و مصلحت کا اقتضا ہے کہ مولانا کے جانشین، اور تبلیغی دعوت کے موجودہ ذمہ دار مولانا انعام الحسن صاحب اپنے خاص رفقاء کے ساتھ اس سال حج کو آئیں، تاکہ دعوت میں نئی طاقت و استحکام، اور مزید وسعت و عمومیت پیدا ہو، بڑے غور و خوض، اور حالات و ضروریات کا جائزہ لینے کے بعد حضرت شیخ الحدیث کے مشورہ اور تائید سے اس کو منظور کر لیا گیا، یہ مولانا انعام الحسن صاحب کا مولانا محمد یوسف صاحبؒ کے بعد اور ان کے بغیر حج کا پہلا سفر تھا جس میں ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ اسلامی و غیر اسلامی ممالک کے بکثرت رفقاء، احباب و کارکن، اور علماء و خواص کا اجتماع متوقع تھا، قدرتاً مولانا انعام الحسن صاحب کی طبیعت پر اس سفر کی اہمیت، اور اپنی تنہائی کا احساس غالب تھا، اور ان کا قلبی و طبعی تقاضا تھا کہ حضرت شیخ الحدیث کی معیت ان کے لئے اس عظیم سفر میں تقویت و طمانیت کا موجب ہو، دوسری طرف حجاز کے اہل تعلق اور جماعت کے رفقاء، اور کارکنوں کے پیہم خطوط، اور متواتر تقاضے آرہے تھے کہ شیخ اس سفر میں ضرور ساتھ ہوں، حجاز اور پاکستان کے اہل تعلق کو صرف اسی سفر کے بہانے، اور اسی سفر کی تقریب سے زیارت و صحبت کا موقعہ مل سکتا تھا۔

شروع میں جماعت کے نظم ونسق کی نگرانی، اور مولانا انعام الحسن صاحب کے باہر چلے جانے کی وجہ سے جو خلا پیدا ہوتا تھا، اس کے پیش نظر شیخ الحدیث کا نہ جانا سہارنپور میں طے کر دیا گیا، اور اس کی اطلاع بھی دے دی گئی لیکن جوں جوں مولانا انعام الحسن صاحب کی روانگی کی تاریخ قریب آتی جا رہی تھی، سارے ہندوستان میں شیخ کے جانے کی خبر بھی گرم ہو رہی تھی، اور استفساری خطوط کا تانتا بندھ رہا تھا، اور مقررہ تاریخ پر دہلی اور بمبئی زائرین اور رخصت کرنے والوں کے پہونچنے کی اطلاعیں آ رہی تھیں، بالآخر ۱۹ فروری ۱۹۶۷ء کو شیخ دہلی تشریف لے آئے، اور ابھی تک روانگی طے نہ تھی، کسی وقت جانے کی خبر گرم ہو جاتی تھی، کسی وقت نہ جانے کی، راقم السطور، مولانا محمد منظور صاحب، اور مولوی معین اللہ صاحب ندوی رخصت کرنے کی نیت سے ۲۰ فروری کو دہلی پہونچے، شیخ نے فوراً یاد فرمایا، اور تخلیہ کا حکم دیا، اس وقت صرف مولانا انعام الحسن صاحب، مولانا منظور صاحب، اور یہ ناچیز تھا، شیخ نے اپنی ذہنی کشمکش اور تردد کا اظہار فرمایا، اور بعض غیبی اشارات و مبشرات، دوستوں کے انتظار و اشتیاق، سفر کے محرکات، اس کے مقابلہ میں قیام کے اسباب و موجبات کا ذکر فرماتے ہوئے رائے طلب کی، ہم لوگوں نے قیام کا رجحان ظاہر کیا، اور اس کے مصالح عرض کئے، شام تک کوئی ایک پہلو غالب اور قطعی نہیں معلوم ہوتا تھا، رات کو جب سعودی سفیر محمد الحمد الشبیلی ملنے کے لئے تشریف لائے، اور اس موقعہ پر مجلس خاص میں حاضری ہوئی تو جانے کا فیصلہ معلوم ہوتا تھا، چنانچہ یہ اندازہ ہو گیا کہ سفر طے ہو گیا ہے۔

ملاقات اور رخصت کرنے والوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا، نظام الدین میں ایک جگہ سے دوسری جگہ آنے جانے اور شیخ تک پہونچنے میں ہزار دقتیں معلوم ہوتی تھیں،

یگانگت واعتماد کی بناء پر جوان کے شیخ و مربّی روحانی کو شیخ پر تھا، وہ سب شیخ کی ذات ہی کی طرف رجوع کرنے اور بالعموم شیخ سے اپنی تکمیل و تربیت، اور مشورہ و رہبری کا کام متعلق کردیتے، مولانا محمد الیاس صاحبؒ کا معاملہ تو گھر ہی کا تھا لیکن ان سے پہلے مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی، اور ان کے بعد مولانا مدنیؒ، پھر حضرت رائے پوری، اور سب کے آخر میں مولانا محمد یوسف صاحب کی وفات کے بعد ان سب حضرات کے اکثر اہل ارادت اور اہل تعلق نے شیخ ہی کو اپنا روحانی سرپرست، مشیر و رہنما، اور اپنے مشائخ کا جانشین اور وارث و امین سمجھا، پھر خصوصیت کے ساتھ مولانا محمد یوسف صاحب کی رحلت کے بعد تبلیغی حلقہ کا جس نے اب عالمگیر شکل اختیار کرلی ہے، اور ہندوستان سے متجاوز ہو کر ایک طرف مراکش اور دوسری طرف انڈونیشیا تک، اور یورپ و امریکہ تک پھیل گیا ہے، آپ ہی مرجع اور مرکز بن گئے، اس سلسلہ کو باقی رکھنے، اس کو زمانہ کے خطرات، اور اس دور کے فتنوں سے بچانے، اس کے مسلک و اصول کی حفاظت، اس کے سرگرم کارکنوں کی دینی نگرانی، روحانی تربیت و تکمیل کی ساری ذمہ داری، اور نظام الدین کے مرکز، اور اس کے ذمہ داروں کی سرپرستی کا پورا بوجھ آپ ہی کے کاندھوں پر پڑ گیا، اسی کے ساتھ جتنا جتنا یہ حلقہ وسیع ہوتا گیا، کام کی مقبولیت بڑھتی گئی، مشائخ کبار اٹھتے جاتے، آپ کی مرجعیت و مرکزیت اور ذمہ داریوں میں اضافہ ہوتا رہتا، اور ملک کے اندر اور ملک کے باہر سے آنے والی جماعتیں، اور وفود کی آمد و رفت بھی بڑھتی رہتی اور اسی کے مطابق آپ کی مشغولیت اور ضیافت و تواضع کا دامن بھی وسیع ہوتا چلا جاتا، یہاں تک کہ اگر کوئی ناواقف، یا نووارد ان مہمانوں کی کثرت، اور دسترخوان کی وسعت دیکھتا تو وہ یہ سمجھتا کہ آج کوئی نئی بات ہے، اور کوئی عظیم تقریب، یا غیر معمولی مہمانداری ہے، حالانکہ یہ روزمرّہ کا واقعہ تھا، اور اس میں کسی دن

کوئی خصوصیت نہیں تھی۔

تیسرا حج

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، شیخ کو سفر سے طبعی عدم مناسبت، بلکہ ایک طرح کی وحشت تھی، ان کے لئے دہلی جانا تو بڑی چیز ہے، رائے پور اور دیوبند تک جانا بھی مجاہدۂ عظیم تھا، بارہا ایسا ہوا ہے کہ سفر کے ارادہ سے ان کو خفیفتاً بخار آگیا، اور واپسی پر تو اکثر کئی کئی دن تک صحت اور اعصاب پر اثر رہا، ایسی حالت میں حج کا سفر خواہ کتنی ہی سہولت و اہتمام کے ساتھ ہو، ان کے لئے ایک بڑا امتحان اور ایک شدید مجاہدہ تھا، ایسا اندازہ ہوتا تھا کہ شاید ۷۴ھ کا حج آخری حج ثابت ہوگا، لیکن دفعتاً غیب سے ایک سامان پیدا ہوا، حضرت مولانا محمد یوسف صاحب نے (جن کی ہستی اب ان کے لئے عزیز ترین ہستی، اور جن کا ایماء اور خواہش ان کے لئے سب سے زیادہ قابلِ لحاظ اور قابلِ رعایت تھی) ۸۳ھ (۶۴ء) میں رفقاء اور خدام کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ حج کا عزم فرمایا، اور شیخ سے محبت و رفاقت کی درخواست کی، یہ درخواست ایسے جزم و اصرار، اور ایسی محبت و خلوص سے تھی کہ شیخ کے لئے معذرت و انکار ممکن نہیں رہا، قابلِ فخر اور سرمایۂ ناز بھائی کا پُر محبت اصرار، دیارِ حبیب کی حاضری، حج و زیارت کی سعادت، جس کے شوق اور عشق کی چنگاریاں ہمیشہ سینے میں دبی اور سلگتی رہیں، بقول شاعر۔ ؏

اک ڈھیر ہے یاں راکھ کا اور آگ دبی ہے

آپ نے رفاقت منظور کرلی، اور بجلی کی طرح یہ خبر سارے ہندوستان اور پاکستان میں پھیل گئی کہ مولانا محمد یوسف صاحب کے ساتھ شیخ بھی حج کو جارہے ہیں، ہر طرف سے شمع حرم کے

پروانوں کا ہجوم ہوا، اور شیخ سے جو لوگ ارادت اور عقیدت کا تعلق، اور تبلیغی جماعت سے محبت ورفاقت کا رشتہ رکھتے تھے، ان کی بڑی تعداد اس زریں موقعہ سے فائدہ اٹھانے کے لئے تیار ہوگئی، یہ ایک تاریخی سفر تھا جس کی تفصیل آپ بیتی نمبر۴ میں دیکھی جاسکتی ہے[1] اس سفر میں حضرت شیخ مولانا محمد یوسف صاحب کے ساتھ طائف بھی گئے، ذی قعدہ ۱۳۸۳ھ کو سہارنپور سے روانگی ہوئی، چار ماہ کے عرصہ میں پاکستان ہوتے ہوئے وسط ربیع الاول میں سہارنپور واپسی ہوئی، واپسی کے سفر میں کراچی، لاہور، سرگودھا، اور ڈھڈھیاں ایک ایک دو دو دن ٹھہرنا ہوا، پاکستان کے مہجور و محروم عقیدت مندوں نے جو سالہا سال زیارت کو ترس رہے تھے، اس موقعہ کو نعمت خداداد تصور کیا، شیخ کا مستقل سفر پاکستان کا نہایت دشوار اور بعید از قیاس تھا، سفر حج کی برکت سے ان دور افتادہ خدام ومحبین کی قسمت جاگ اٹھی، انھوں نے پروانوں کی طرح ہجوم کیا، ایک طرف مولانا محمد یوسف صاحب کی کشش، دوسری طرف اس نعمت غیر مترقبہ سے فائدہ اٹھانے کا شوق سیکڑوں ہزاروں آدمیوں کو درمیانی اسٹیشنوں پر کھینچ کھینچ کر لاتا، ایرکنڈیشنڈ گاڑی میں ہونے کے باوجود ساری رات جاگ کر سراپا اشتیاق محبین کو مصافحہ وملاقات کا موقعہ دیتے، اور گرمی ولو کی پرواہ نہ کرتے۔

شیخ کو ڈھڈیاں جاکر حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کی قبر پر فاتحہ پڑھنے اور کچھ وقت وہاں گزارنے کا بڑا شوق تھا، اور جیسا کہ بعض خاص مجلسوں میں فرمایا کہ پاکستان کا سفر ہی خاص اسی شوق میں کیا گیا تھا، سرگودھا پہونچے تو سخت گرمی تھی، دونوں طرف برف کی سلیں رکھی جاتیں، اور پنکھا چلتا رہتا، خدام نے ڈھڈیاں کا پروگرام ملتوی کرنے کی بار بار درخواست کی کہ وہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، نہ وہاں بجلی ہے نہ برف کا انتظام ہوسکتا ہے،

---

[1] آپ بیتی ۴/۲۵۸-۲۶۸

لیکن شیخ نے کسی طرح اس کو منظور نہیں کیا، خدا کی قدرت کہ وہاں پہونچتے ہی موسم ایسا تبدیل ہوا کہ کسی چیز کی ضرورت پیش نہ آئی، بلکہ رات کو کپڑا اوڑھنے کی ضرورت پڑ گئی، جب تک قیام رہا ایسا ہی خنک و خوشگوار موسم رہا، فرماتے تھے کہ حضرت کو زندگی میں میرا قرآن مجید سننے کا بڑا شوق تھا لیکن اس کی نوبت نہ آئی، میں نے وہاں قبر مبارک کے پاس پورا قرآن مجید ختم کرنے کا اہتمام کیا، حسنِ اتفاق سے اس سفر کے سلسلہ میں شیخ کا ایک خط خاکسار راقم کے نام مرقعۂ خطوط میں محفوظ ہے، اس سے اس سفر کی مزید تفصیلات اور شیخ کے تاثرات اور جذبات کا علم ہوتا ہے، وہ ناظرین کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

ع این کہ می بینم بہ بیداری ست یارب یا بخواب

مکرم و محترم مولانا الحاج ابوالحسن علی میاں صاحب مدفیوضکم

بعد سلام مسنون کراچی بخیر رسی کا ایک مختصر کارڈ ۲۶ جون کو ارسال خدمت کر چکا ہوں، غالباً پہنچا ہوگا، آج کی ڈاک سے مکہ مکرمہ سے ایک پیکٹ وصول ہوا جس میں مولانا سلیم صاحب نے میرے اور مولانا یوسف صاحب کے نام کے خطوط جو بعد میں بھیجے تھے، یہاں بھیجے، ان میں جناب کا لفافہ مورخہ ۲۷ محرم الحرام الطاف اشفاق اور شفقتوں سے لبریز پہنچا، اللہ تعالیٰ جل شانہ اپنے فضل و کرم سے آپ کے اس حسن ظن اور محبتوں کو طرفین کے لئے دینی ترقیات کا ذریعہ بنائے۔

تین ۳ دن کراچی ٹھہرنے کے بعد دوشنبہ کو دوپہر کی ریل سے منگل کی صبح کو ۹ بجے لائل پور پہنچے، لوگوں نے راحت رسانی میں انتہا کر رکھی ہے، فرسٹ کلاس ایر کنڈیشنڈ ریزرو کرایا تھا لیکن وہ تو مجھے اور مولانا یوسف صاحب کو راس نہ آیا، اس لئے کہ کراچی سے لائل پور تک کوئی بھی چھوٹا بڑا اسٹیشن ایسا نہیں گذرا

اوپر نیچے سب بھرا ہوا تھا، عشاء کے وقت سے کھانا کھلانے کا جو سلسلہ شروع ہوا تو آخری قسط نے فجر کے وقت کھانا کھایا، تعداد سیکڑوں سے متجاوز تھی، صبح نماز فجر کے بعد ہوائی اڈے کے لئے رخصت ہوئے، بعض اسباب و قرائن کی بناء پر بہت سے خواص کو اندیشہ تھا کہ اب واپسی نہیں ہوگی، ہوائی اڈے پر بھی ایک بڑا مجمع رخصت کرنے کے لئے پہونچ گیا، بعض خدام نے ہندوستان کی خصوصیات اور مسلمانوں کے مخصوص حالات کی بناپر واپسی کی مخلصانہ درخواست اور اس کی تمنا کا اظہار کیا، نو بجے کے قریب وہاں سے بمبئی کے لئے پرواز ہوئی، ۲۱-۲۲ بمبئی قیام رہا، اس مرتبہ مدرسۂ رحمانیہ واقع مدنپورہ میں قیام تھا، ۲۳ کو براہ راست بمبئی سے جدہ کو پرواز ہوئی، اور اسی روز مع الخیر وہاں پہونچ گئے، سفیر ہند جناب مدحت کامل قدوائی صاحب نے جدہ کے ہوائی اڈہ پر استقبال کیا، اور اپنے ہی ساتھ اپنے مکان پر لے گئے، وہیں کھانا کھایا، وہاں سے تھوڑی دیر کے بعد مولوی محمد شمیم صاحب وغیرہ کی معیت میں مکۂ معظمہ حاضری دی، مکۂ معظمہ میں قیام حسب سابق مدرسہ صولتیہ میں تھا، وہاں کا نظام الاوقات ایک اہم مکتوب سے نقل کیا جاتا ہے:-

"اس سے پہلے سفر میں صحت بھی بہ نسبت پہلے کے اچھی تھی، اور مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وجہ سے موٹریں بھی ہر وقت کئی کئی موجود رہتی تھیں، اس لئے سابقہ سفر میں صبح کی نماز حرم شریف میں ہوتی تھی، اور اگر کسی دن تاخیر ہو جاتی تو نماز مدرسہ کی مسجد میں پڑھ کر مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ فوراً حرم جاتے، اس لئے کہ نماز کے بعد تین گھنٹے کی تقریر مولانا یوسف صاحبؒ کی ہی ہوتی تھی، شیخ الحدیث بھی ساتھ تشریف لے جاتے تھے، اور مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر بھی سنتے تھے، اس کے بعد قیام گاہ پر مولانا محمد یوسف صاحبؒ

کے ساتھ چائے کا وسیع دسترخوان لگتا تھا جس میں تقریبًا ایک گھنٹہ صرف ہوجاتا تھا، اور جملہ حاضرین پر چائے کے ساتھ ساتھ مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شدید گرفت بھی رہتی تھی۔

امسال صبح کی تقریر تقریبًا ڈھائی گھنٹے مولانا محمد عمر صاحب یا مولانا سعید خاں صاحب کی ہوتی ہے حضرت شیخ الحدیث اپنے امراض اور ضعف اور سواری کی عدم فراوانی کی وجہ سے مدرسہ کی مسجد میں نماز ادا فرماتے ہیں، اس کے بعد قیام گاہ پر ذاکرین کے ذکر کا سلسلہ بحمد اللہ زور و شور سے رہتا ہے، جس کی پہلے سفر میں نوبت نہ آسکی تھی، اس کے بعد ایک بجے (عربی وقت سے) حضرت شیخ الحدیث اپنی تنہا چائے نوش فرماتے ہیں، مولانا انعام الحسن صاحب، اور مولوی ہارون صاحب اس وقت تک اپنے کمرے میں آرام کرتے رہتے ہیں، اور اپنی چائے اپنے کمرے ہی میں پیتے ہیں، اس کے بعد وہ دونوں اور حرم کے اجتماع والے خواص مولانا محمد عمر وغیرہ حضرت شیخ الحدیث کے کمرے میں آجاتے ہیں اور تین ۳ بجے تک مختلف مسائل پر گفتگو رہتی ہے، تین ۳ بجے سے پانچ بجے تک حضرت شیخ نے مختلف احباب کی ملاقات کے لئے وقت رکھا ہے، اسی دوران میں مدرسہ کی مسجد میں خصوصی حجاج کے اجتماعات ہوتے ہیں، آج ہندوستان و پاکستان کے علماء کا اجتماع ہے، کل افغانیوں کا تھا، اس سے پہلے الجزائر وغیرہ کے مختلف اجتماعات ہوتے رہے ہیں، ان میں حضرت شیخ کی بھی شرکت تھوڑی دیر کے لئے ہوجاتی ہے، اور مولانا انعام الحسن صاحب بھی اس میں شریک ہوتے ہیں، اسی وقت ان حضرات کی اپنی تعلیم بھی مدرسہ کے دوسرے کمرے میں

ہوتی رہتی ہے۔

حضرت شیخ کی طبیعت پہلے سے بھی ناساز تھی، یہاں آکر کچھ حرارت کا سلسلہ بھی مسلسل سا ہوگیا، اور اس سے زیادہ پیشاب کا سلسلہ بھی بے قابو ہوگیا، شاید اس میں زمزم کو بھی دخل ہو، اس لئے کہ یہاں آنے کے بعد اس وقت تک زمزم کے علاوہ دوسرا پانی بجز اس کے کہ جو برف میں ملا ہوا ہوتا ہے، نوبت نہیں آئی، ظہر کی نماز ساڑھے چھ بجے[لہ] ہوتی ہے، ظہر سے متصل کھانے سے فراغت کے بعد عصر تک قیلولہ ہوتا، عموماً کھانے میں ایک گھنٹہ لگ جاتا، لیکن دعوت کے دن جو اکثر ہوتی رہتی ہے، قیلولہ میں ہی دیر ہوجاتی ہے، اگرچہ کھانے کے لئے کہیں جانا نہیں پڑتا، دعوت اپنے مستقر پر ہی ہوتی ہے، عصر ساڑھے نو بجے عموماً ہوتی ہے، اس کے بعد حضرت شیخ نے قہوہ شروع کردیا تھا، جو اچھا معلوم ہوتا، مگر اس سے نیند پر اثر پڑنے لگا، اس لئے بجائے اس کے سبز چائے شروع کردی، اس دوران میں احباب بھی آتے رہتے ہیں، ۱۱ بجے سے حرم کی تیاری کے بعد ساڑھے گیارہ بجے سے ڈھائی بجے تک حرم میں سب کا قیام رہتا، اس دوران میں ان حضرات کے یہاں خصوصی ملاقاتیں، عمومی اجتماعات، اردو کے مختلف حلقے اور عربی کے مختلف حلقے ہوتے رہتے ہیں، دوسری زبانوں کے حلقے افغانی، ترکی، انگریزی وغیرہ میں ہوتے رہتے ہیں، حضرت شیخ الحدیث پیشاب کی کثرت کی بنا پر ایک گوشہ میں تشریف فرما ہوتے ہیں، ڈھائی بجے واپسی کے بعد تمام حضرات کھانا کھاتے ہیں، اور حضرت شیخ کچھ میوے تناول فرماتے ہیں، ۴ بجے حضرت شیخ

لہ اس سے مراد غروبی وقت ہے جو حجاز میں (نماز وغیرہ کے سلسلہ میں) اب بھی رائج و متعارف ہے۔

مخصوص حضرات کے ساتھ حرم میں دوبارہ حاضر ہوتے ہیں، اور گاڑی پر بہت معذوری کی وجہ سے تین چار طواف کرتے ہیں، چھ بجے حرم سے واپسی پر حضرت شیخ آرام فرماتے ہیں، اور دس بجے تہجد کی اذان، اور ۱۱ بجے کے قریب صبح کی نماز ادا ہوتی ہے۔"

حج سے فارغ ہو کر اور مکۂ معظمہ میں معتد بہ قیام کر کے مدینہ طیبہ روانگی ہوئی، وہاں سے ۲۲ راپریل کو مکۂ معظمہ آمد ہوئی، دو دن وہاں قیام کے بعد جدہ، اور ۲۶ کو جدہ سے کراچی، وہاں سے ۲۸ کو دہلی روانگی ہو گئی، وہاں حسب توقع استقبال کرنے والوں کا ہجوم تھا، جمعہ اور سنیچر دہلی قیام کر کے یکشنبہ ۳۰ راپریل کو دس بجے کے قریب سہارنپور تشریف لے آئے، کچے گھر میں وضو فرما کر مسجد تشریف لے گئے، اور دوگانہ ادا فرمانے کے بعد مجمع سے مصافحہ فرمایا، ۱۰-۱۵ اقرباء اور خواص کسی سے بھی نماز سے قبل مصافحہ نہیں کیا، اسی وقت بعد نماز عصر دعا کا اعلان ہوا، چنانچہ دار الطلبہ جدید کی مسجد میں مولانا انعام الحسن صاحب نے دعا کرائی، جس میں شہر اور مضافات کے لوگوں نے شرکت کی، دوشنبہ کو صبح چائے کے بعد ہر دو حضرات مع بعض حضرات گنگوہ تشریف لے گئے، اور کھانے کے وقت تک لوٹ آئے، ظہر کے بعد مولانا انعام الحسن صاحب تو نظام الدین واپس گئے، اور حضرت شیخ نے بخاری شریف کا درس شروع کرا دیا۔

شیخ کے معمولات و نظام الاوقات

شیخ کی زندگی اپنے علمی انہماک، خدمت خلق، یکسوئی، اور شدید مصروفیت کے

اعتبار سے اس بیسویں صدی میں ان علمائے سلف کی زندہ یادگار تھی، جن کا ایک ایک لمحہ عبادت و خدمت اور علم کی نشر و اشاعت کے لئے وقف تھا، اور جن کے کارنامے دیکھ کر ان کے اوقات کی برکت، ان کی جفاکشی، اور بلند ہمتی، اور ان کی جامعیت کے سامنے آدمی تصویر حیرت بن کر رہ جاتا ہے، اور ان کی روحانیت اور تائید الٰہی کے سوا اس کی کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی۔

فجر کی نماز کے کچھ دیر بعد[1] کچے گھر میں[2] تشریف لے آتے، اور ایک بڑی جماعت کے ساتھ چائے نوش فرماتے، جن کی تعداد پچاس، ساٹھ سے شاید کبھی کم ہوتی ہو، بعض دنوں میں اس سے بہت بڑھ جاتی، کچھ لوگوں کے لئے ناشتہ کا بھی انتظام ہوتا، لیکن اس وقت شیخ کا معمول صرف چائے پینے کا تھا، اگر کوئی ایسا عزیز اور اہم مہمان ہوتا، یا تھوڑے وقت کے لئے سہارنپور آیا ہوتا، یا اس سے کوئی ضروری باتیں کرنی ہوتیں تو تخلیہ کر لیا جاتا، اور کچھ دیر وہیں تشریف رکھتے، پھر بالاخانہ پر اپنے علمی و تصنیفی معمولات پورا کرنے کے لئے تشریف لے جاتے، جاڑے، گرمی، برسات، حوادث، تحریکات اور کسی بڑے سے بڑے معزز مہمان کی آمد کے موقعہ پر بھی اس میں کمتر فرق واقع ہوتا، بعض مرتبہ فرمایا کہ حضرت رائے پوری، یا ایسے اکابر و مشائخ کی تشریف آوری کے موقعہ پر میں نے احتراماً اپنا یہ معمول ترک کر دینا چاہا تو سر میں درد ہو گیا، اجازت لے کر تھوڑی دیر کے لئے گیا، اور تھوڑا سا کام کر کے واپس آ گیا، اکثر یہ حضرات خود ہی باصرار شیخ کو رخصت فرما دیتے،

---

[1] اس وقفہ میں اب روز بروز طول ہوتا جا رہا تھا، پہلے فجر کی نماز کے کچھ ہی دیر بعد تشریف لے آتے تھے، اس کے بعد دیر تک تلاوت و وظائف میں مشغول رہنے لگے تھے، سوائے خاص مواقع کے کہ کوئی عزیز مہمان آیا ہوا ہو۔ [2] شیخ کا مکان اسی نام سے مشہور ہے۔

اور حرج گوارہ نہ فرماتے، اوپر کی نشست گاہ دیدنی تھی نہ کہ شنیدنی، ایک چھوٹا کمرہ جس میں کتابوں کا اس طرح ذخیرہ تھا، گویا در و دیوار اسی کے ہیں، ان کتابوں کے درمیان "پناہ" لیتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی پرندہ جو دن بھر غیر جنس میں رہا ہے، ابھی اپنے آشیانہ میں واپس آگیا ہے، اس وقت ان کا وہی حال ہوتا جس کی تصویر خواجہ میر درد نے اس شعر میں کھینچی ہے ؎

جا بیٹھئے کس واسطے اے درد میخانہ کے بیچ
کچھ عجب مستی ہے اپنے دل کے پیمانہ کے بیچ

اگر کسی کو اس وقت کوئی ضروری بات کہنے کے لئے، یا کسی عزیز مہمان کو ملنے کے لئے جانا پڑتا تو اس کو بہ مشکل بیٹھنے کی جگہ ملتی، چاروں طرف کتابوں کا ڈھیر، ایک آدھ چمڑہ یا چٹائی کا فرش، کچھ پرانی شیشیاں، اور دواؤں کی بوتلیں، گرد جس میں معلوم نہیں کتنے علم کے جواہر، اور اخلاص کی تب و تاب ہوتی ہے، ساڑھے گیارہ بجے تک شیخ پوری یکسوئی کے ساتھ وہاں کام کرتے رہتے، اور ان کا جی چاہتا کہ سوائے نہایت ضروری اور فوری کاموں کے خلل واقع نہ ہو، ان اوقات میں ان خاص مہمانوں، اور ذکر و شغل کرنے والے عزیزوں کو اجازت ہوتی کہ صحن میں بیٹھ کر ذکر جہر کرتے رہیں، وہ کام میں مشغول رہیں، اس سے شیخ کی یکسوئی میں کوئی فرق واقع نہ ہوتا۔

ساڑھے گیارہ بجے تشریف لے آتے، دستر خوان بچھتا، مہمانوں کی جماعت کثیر شریک طعام ہوتی، عام طور پر دو اور تین مرتبہ مجمع بیٹھتا، شیخ کی اصطلاح میں اس کو پہلی پیڑھی اور دوسری پیڑھی کہتے ہیں، شیخ اول سے آخر تک کھانے میں شریک رہتے، اپنے کھانے کی رفتار اور مقدار ایسی رکھتے کہ آخری کھانے والے کا ساتھ دے سکیں، کھانے میں بالعموم

تنوع ہوتا، متعدد قسم کے سالن وافر مقدار میں ہوتے، اور بڑے اصرار سے مہمانوں کو کھلایا جاتا، یہاں تک کہ نووارد اور ناتجربہ کار بعض اوقات اس اصرار سے اپنے معمول سے زیادہ کھا کر تکلیف بھی اٹھاتے، لیکن غور سے دیکھنے والا معلوم کر لیتا کہ شیخ برائے نام شریک ہیں، ان کی خوراک اتنی کم ہوتی کہ اس مقدار کے ساتھ اتنی محنت پر تعجب ہوتا، لیکن دسترخوان پر ایسا سماں باندھتے کہ کسی کو پتہ نہ چلنے پاتا کہ کریم النفس اور فراخ دل میزبان خود کس قدر اس کھانے میں شریک ہے۔

کھانے سے پہلے ڈاک آجاتی جس پر ایک سرسری نظر ڈال لیتے، اس ڈاک کی مقدار روز بروز بڑھتی جارہی تھی، حجاز روانگی سے قبل کے زمانہ میں ۳۰۔۴۰ کے درمیان روزانہ خطوط کا اوسط تھا، بعد میں ۵۰۔۶۰ تک پہونچ گیا۔

کھانے کے بعد شیخ آرام کرنے لئے مضطر ہوتے ساڑھے بارہ، ایک اس میں ضرور بج جاتا، یہی وقت ان کے آرام کا ہوتا، ظہر کے بعد ایک گھنٹہ وہ ڈاک اور اسی درمیان میں کسی عزیز مہمان سے گفتگو کی نذر کرتے، گھنٹہ ختم ہونے کے بعد حدیث کے درس کے لئے تشریف لے جاتے، پہلے یہ درس دار الطلبہ کے دار الحدیث میں ہوتا تھا، جو بالائی منزل پر ہے، پھر چڑھنے بلکہ چلنے تک کی معذوری کی بنا پر دار الطلبہ کی مسجد میں ہونے لگا، مولانا حافظ عبد اللطیف صاحب کی وفات کے بعد سے بخاری شریف آپ ہی پڑھاتے تھے، اس درس کی کیفیت دیدنی تھی نہ کہ شنیدنی، حدیث کے احترام، سنت کے شغف، اور ذات نبوی سے عشق کی کیفیت کا اثر تمام حاضرین پر پڑتا، اور بعض مرتبہ تو ساری مجلس پر ایک بجلی سی کوند جاتی، خصوصاً ختم کتاب اور دعا کے موقعہ پر تو یہ پیمانہ ہزار وسعت وعالی ظرفی کے باوجود چھلک پڑتا، اسی طرح وفات نبویؐ کی احادیث پر دامن ضبط

ہاتھ سے چھوٹ جانا، آنکھیں بے اختیار اشکبار اور آواز گلوگیر ہو جاتی۔

عصر کی نماز کے بعد مکان پر عام مجلس ہوتی، سارا صحن زائرین اور حاضرین سے بھرا ہوتا، ان میں مدرسہ کے طلبہ اور بعض اساتذہ بھی ہوتے اور مدرسہ کے مہمان بھی، چائے کا اس وقت بھی دور چلتا، تعویذ لکھنے کا اسی وقت معمول تھا، مغرب کی نماز کے بعد دیر تک مسجد ہی میں رہتے، اگر کوئی خاص مہمان یا عزیز آئے ہوئے ہوتے تو ان کو خصوصی طور پر وقت دے دیتے، عشاء کی نماز سے پہلے دستر خوان پھر بچھ جاتا، لیکن شیخ کا عرصہ سے رات کو کھانے کا معمول نہیں رہا تھا، کوئی خاص عزیز مہمان ہوئے تو ان کی خاطر دو چار لقمے تناول فرما لیتے، عشاء کے بعد پھر کچھ دیر مخصوص و محدود مجلس رہتی جس میں زیادہ تر بے تکلف اور ہر وقت کے حاضر باش خدام یا عزیز مہمان ہوتے پھر آرام فرماتے۔

جمعہ کے دن نماز جمعہ سے پہلے مختلف دیہاتوں اور اطراف و مواضعات سے آنے والے اہلِ تعلق و ارادت کو مجلس میں شرکت کی اجازت ہوتی، ———— اسی موقعہ پر نئے طالبین کو بیعت بھی فرماتے، اور ذکر و اصلاحِ حال کی تلقین بھی، یہ تعداد یوماً فیوماً ایسی بڑھ رہی تھی کہ سارا صحن اور اندر باہر سب بھر جاتا، پھر جمعہ کی تیاری ہوتی، جمعہ اب حکیم ایوب صاحب کی چھوٹی مسجد میں جو قریب ترین مسجد ہے ادا فرماتے، کھانا معمولاً و التزاماً جمعہ کے بعد ہوتا، عصر کی مجلس عام جمعہ کے دن ملتوی رہتی، شیخ کا برسوں سے جمعہ کے دن مابین عصر و مغرب دعا میں مشغول اور متوجہ الی اللہ رہنے کا معمول تھا، فرماتے تھے کہ والد صاحب کا بھی یہی معمول تھا، چائے بھی اس روز مغرب کے بعد ہوتی۔

شیخ کا ان سب علمی و تحقیقی، اور دینی و روحانی مشاغل و معمولات کے علاوہ

(جن کی موجودگی میں فرصت عنقا معلوم ہوتی) ایک قدیم معمول اہم واقعات وحوادث، وفیات اور اپنے بزرگوں، احباب اور مخصوص خدام کی آمد ورفت، دور وسیر، نقل وحرکت کے قلم بند کرنے کا بھی تھا جس کی حیثیت ایک مکمل ومفصل روزنامچہ کی سی ہے، اس روزنامچہ میں قمری وشمسی، سنہ ومہینہ اور تاریخ کی قید کے ساتھ گردوپیش کے اہم واقعات درج ہیں، اسی کی مدد سے حضرت مولانا محمد الیاسؒ، حضرت رائے پوریؒ، اور سب سے بڑھ کر مولانا محمد یوسف صاحب کی سوانح مرتب ہوسکی، مولانا مدنیؒ سے متعلق بھی اس میں بہت معلومات واندراجات ہیں، ان بزرگوں کے علاوہ بہت سے خدام اور اہل تعلق کے آنے جانے اور ان کے تعلق رکھنے والے واقعات کی تفصیل ملے گی، یہ ایک طرح کا "جام جہاں نما" ہے، جس میں ہندوستان، ہندوستان سے باہر کے بھی بہت سے واقعات اور شخصیات کی سوانح وسنین اور تاریخیں ہیں، حیرت ہوتی ہے کہ شیخ کو اتنی شدید مصروفیت میں اس کے لئے وقت کیسے مل جاتا تھا۔

اخبارات کے مطالعہ کا ہمیشہ معمول رہا، بڑے اہتمام سے روزانہ کے اہم اخبارات محفوظ رکھے جاتے، اور شیخ ان کو فرصت سے مطالعہ فرماتے، دنیا کے حالات اور جماعتوں کے مزاج واشتغال سے باخبری کا ہمیشہ ذوق رہا لیکن جب سے نزول الماء کی شکایت ہوئی۔ اور آتشیں شیشہ کی مدد کے بغیر وہ مطالعہ نہیں کر سکتے تھے، اخبارات کے مطالعہ کا معمول تقریباً چھوٹ گیا، کبھی کوئی اہم مضمون ہوتا، تو اس کو پڑھوا کر سن لیتے لیکن باخبری اور بیدار مغزی میں اب بھی کوئی فرق نہیں تھا۔

نزول الماء کی شکایت اور علی گڑھ کا قیام

آنکھ میں نزولِ آب کا سلسلہ دسمبر ۱۹۶۰ء سے شروع ہوا تھا، مشغولیت اور آنکھ کے

پختہ نہ ہونے کی وجہ سے آپریشن کا معاملہ ٹلتا رہا، ۸ رمارچ ۱۹۷۰ء (۲۹ رذی الحجہ ۱۳۸۹ھ) کو علی گڑھ کے مخلصین (جن میں حاجی عظیم اللہ صاحب و حاجی نصیر الدین صاحب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں) اور احباب و خدام کے اصرار پر پہلی مرتبہ علی گڑھ کے مشہور آنکھ کے اسپتال گاندھی آئی ہاسپٹل میں داخلہ ہوا، ۱۴ رمارچ ۷۰ء کو دائیں آنکھ کا آپریشن اسپتال کے مشہور سرجن اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پروفیسر امراض چشم ڈاکٹر نشکلا نے کامیاب طریقہ پر کیا، شیخ بغیر علمی مشغولیت اور افادہ و ارشاد کے رہ نہیں سکتے، پڑھنے لکھنے کا کوئی سوال نہ تھا، جب بولنے کی اجازت ہوئی تو اپنی زندگی کے سبق آموز حالات، اپنے اساتذہ و مشائخ کے کمالات اور طرز زندگی، اخلاص و ایثار کے واقعات خدام کو سناتے جس کے قلم بند کرنے کا انھوں نے سلسلہ شروع کر دیا، اس سے "آپ بیتی" کا وہ مفید سلسلہ شروع ہوا، جو بالآخر سات حصوں میں مکمل ہوا، اور جو دورِ ماضی کی ایک بولتی ہوئی تصویر اور جیتا جاگتا مرقع بن گیا، جو علماء و اساتذۂ مدارس، اور "تازہ واردانِ بساطِ علم" کے لئے خاص طور پر چشم کشا، اور بصیرت افروز ہے۔

اس اسپتال میں دوبارہ داخلہ ۲۲ راگست ۱۹۷۰ء (۱۰ رجمادی الثانیہ ۱۳۹۰ھ) میں ہوا، اس مرتبہ ۱۸ روز (۲۲ راگست - ۱۲ رستمبر) قیام رہا، یہاں بھی افادہ و ارشاد کا سلسلہ جاری رہا، ڈاک اس پر مستزاد تھی، صرف ایک دن کی ڈاک میں باون ۵۲ خطوط ہندوستان، پاکستان، حرمین شریفین، لندن و افریقہ کے تھے[1]۔

دو برس کے بعد دوسری آنکھ بنوانے پر اصرار شروع ہو گیا، ۲۴ راپریل ۱۹۷۲ء کو مدینہ طیبہ کے اسپتال میں لاہور کے مشہور آئی سرجن ڈاکٹر منیر الحق صاحب نے بائیں آنکھ کا آپریشن کیا،

---

[1] آپ بیتی ۳ اختصاراً

۲۸/اپریل کی صبح کو اسپتال سے مدرسہ علوم شرعیہ واپسی ہوئی، جہاں قیام تھا۔[1]

تدریس سے معذوری

شوال ۱۳۴۱ھ (۱۹۲۳ء) سے کتب حدیث کی تدریس کا سلسلہ شروع ہوا تھا، جو ۱۳۸۸ھ (۱۹۶۸ء بمطابق ۱۹۶۹ء) تک جاری رہا، اس کے بعد نزول الماء کی وجہ سے تدریس کا سلسلہ چھوٹ گیا، لیکن تالیف کا سلسلہ جاری رہا۔[2]

تدریس کا سلسلہ اگرچہ ۱۳۸۸ھ سے معذوری کی بنا پر موقوف ہوگیا،[3] لیکن مسلسلات کی اجازت دینے کا سلسلہ سہارنپور کے قیام کے آخر تک جاری رہا، ۲۳ رجب ۱۳۹۰ھ کو مسلسلات کے موقعہ پر تقریباً ڈیڑھ ہزار کا مجمع ہوگیا تھا جس میں اکابر و خواص بھی بہت جمع ہوگئے تھے۔[4]

---

[1] آپ بیتی ۷ ص ۹۲ [2] ایضاً ص ۱ [3] ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"علی میاں! بہت ہی امراض کا شکار ہوں، لیکن تمام تکالیف کے اندر آرام و راحت ہے البتہ آنکھوں کی تکلیف سے تکلیف ہے اس وجہ سے کہ علمی کاموں سے معذوری ہوگئی، باوجود شدید اصرار کے مدرسہ والوں نے بخاری نہیں بدلی، ابھی تک حافظ جی بن کر پڑھا رہا ہوں۔" (۳ ذی الحجہ ۱۳۸۷ھ)

[4] اللہ تعالیٰ کا حضرت شیخ کے ساتھ یہ بھی خاص معاملہ تھا کہ انھوں نے اپنی زندگی ہی میں اور اپنی نگرانی میں اپنے خصوصی فن حدیث میں کچھ شاگردوں کو تیار فرما دیا تھا، ان میں مولانا محمد یونس صاحب جونپوری و مولوی محمد عاقل صاحب سہارنپوری خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اول الذکر کو شیخ نے اپنے سہارنپور کے قیام ہی کے دوران تدریس حدیث کی سند پر بٹھا دیا، اور انھوں نے ۲۵ شوال ۱۳۸۸ھ سے بخاری کا درس شروع کیا، افتتاح حضرت شیخ نے کرایا، مولوی عاقل صاحب کو بھی شیخ نے اپنے تحریری و تحقیقی کاموں میں شریک کرکے (باقی ص ۱۰۸ پر)

پانچواں اور چھٹا سفرِ حجاز

۱۳۸۶ھ (۱۹۶۷ء) کے بعد جب شیخ نے حجاز میں کام کرنے والوں کے تقاضے اور مولانا انعام الحسن صاحب کی خواہش پر حجاز کا سفر اختیار فرمایا، اور حج کے بعد ہندوستان واپسی ہوئی، دو سال کے بعد صفر ۱۳۸۹ھ (اپریل ۱۹۶۹ء) کو دوبارہ عازمِ حجاز ہوئے اس سفر میں توقع تھی کہ حاجی محمد شفیع صاحب پیکارڈ واچ کمپنی والے ساتھ ہوں گے لیکن وہ اپنے ایک مقدمہ کی تاریخ کی وجہ سے ساتھ نہ جا سکے، حضرت شیخ نے اس ناچیز سے جو رابطہ اور جامعہ اسلامیہ کے جلسوں کے سلسلہ میں ہر سال ایک دوبار حاضر ہوا کرتا تھا، دریافت فرمایا کہ کیا اس سفر میں رفاقت ممکن ہے؟ میں نے عرض کیا کہ ابھی تک وہاں کے سفر کی کوئی تقریب پیدا نہیں ہوئی، نہ ان دنوں رابطہ کا کوئی جلسہ ہے، نہ جامعہ اسلامیہ کا، شیخ خاموش ہو گئے لیکن جب میں رخصت ہو کر لکھنؤ آیا تو یہاں جامعہ اسلامیہ کے وائس چانسلر صاحب کا خط رکھا ہوا ملا کہ جامعہ کی مجلس استشاری کا ایک غیر معمولی جلسہ بلانے کے لئے رئیس الجامعہ (امیر فہد) کا

(باقی ص۱۰۷ کا) حدیث میں تیار کر دیا، اور وہ پرانے اساتذہ کی جگہ لینے کے قابل ہو گئے۔

ان دونوں فاضلوں کے علاوہ شیخ کے تلامذۂ حدیث ہندوستان و پاکستان میں پھیلے ہوئے ہیں اور وہ اپنی اپنی جگہ حدیث کی خدمت انجام دے رہے ہیں، ان میں مولانا عبد الجبار صاحب اعظمی مولانا منور حسین صاحب، مولانا اظہار الحسن صاحب کاندھلوی، مولانا عبد الحلیم صاحب جونپوری وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

انھیں میں عزیز گرامی مولوی تقی الدین ندوی مظاہری بھی ہیں جو ابوظبی کے رئاسۃ القضاء میں مستشار علمی تھے اور اب جامعۃ العین میں حدیث کے استاد اعلیٰ ہیں، حال میں انھوں نے امام بیہقی کی کتاب "الزہد" پر تحقیق کی ہے اور اس کو ایڈٹ کر کے قاہرہ سے شائع کیا جس پر ان کو جامع ازہر سے ڈاکٹریٹ (دکتوراۃ) کی ڈگری

ایماء ہوا ہے، اس لئے اس کی دعوت دی جاتی ہے، میں نے شیخ کو اس غلیبی انتظام کی اطلاع دی جس سے ان کو قدرتاً مسرت ہوئی، اور میں عزیز گرامی مولوی معین اللہ ندوی اور مولوی سعید الرحمٰن ندوی کی معیت میں دہلی سے ساتھ ہو گیا، ۸ر صفر ۱۳۸۹ھ (۲۶ر اپریل ۱۹۶۹ء) یوم شنبہ کو دہلی سے ہوائی جہاز سے ممبئی روانگی ہوئی، الحاج ابو الحسن شیخ کی ہمرکابی میں تھے، راستہ میں مسافروں کی مٹھائی سے جو تواضع کی جاتی ہے، میں نے اس میں سے کچھ شیخ کی خدمت میں پیش کیا تو فرمایا کہ مولوی صاحب میں روزہ ہوں، معلوم ہوا کہ یہ شکرانہ اور مسرت کا روزہ ہے، اور شیخ نے جیسا کہ "آپ بیتی" سے معلوم ہوا، یہ سفر روزہ اور وضو کی حالت میں مکمل کرنے کا عزم فرمایا ہے، جو پورا ہوا۔

۲۹ر اپریل سہ شنبہ ممبئی سے کراچی روانگی ہوئی، کراچی کے ہوائی اڈہ پر بہت بڑا مجمع تھا، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی بھی تشریف فرما تھے، ظہر کی نماز اور رخصتی دعا ہوئی، پھر جدّہ کے لئے کوچ ہوا، اس سفر میں شیخ نے بقول خود "صیام شہرین متتابعین توبۃ من اللہ" کی نیت کر لی تھی، اور احباب و اکابر کے شدید اصرار کے باوجود خیبر کے سفر تک اس کا سلسلہ رہا۔

مدینہ طیبہ کی اس قیام میں (جس میں شیخ نے مسلسل دو مہینوں کے روزے کی نیت کی تھی) معمول یہ تھا کہ مغرب سے پہلے باب جبریل سے داخل ہو کر مواجہ شریف کی طرف جاتے ہوئے، دائیں جانب کو جو مسلسل دیوار ہے، وہاں اقدام عالیہ کے رُخ پر دیوار سے لگ کر بیٹھ جاتے، اور سوائے نمازوں کے مراقب رہتے، اسی میں افطار کا وقت ہو جاتا، تو زمزم کا ایک گلاس نوش فرما لیتے، پھر مسلسل عشاء تک کچھ کھائے پیئے بغیر مراقب رہتے، اس حالت میں کسی کی طرف توجہ کرنا یا بات کرنا بہت گراں ہوتا، عشاء کی

نماز سے فارغ ہو کر باہر نکلتے، موٹر تیار ملتی، موٹر پر بیٹھتے ہوئے، پھر ایک گلاس شربت کا یا پانی کا نوش فرماتے یہ ناچیز ساتھ ہی ہوتا تھا مسجد نور پہونچ کر، جہاں قیام تھا، دستر خوان بچھتا، وہاں کھانا نوش فرماتے، حیرت ہوتی تھی کہ مسلسل تین چار گھنٹے کس طرح مؤدب و مراقب گذارتے، جبکہ جلد جلد پیشاب لگنے کا بھی عارضہ تھا، کھانا جو افطار کے قائم مقام تھا، وہ بھی بہت تاخیر سے ہوتا، اندرونی جذبہ، قوت باطنی، اور تعلق روحانی کے سوا کسی چیز سے اس کی توجیہ نہیں کی جاسکتی۔

شب کے دستر خوان پر حضرت شیخ کی خواہش و کوشش ہوتی کہ وہی کھانے ہوں جو مدینہ کی پیداوار اور وہاں کی ترکاریوں اور سبزیوں سے تیار کئے گئے ہوں، باہر کی کسی چیز کا ہونا جو تکلفاً تیار کی گئی ہو ناگوار ہوتا کہ اس سرزمین کی ہر چیز ان کی نگاہ میں عزیز و لذیذ اور تبرک تھی " وللناس فی ما یعشقون مذاہب "

۸۹ھ کے سفر حجاز کے بعد شیخ کا چھٹا سفر حجاز ۱۵ ذی قعدہ سنہ ۹۰ھ (۱۳ جنوری ۷۱ء) کو سہارنپور سے ہوا، ۱۸ جنوری کو ۹ بجے دہلی سے روانگی ہوئی۔

اندرون ملک کے چند اہم اسفار

اوپر گذر چکا ہے کہ شیخ کو سفروں سے صرف عدم مناسبت ہی نہ تھی، بلکہ ایک طرح سے وحشت و اضطراب ہوتا تھا، جو بچپن سے لے کر جوانی تک کی تربیت اور حالات کا نتیجہ تھا، اور شاید اللہ تعالیٰ کو ان سے تصنیف و تالیف اور ارشاد و تربیت کا جو کام لینا تھا، اس کی حکمت و مصلحت کا بھی تقاضا تھا کہ ان کو یکسوئی کے ساتھ کام کرنے کا زیادہ سے زیادہ موقع ملے، لیکن اس عزلت پسندی، یکسوئی

کے ساتھ جوان کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی، مولانا مدنیؒ، مولانا رائے پوری اور مولانا محمد یوسفؒ کے ساتھ ضلع سہارنپور، میرٹھ، مظفر نگر، مراد آباد، بریلی اور میوات کے چھوٹے چھوٹے سفران حضرات کی رفاقت، اہم مدارس کے جلسوں اور تبلیغی اجتماعات کی شرکت کے لئے وقتاً فوقتاً کرنے پڑتے تھے، ان سفروں کے علاوہ جن کی نوبت سال میں کئی کئی بار آجاتی تھی، اور جن کی تفصیل مشکل ہے، آپ نے بعض دور کے اضلاع کے سفر بھی فرمائے، جن میں تین سفر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ان سفروں میں ایک لکھنؤ کا سفر تھا، جو رجب ۶۲ھ (جولائی ۱۹۴۳ء) میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے ایماء پر جو لکھنؤ کی تبلیغی جماعت اور تبلیغی کام کے ذمہ داروں کی دعوت پر منظور کیا گیا تھا حضرت مولانا محمد الیاس صاحب ۱۸ر جولائی کو لکھنؤ تشریف لائے، دوسرے روز ۱۹ر جولائی کو شیخ کی سہارنپور سے براہ راست تشریف آوری ہوئی اس موقعہ پر مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا عبدالحق صاحب مدنی، مولانا احتشام الحسن صاحب، حافظ فخر الدین صاحب (خلیفۂ مجاز حضرت سہارنپوریؒ) اور تبلیغی جماعت کے متعدد عمائد و کارکنان موجود تھے، کئی روز لکھنؤ میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے مہمانخانہ میں قیام رہا، اور تبلیغی اجتماعات اور مجالس میں شرکت رہی۔

لکھنؤ کے قیام کے آخری ایام میں ایک روز کے لئے حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ ان کے ممتاز رفقاء اور خدام کی معیت میں حضرت سید احمد شہیدؒ کی بستی و مولد و منشاء دائرۂ حضرت شاہ علم اللہ حسنیؒ جو شہر میں تکیہ کلاں کے نام سے مشہور ہے تشریف لائے اور بہت مسرور و محظوظ ہوئے۔

دوسری مرتبہ حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ کی معیت میں رحیم آباد ضلع لکھنؤ

کے ایک اہم تبلیغی اجتماع میں جو ۳/۴/۵ رجمادی الثانیہ ۱۳۶۵ھ (۶/۷/۸ مئی ۱۹۴۶ء) کو موضع بانی نگر میں وہاں کے رئیس الحاج شیخ فیاض علی صاحب کی دعوت و تحریک پر منعقد ہو رہا تھا، رحیم آباد تشریف لائے، اس اجتماع میں سوائے حضرت مدنیؒ کے جو اس زمانہ میں الٰہ آباد کے نینی جیل میں اسیر فرنگ تھے، ملک کے ممتاز ترین علماء و مشاہیر شریک ہوئے، جن میں حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنوی، مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند، مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی، مولانا عبدالحق صاحب مدنی، مولانا عبدالحلیم صاحب صدیقی، مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ ناظم ندوۃ العلماء، مولانا شاہ حلیم عطا صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اس اجتماع کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ قیام و طعام میں کوئی تمیز و تفریق نہیں برتی گئی، عوام و خواص، علماء و مشائخ سب ایک جگہ ٹھہرے ایک طرح کا کھانا کھایا، تعلیم و تبلیغی گشت و اجتماع میں یکسانیت برتی گئی، اس سہ روزہ اجتماع میں جس میں مختلف الخیال لوگ جمع تھے، کسی کو شکایت کا موقعہ نہ ملا، حضرت شیخ اپنی یادداشت لکھتے ہوئے، خاص طور پر اس خصوصیت کو نوٹ فرماتے ہیں:۔

"اس اجتماع کی ایک بڑی خاص بات یہ تھی کہ مقامی مصلحت کی بنا پر کھانے میں کوئی تفریق نہیں کی گئی، سارے مجمع کو بلا تخصیص ایک ہی نان اور دال سے (دو وقتوں کے علاوہ) کبھی نان اور شوربا سے تواضع کی گئی۔"[1]

اودھ کے ان دو سفروں کے علاوہ آپ کا تیسرا سفر لکھنؤ اور رائے بریلی کا فروری ۱۹۴۷ء میں پیش آیا، اس سفر میں حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ، مولانا

[1] سوانح حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ کاندھلوی۔ باختصار ص ۳۶۰-۳۶۲

محمد یوسف صاحبؒ، پیر ہاشم جان (جو سندھ کے ایک مشہور بزرگ اور سلسلۂ مجددیہ کے شیخ تھے) الحاج سید محمد خلیل صاحب نہٹوری اور مولوی ظہیر الحسن صاحب کاندھلوی کی بیعت میں ہوا، حضرتِ شیخ مولانا رائے پوری اور بڑی جماعت کے ساتھ براہ کانپور لکھنؤ پہونچے، دو دن لکھنؤ قیام کرنے کے بعد ۸ ربیع الثانی ۱۳۶۶ھ (۳۰ فروری ۱۹۴۷ء) کو اس پورے قافلہ کا منتقل لاری کے ذریعہ رائے بریلی ورود ہوا، حضرت شاہ علم اللہؒ (جدّامجد حضرت سید احمد شہیدؒ) کی مسجد کے سامنے دریا کے دوسرے کنارے یہ مبارک قافلہ اترا، اور کشتی سے دریا عبور کر کے شاہ علم اللہ صاحبؒ کے دائرہ میں داخل ہوا، استقبال کے لئے بستی کے سارے حضرات، نیز اصحابِ شہر موجود تھے، ایک شب و روز قیام رہا، جو عجیب کیف و سرور کا تھا، راقم سطور جب صبح حضرت شیخ کو وضو کرانے لگا (اسی دن واپسی تھی) تو شیخ نے بھرّائی ہوئی آواز میں فرمایا کہ "مولوی صاحب یہاں سے جانے کے لئے دل بہت بُرا ہو رہا ہے"۔

حوادث و سوانح

شیخ کو پے در پے ایسے سنگین و جان گداز حوادث و سانحات پیش آئے، جو طبیعت کو مستقل طور پر پژمردہ اور افسردہ، پشت کو خم کر دینے، اور سینہ کو داغ داغ بنا دینے کے لئے کافی تھے، لیکن شیخ کا حال وہ تھا جس کی کسی عارف شاعر نے تصویر کھینچی ہے ؎

خوشا وقت شوریدگانِ غمش اگر ریش بینند دگر مرہمش
شراب محبت دما دم کشند اگر تلخ بینند دردم کشند

ان میں پہلا حادثہ شفیق و باکمال مربی، اور ولی نعمت باپ کی وفات کا حادثہ تھا، جو عین عنفوان شباب (۱۹ سال کی عمر) ۱۰ ذی قعدہ ۱۳۳۴ھ میں پیش آیا، اس حادثہ سے نہ صرف دل و دماغ مجروح ہوئے، بلکہ ذمہ داریوں کا ایک پہاڑ، اور قرض کا ایک بار سر پر آپڑا جس کی تفصیل پچھلے صفحات میں گذر چکی ہے، اس کے بعد تقریباً ایک ہی سال کے اندر ۲۵ رمضان المبارک (۱۳۳۵ھ) کی شب قدر میں شفیق والدہ کی رحلت کا حادثہ پیش آیا۔

پھر ماں باپ سے بڑھ کر شفیق و محبوب، شیخ و مربّی روحانی حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری نے ۱۵ ربیع الثانی ۱۳۴۶ھ کو ارتحال فرمایا، اس موقعہ پر شیخ کو کہنے کا حق تھا ؎

حال من در ہجر حضرت کمتر از یعقوب نیست　　او پسر گم کردہ بود و من پدر گم کردہ ام

۵ ذی الحجہ ۱۳۵۵ھ میں اہلیہ نے داغ مفارقت دیا، پھر ۲۱ رجب ۱۳۶۳ھ (۱۲ جولائی ۱۹۴۴ء) کو سراپا شفقت اور فخر روزگار عم نامدار حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی وفات کا سانحۂ عظیم پیش آیا، جس کی اہمیت و سنگینی، اور دور رس اثرات و نتائج، اور صرف خاندان والا نشان نہیں، بلکہ دین و ملت کے خسارۂ عظیم کا اندازہ کرنا مشکل نہیں، شیخ نے اس کو بھی اپنی ایمانی قوت، تعلق باللہ اور بے نظیر ہمت و استقامت سے ایسا برداشت کیا کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہو گئی، اور ان کو اپنے تاثر اور غم و اندوہ پر شرم آنے لگی، راقم سطور کو خوب یاد ہے کہ تدفین سے فارغ ہو کر وہ بنگلہ والی مسجد کی سوگوار اور دل فگار فضا میں ٹھہرنے کی تاب نہ لا سکا، اور اپنے چند دوستوں کے ساتھ ہمایوں کے مقبرہ کی طرف چلا گیا، نماز مغرب سے فارغ ہو کر تاخیر سے جب حاضر ہوا تو شیخ نے بڑی شفقت

کے ساتھ فرمایا کہ مولوی صاحب کہاں چلے گئے تھے؟ اتنے متاثر کیوں ہو؟ کیا تمہیں وہ حدیث یاد نہیں کہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس کو کوئی صدمہ پیش آئے وہ میری وفات کا صدمہ یاد کرے کہ امت کے لئے اس سے بڑا کوئی صدمہ نہیں ہو سکتا، اتنے میں دسترخوان بچھا، فرمایا، آؤ، پھر بڑی شفقت سے چیزیں پیش کرتے رہے، اور اصرار سے کھلاتے رہے۔

اس کے بعد ۲۹ ذی قعدہ ۸۴ھ (۲ اپریل ۶۵ء) میں قوت بازو اور قرۃ عین اور سرمایۂ صد فخر محب و محبوب بھائی مولانا محمد یوسف صاحب کی وفات کی ناگہانی خبر ملی، جو بجلی بن کر دل و دماغ پر گری، لیکن شیخ نے نہ صرف اس کو برداشت کیا اور "رضا بالقضاء" کا ثبوت دیا بلکہ "راضی برضا" ہونے کا ایسا منظر دیکھنے میں آیا جو صرف اولیائے متقدمین کے حالات میں ملتا ہے، بلکہ دوسروں کے لئے وجہ قوت و تسکین بن گئے، "آپ بیتی" میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"مورخہ ۲۹ ذی قعدہ ۸۴ھ مطابق (۲ اپریل ۶۵ء) بروز جمعہ عزیز مرحوم کی سہارنپور آنے کی اطلاع تھی، جمعہ کی صبح کو عزیز مرحوم کی بیماری کا تار آیا ...... مجھے بیماری کا یقین ذرا نہ آیا، میں جمعہ کی نماز کے بعد کھانا کھا کر سونے کے ارادہ سے لیٹا تھا کہ ۴ بجے کے قریب عزیز طلحہ نے آکر مجھے اٹھایا، اور کہا کہ صابری صاحب کا آدمی کھڑا ہے، لاہور سے فون آیا ہے کہ ماموں حضرت کا انتقال ہو گیا، موت کے لئے نہ کوئی وقت ہے، نہ اس میں کوئی استبعاد، میں اٹھ کر وضو کر کے مدرسہ کی مسجد میں جا بیٹھا اور نماز کی نیت باندھ لی، اس لئے کہ طلحہ کی اس روایت کے ساتھ ساتھ چاروں طرف سے ہجوم نے گھیرنا شروع کر دیا، اور مجھے ایسے وقت میں لغو باتیں" کہ کیا ہو گیا؟ کیا بیمار تھے؟ کب سے؟

کون خبر لایا؟" لغویات سے بہت ہی وحشت ہوا کرتی ہے کہ یہ اہم اور قیمتی وقت بہت ہی مبارک ہوتا ہے جس میں طبیعت منقطع عن الدنیا، متبتّل الی الآخرۃ ہوتی ہے، اس وقت کی تلاوت بھی قیمتی، ذکر و فکر بھی قیمتی، مجمع بڑھتا ہی چلا گیا، مسجد، مدرسہ، سڑک، سب بھر گیا، اور میں نے تکبیر تک سلام پھیر کر ہی نہ دیکھا، عصر کی تکبیر پر سلام پھیرا، اور گھر گیا، وہاں خبر پہونچ چکی تھی"[1] ....

میں نے زنانہ دروازہ پر آ کر گھبرائی ہوئی آواز میں کہا کہ وہ حادثہ تو تم نے سن ہی لیا بہت مشغول رہنا، تمہارے پاس عشاء کے بعد آؤں گا، اس سے پہلے پڑھنے پڑھانے میں لگی رہو، دروازہ سے نکلا تو گھر سے مدرسہ قدیم تک ہجوم ہی ہجوم تھا، میں ترش روئی کے ساتھ ان دوستوں سے یہ کہتے ہوئے کہ مجھے تو اس وقت کچھ ضروری پڑھنا ہے، آپ لوگ یہاں تشریف رکھیں، اس گفتگو کے بعد مجمع منتشر ہوگیا، اور میں مسجد میں جا کر بیٹھ گیا"[2]

اس کے بعد ۲۹ شعبان ۱۳۹۳ھ کو اچانک عزیز نواسہ مولوی محمد ہارون کے انتقال کا واقعہ پیش آیا، جو ان کے بھی چشم و چراغ تھے، اور حضرت مولانا محمد الیاس صاحب، اور حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کی بھی واحد یادگار، اس جواں سال اور ہونہار نواسہ کی وفات کی (جس سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں[3]) خبر شیخ کو مکہ معظمہ میں ہوئی، رمضان کا زمانہ تھا، شیخ نے تاکید کی کہ ابھی بچیوں کو خبر نہ کی جائے کہ گھر میں کوئی سحری نہ کھا سکے گا، سو کر اٹھنے کے بعد بچیوں کو بلایا، اور کہا کہ تمہیں میرا قانون معلوم ہے، رنج و غم فطری چیز ہے،

---

[1] آپ بیتی ج۳ ص۹۷-۹۸ [2] ایضاً ص۹۸ [3] مولوی ہارون کی عمر انتقال کے وقت ۳۵ سال تھی، حالات و تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو، عزیزی مولوی محمد ثانی مرحوم کی کتاب "تذکرہ مولوی محمد ہارون کاندھلوی"۔

مگر رونے سے نہ تمہیں کچھ فائدہ نہ مرحوم کو، جاؤ دن بھر بیٹھ کر مرحوم کے لئے کچھ پڑھو اور رات کو مرحوم کی طرف سے عمرے کرو، یہی بات تعزیت کرنے والے مجمع سے کہی، شیخ فرماتے ہیں کہ بلاناغہ مجھے دو سو سے زیادہ عمروں کی فہرست ملی، یہ سب عمرے رمضان میں ہوئے[1]۔

اس موقعہ پر راقم سطور نے شیخ کو جو تعزیت نامہ لکھا، اس کے جواب میں شیخ کا جو گرامی نامہ آیا، اس کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

"مولانا! صدمات بہت اٹھا چکا، اب طبیعت ایسی بے حس ہو گئی کہ خوشی اور رنج دونوں ہی چیزیں میرے لئے مصنوعی سی رہ گئی "لِکَیْلَا تَأْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَا اٰتَاکُمْ" کی سی کیفیت ہو گئی، حضرت سہارنپوری، پھر چچا جان، پھر حضرت مدنی، حضرت رائے پوری، اور آخر میں عزیز یوسف مرحوم نے کچھ سیمنٹ کا سا پلاسٹر ایسا کر دیا کہ رنج و خوشی دونوں چیزیں وقتی سی رہ گئیں، جب دہلی یا سہارنپور سے کوئی خط وہاں کے متاثرین کے متعلق سننے میں آتا ہے تو یکدم دو چار آنسو میرے بھی نکال ہی دیتا ہے، ویسے ہر وقت بحمد اللہ کوئی احساس نہیں ہوتا[2]"۔

ان حوادث اور سانحات میں ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند اور اس سے پیدا ہونے والی صورت حال کو بھی شامل کرنا چاہیئے، جس سے شیخ کو دہلی کے قیام میں بلا واسطہ سابقہ پڑا، اس کی تفصیل یہ ہے۔

شیخ ۲۹ شعبان ۱۳۶۶ھ (۱۹ جولائی ۱۹۴۷ء) کو اپنے معمول کے مطابق رمضان گزارنے کے لئے نظام الدین پہونچے، اور ایک ماہ کے لئے اعتکاف کی نیت سے مقیم ہو گئے،

---

[1] آپ بیتی ۳ ص ۳۰ [2] مکتوب مورخہ ۱۷ رمضان ۱۳۹۳ھ (۱۳ اکتوبر ۱۹۷۳ء)

اسی رمضان کی ۲۷ (شب قدر) ۱۵ اگست کو شب میں بارہ بجے ملک کی تقسیم کا اعلان ہوا سارے ہندوستان میں ایک قیامت برپا تھی[1]۔

اس فتنۂ عالم آشوب کی وجہ سے تقریباً چار ماہ تک شیخ نظام الدین میں گویا محبوس رہے[2]، دہلی سے واپس آنا تو مصیبت عظمیٰ تھا، جانور کاٹ کاٹ کر بغیر روٹی غلہ کے بقرعید کی طرح کھاتے، دہلی کے راستے بالکل مخدوش و محدود تھے، اگر کوئی جان پر کھیل کر راشن لے بھی آتا تو راشن پندرہ آدمیوں کا، اور مستقل رہنے والا مجمع پانچسو کے قریب تھا، بچوں ہی کے لئے وہ راشن کام دے جاتا، مکان اور مسجد کی تلاشی کے بھی بار بار واقعات پیش آئے۔

"وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ" کی تفسیر بھی سامنے آ گئی، کئی مرتبہ نظام الدین کی مسجد بنگلہ (مرکز تبلیغ) پر حملے کی روایات بھی سننے میں آئیں، مگر ہر مرتبہ اللہ جل شانہ نے مدد فرمائی، شیخ جب نظام الدین گئے تھے تو گرمی کا زمانہ تھا، صرف ایک کرتہ، پاجامہ، لنگی ساتھ تھی، جمعہ کے دن لنگی باندھ کر دھونے والوں کو کپڑے دے دیتے، اور وہ دھو دیتے، اس مدت میں سردی آ گئی، کپڑے خریدنے کا کہاں موقعہ تھا، صوفی محمد اقبال ایک فوجی سے دو روپے میں ایک سوئٹر خرید کر لائے، شیخ فرماتے ہیں کہ میں نے اس کو پندرہ برس تک پہنا۔

اس حبس بے جا اور البأساء والضراء کے دور میں ایک امتحان اور مجاہدہ پیش آیا کہ مولانا محمد یوسف صاحب کی اہلیہ، والدۂ مولوی ہارون جو حضرت شیخ کی صاحبزادی تھیں، علیل ہوئیں ان کی حالت ایسی تھی کہ ہر روز گویا آخری دن تھا، ۲۹ شوال ۱۳۶۶ھ (۱۶ ستمبر ۱۹۴۷ء)

---

[1] تفصیل کے لئے "سوانح حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری" کا آٹھواں باب ملاحظہ ہو، ص ۱۴۴-۱۴۹ [2] اس زمانہ کی کیفیت و حالات کے لئے ملاحظہ ہو "آپ بیتی" ۵ ص ۹-۱۲

کو ان کا انتقال ہوا، اور قیام گاہ کے عقبی حصہ میں دفن ہوئیں، اسی زمانہ میں جب ڈاک بھی بند تھی، آمد و رفت کا تو ذکر ہی کیا، شیخ کے عزیز داماد مولوی سعید الرحمن کاندھلوی کا جوانی ہی میں انتقال ہوا، اس کی اطلاع بھی شیخ کو دو ماہ بعد ملی، سہارنپور سے دہلی اور دہلی سے سہارنپور کا راستہ بالکل بند تھا، ۲۸ ذی الحجہ ۱۳۶۶ھ (۱۲ نومبر ۱۹۴۷ء) کو مولانا مدنی بڑی دقت سے دہلی پہونچے، مولانا کو ایک سرکاری ٹرک دیا گیا، اور مسلح پولیس حفاظت کے لئے، ۱۷ نومبر ۱۹۴۷ء کو شیخ مع مستورات اس ٹرک سے سہارنپور واپس ہوئے، راستہ میں بڑی مشکلات پیش آئیں، راستہ میں ٹرک خراب ہو گیا، اور بڑا خطرہ پیدا ہو گیا، اللہ اللہ کر کے سب بخیریت سہارنپور پہونچے۔

۱۱ محرم ۱۳۶۷ھ کو مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ دیوبند سے، اور حضرت رائے پوری رائے پور سے سہارنپور تشریف لائے، اور وہ تاریخی، بلکہ تاریخ ساز مشورہ ہوا، جس کے نتیجہ میں نہ صرف ان تینوں حضرات نے ہندوستان میں قیام کا فیصلہ کیا، بلکہ ضلع سہارنپور، میرٹھ اور پورے مغربی یوپی کے علاقے کے مسلمان جمے رہے۔[1]

سہارنپور کے مخلص و مخصوص خدام

اللہ تعالیٰ نے (جیسا کہ اس کا اپنے اکثر مقبول و محبوب بندوں کے ساتھ معاملہ رہا ہے) شیخ کو ایسے جان نثار، مزاج شناس اور خدمت گذار خادم عطا فرمائے، جو عام طور پر بڑے بڑے رؤسا و امراء کو نصیب نہیں ہوتے، ان میں شیخ کے ایک خادم خاص مولوی عبد المجید صاحب تھے، جنھوں نے اپنے کو حضرت شیخ کی خدمت کے لئے

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "آپ بیتی" نمبر ۵ ص ۲۷۔ ۳۰۔ و سوانح حضرت مولانا عبد القادر رائے پوری ص ۱۵۸

وقف کر دیا تھا، اور دروازہ پر آکر پڑ گئے تھے، شیخ ان کی جفاکشی، چھوٹی چھوٹی ضروریات و مرغوبات کے مہیا کرنے میں ان کی جانفشانی اور مزاج دانی کے قصے مزے لے لے کر بیان کرتے تھے، شیخ کی وفات سے کئی سال پیشتر ان کا انتقال ہو گیا۔[۱]

ان کے چچا مولانا نصیر الدین صاحب مہتمم کتب خانہ یحیوی ناظم اُم المدارس شیخ کے یہاں ناظم الامور و "مدار المہام" کا درجہ رکھتے تھے، ناشتہ اور دونوں وقت کھانے کی تیاری، اور مہمانوں کی نگہداشت انھیں کے ذمہ تھی، شیخ کو مہمانوں کی تعداد اور آمد و خرچ سے کوئی بحث نہ تھی، اس کے لئے کتب خانہ کی آمدنی اور شیخ کے وقتاً فوقتاً عطیے کافی تھے، رمضان مبارک میں خاص طور پر شروع میں کئی کئی سو، اور آخر میں کئی کئی ہزار مہمانوں کے قیام و طعام کا انتظام انھیں کے ذمہ تھا، جو وہ بڑے صبر و تحمل اور فراخ دلی سے انجام دیتے تھے، شیخ کی زندگی ہی میں، ۴ رجمادی الاولی ۱۴۰۱ھ (۱۱ رمارچ ۱۹۸۱ء) کو انھوں نے انتقال کیا، اور شیخ کو اس کا بڑا صدمہ ہوا۔

ان دونوں کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے شیخ کو ایک اور مخلص خادم عطا فرمایا جن کو بعد میں مزاج دانی اور راحت رسانی کی وجہ سے وہ قرب و اختصاص حاصل ہوا جو بہت سے قدیم خدام کو حاصل نہیں ہوا تھا، راقم کو یاد ہے کہ حضرت رائے پوری کے بہٹ ہاؤس سہارنپور میں طویل قیام (۱۳۷۸ھ ۱۹۵۹ء) کے زمانہ میں دو تین نوجوانوں نے شیخ کے پاس آنا جانا شروع کیا، ان میں سے ایک جلد مانوس اور قریب ہوتا چلا گیا، اور بالآخر اس نے گویا قدم پکڑ لئے، صورت و سیرت میں تیزی کے ساتھ تبدیلی آنی شروع ہوئی، اور حضرت شیخ کو بھی اس کے فہم و سلیقہ، اور مزاج دانی کی ادا پسند آئی، اور انھوں نے بھی اس کو

---

[۱] ۱۴ رشعبان المعظم ۱۳۷۰ھ (۳۱ رمئی ۱۹۵۱ء) کو ان کا انتقال ہوا۔

زیادہ سے زیادہ خدمت کا موقعہ دیا، یہ الحاج ابوالحسن تھے، جو سہارنپور کے اسلامیہ کالج میں اسسٹنٹ کلرک اور اسٹونوگرافر تھے، ان کا خدمت کا انہماک، اور شیخ سے اختصاص اتنا بڑھا کہ کالج کی ملازمت کو بھی جواب دیا، شیخ کے حجاز و پاکستان کے اسفار میں مستقل ہمرکابی کا شرف حاصل کرنے لگے، اور بالآخر مدینہ جاکر قدموں ہی میں پڑگئے، اور آخری ساعت تک قدموں ہی میں رہے۔

باب پنجم
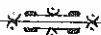
حضرت شیخ کی زندگی میں رمضان المبارک کا اہتمام و معمولات اور اس کے غیر معمولی اجتماعات

عارفین و صالحین کے یہاں رمضان کا استقبال و اہتمام

رمضان المبارک نزول قرآن کی سالگرہ، رحمتوں، اور برکات و تجلیات کا مہینہ، طاعات و عبادات کی بہار کا زمانہ، اور روحانیت کا جشن عام ہے، حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم رمضان مبارک میں اعمال خیر کے بارے میں تیز ہوا آندھی سے بھی آگے رہتے تھے[1] حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ "رمضان کا اخیر عشرہ آتا تو آپؐ پوری رات بیدار رہتے، گھر والوں کو بیدار فرماتے، اور عبادات اور نوافل کے لئے کمر کس لیتے[2] عارفین مشتاق اور عالی ہمت خاصان خدا کی بھی دلی مراد بر آنے کا وہ موسم اور ان کا محبوب ترین مہینہ ہے، جس کے لئے وہ سال بھر دن گنتے رہتے ہیں، اولیائے متقدمین کا ذکر نہیں، بعض قریب العہد بزرگوں کے متعلق سنا گیا ہے کہ عید کا چاند دیکھتے ہی آنے والے رمضان کا انتظار شروع ہو جاتا تھا[3]، رمضان المبارک آتے ہی ان میں ایک نیا جوش و ولولہ، اور ایک

---

[1] بخاری و مسلم [2] ایضاً [3] ایک معاصر مؤرخ دور اخیر کے ایک بزرگ مولانا سید شاہ ضیاء النبی حسنیؒ رائے بریلوی (م ۱۳۲۶ھ) کے متعلق لکھتے ہیں :-

"آمد رمضان سے اتنے خوش ہوتے ہیں کہ چھ مہینے پہلے سے ذکر کیا کرتے ہیں کہ اب رمضان آتا ہے اتنے مہینے باقی ہیں، اور اتنا ہی اس کے جانے سے محزون ہوتے ہیں "من فرح بدخوله ولهف بخروجه" کے سچے مصداق آپ ہی ہیں"

نئی نشاط و امنگ پیدا ہو جاتی تھی، اور وہ کبھی زبان حال سے یوں گویا ہوتے تھے ؎

هذا الذی کانت الأیام تنتظر

فلیوف لله أقوام بما نذروا

(یہ وہ دولت ہے جس کا زمانہ کو انتظار تھا۔ اب وقت آگیا ہے کہ نذر ماننے والے اپنی نذریں پوری کریں۔)

اور کبھی کیف و سرور میں آکر یوں گنگنانے لگتے تھے ؎

پلا ساقیا وہ مئے دل فروز
کہ آتی نہیں فصل گل روز روز

رمضان المبارک کے آتے ہی دینی و روحانی مرکزوں اور خانقاہوں کی فضا بدل جاتی تھی، ان لوگوں کے علاوہ جو وہاں مستقل طور پر قیام پذیر ہوتے تھے، شیخ و مرشد سے بیعت و عقیدت کا تعلق رکھنے والے دور دور سے اس طرح کھنچ کھنچ کر آجاتے تھے جیسے آہن پارے مقناطیس کی طرف، اور پروانے شمع کی طرف آجاتے ہیں، یہ روحانی مرکز ذکر و تلاوت، اور نوافل و عبادات سے اس طرح معمور ہو جاتے کہ گویا دن میں اس کے سوا کوئی کام، اور رمضان کے بعد پھر کوئی رمضان آنے والا نہیں، ہر شخص دوسرے شخص سے بڑھ جانے کی کوشش کرتا، اور رمضان کے ہر دن کو صرف رمضان ہی کا نہیں، اپنی زندگی کا آخری دن سمجھتا، اور خواجہ میر درد کے اس شعر کی سچی تصویر، اور عملی تفسیر بن جاتا ؎

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جس قدر بس چل سکے ساغر چلے

جو خدا کا بندہ تھوڑی دیر کے لئے بھی اس ماحول میں آجاتا وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر

ہوجاتا، افسردہ طبیعتوں میں نئی گرمی، بلکہ سرگرمی، پست ہمتوں میں عالی ہمتی اور اولوالعزمی، بلکہ مردہ دلوں میں زندہ دلی اور بلند پروازی پیدا ہوجاتی، بجلی کا ایک کرنٹ تھا، جو دلوں سے دلوں کی طرف پہونچ جاتا، اور مردہ جسموں میں ایک بجلی سی پیدا کردیتا، جو شخص اس روحانی وملکوتی فضا کو دیکھتا اس کا قلب شہادت دیتا کہ جب تک خدا طلبی کا یہ ہنگامہ برپا ہے، اور دین وروحانیت کی شمع کے پروانوں کا ہجوم ہے، اور ہر قسم کے دنیوی اغراض اور نفس پرستی و دنیا طلبی سے بالاتر ہوکر خدا کو راضی کرنے اور اپنی آخرت کو بنانے کے لئے اتنے آدمی کسی جگہ جمع ہیں، دنیا تباہ نہ ہوگی، اور زندگی کی اس بساط کو تہ کرنے کا فیصلہ نہیں کیا جائے گا، اس وقت وہ بے اختیار خواجہ حافظ کے الفاظ میں اس طرح گویا ہوجاتا تھا ؎

از صد سخن پیرم یک نکتہ مرا یاد است
عالم نشود ویراں تا میکدہ آباد است

افسوس ہے کہ آٹھویں صدی میں سلطان المشائخ محبوب الٰہی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی خانقاہ غیاث پور (دہلی) اور تیرہویں صدی میں حضرت شاہ غلام علی دہلویؒ کی خانقاہ مظہریہ واقع چتلی قبر (دہلی) کے رمضان المبارک کا آنکھوں دیکھا حال کسی مؤرخ نے نہیں لکھا، اور وہاں ذکر وتلاوت کی سرگرمی، شب بیداری، اور وہاں کا نظام الاوقات کسی کتاب میں تفصیل سے نہیں ملتا، لیکن "فوائد الفواد" "سیر الاولیاء" اور "دُرّ المعارف" میں اس کی کچھ جھلکیاں نظر آتی ہیں، جو شخص ان خانقاہوں کے شب وروز، اور ان مشائخ کے ذوق وشوق اور ساز وسوز سے واقف ہے، وہ ان نقطوں سے پوری تحریر، اور ان نامکمل خطوط سے پوری تصویر تیار کرسکتا ہے کہ ع

قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا

لیکن جن خانقاہوں اور روحانی مرکزوں کے حصے میں ان خانقاہوں کی وراثت، اور جن علماء و مشائخ کے حصے میں ان بزرگان سلف اور مشائخ پیشین کی نیابت و خلافت آئی، انھوں نے ان مناظر کو تازہ اور زندہ کردیا، اور تاریخ نے ان کے عہد میں اپنے آپ کو دہرادیا۔

وہ لوگ تو خال خال ہوں گے، جنھوں نے گنگوہ میں قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے زمانہ میں رمضان کی بہار دیکھی ہے، لیکن وہ لوگ بکثرت موجود ہیں، جنھوں نے گنگوہ کے دور کے بعد شیخ وقت حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری کے دور میں رائے پور میں، اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے دور میں تھانہ بھون میں رمضان کی بہار دیکھی، اور جس وقت وہ اس زمانہ کو یاد کرتے ہیں، ان کے دل پر ایک چوٹ لگتی ہے۔[1]

مولانا مدنیؒ اور رمضان کا اہتمام

ہمارے علم میں اس اخیر دور میں جس نے اسلاف کی اس سنتِ دیرینہ کو زندہ کیا اور اس کو نئی آب و تاب بخشی وہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ کی ذات بابرکات تھی، انھوں نے اپنے مخصوص طالبین و مخلصین کی درخواست پر کسی ایک جگہ قیام کرکے رمضان المبارک کے گذارنے کا معمول بنالیا، اور اطراف و اکناف

---

[1] حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کے دور میں رمضان میں چار سو۔ پانچ سو سے زیادہ کا مجمع ہوتا تھا۔ (آپ بیتی ۲ صہ ۶۹)

بلکہ ملک کے دور دراز گوشوں سے منتسبین اور ارادت مند پروانہ وار جمع ہونے لگے،
حضرت نے ایک عرصہ تک سلہٹ میں رمضان المبارک گذارا، پھر کئی سال بانس کنڈی
(بنگال) میں رمضان گذارا، ایک دو سال اپنے وطن مالوف الٰہ داد پورہ متصل ٹانڈہ
ضلع فیض آباد خاص اپنے دولت خانہ پر رمضان المبارک گذارا، ان سب مقامات
پر سیکڑوں کی تعداد میں مریدین و خدّام، اور اس ماہ مبارک کے قدر داں جمع ہوتے
جو آپ کے مہمان ہوتے، آپ ہی ان مقامات پر قرآن شریف سناتے لوگ ذکر و شغل،
تلاوت و عبادات میں پوری سرگرمی و عالی ہمتی سے مشغول رہتے، خدام کو بڑی
کیفیات و ترقیات محسوس ہوتیں، اور وہ عرصہ تک مزے لے لے کر ان پُر کیف دیر پُر سرور
ساعتوں کا ذکر کرتے[1] اگر اللہ کو منظور ہوتا اور مولانا کی زندگی وفا کرتی تو غالباً
الٰہ داد پورہ میں یہ مبارک سلسلہ جاری رہتا، اور خدا جانے کتنے بندگان خدا اپنی مراد
کو پہونچتے، اور تربیت و تکمیل کے مدارج سے گذرتے، لیکن مولانا کی وفات (یوم جمعرات
۱۳ر جمادی الاولیٰ ۱۳۷۷ھ - ۵ر دسمبر ۱۹۵۷ء) نے اس سلسلہ کو منقطع کر دیا، اور لوگ
کف افسوس ملتے رہ گئے۔

رائے پور اور دوسرے مقامات کا رمضان

مرشدنا حضرت مولانا عبد القادر صاحب رائے پوری کے یہاں بھی رمضان
کا غیر معمولی اہتمام تھا، تقسیم سے پہلے پنجاب کے اہل تعلق جن میں ایک بڑی تعداد علماء
اہلِ مدارس اور صاحبِ اجازت مشائخ کی ہوتی تھی، شعبان کی آخری تاریخوں میں

---

[1] ملاحظہ ہو مولوی عبد الحمید اعظمی کا رسالہ قیام سلہٹ ۱۳۶۵ھ، اور حضرت شیخ کی کتاب "اکابر کا رمضان"

رمضان گذارنے کے لئے رائے پور آجاتے، اور پھر پوری یکسوئی وانہماک کے ساتھ دنیا ومافیہا سے بے خبر ہو کر دنیا سے الگ تھلگ اس گاؤں میں جس کو شہر سے ملانے والی کوئی پختہ سڑک بھی نہیں اور نہ کوئی ریلوے اسٹیشن قریب ہے، اس مبارک مہینہ کو وصول کرنے میں مشغول ہو جاتے، اور عید کی نماز پڑھ کر ہی یہاں سے تشریف لے جاتے، اس زمانے میں رائے پور کی خانقاہ کی کیا کیفیت ہوتی تھی، اور شیخ وطالبین کا کیا حال ہوتا تھا، اس کا کچھ اندازہ راقم کی کتاب "سوانح حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری" سے ہو سکتا ہے[1]۔

رائے پور کے علاوہ بہٹ ہاؤس (سہارنپور) صوفی عبدالحمید صاحب (سابق وزیر پنجاب) کی کوٹھی واقع جیل روڈ (لاہور) گھوڑا گلی (کوہ مری پاکستان) اور مسجد خالصہ کالج (لائل پور) میں بھی اس دھوم کے ساتھ رمضان گذرے کہ کئی کئی سو خدام اور اہل تعلق کا مجمع تھا، اور ذکر وتلاوت اور مجاہدہ کا زور شور۔

حضرت شیخ اور رمضان المبارک کا اہتمام والتزام

اس سنت کا تسلسل واستمرار بلکہ اس کی ترقی وتوسیع اس شخصیت کے حصہ میں آئی، جس کے ہاتھوں سے اپنے اسلاف وشیوخ اور اساتذہ ومربیوں کے بہت سے کارناموں کی حفاظت، بہت سی تصنیفات کی اشاعت اور بہت سی ناتمام چیزوں کی تکمیل مقدر ہو چکی تھی[2]، یوں تو رمضان کا اہتمام، اس میں تلاوت وعبادت کا

---

[1] ملاحظہ ہو ص ۱۲۳

[2] ماخوذ از مقدمہ "صحبتے با اولیاء" تحریر کردہ راقم سطور ص ۹ (تصنیف مولانا تقی الدین ندوی مظاہری)۔

انہماک انقطاع و یکسوئی اہل قلوب اور اہل معرفت کا ہر دور میں خصوصی شعار رہا ہے، لیکن شیخ کے یہاں اس بارے میں رمضان کی مشغولیت اور یکسوئی اور انقطاع کی جو کیفیت نظر آتی تھی، اس کے سمجھنے کے لئے ایک واقعہ جو لطیفہ کی حیثیت رکھتا ہے، مدد دیگا۔

شیخ کے یہاں رمضان میں ملاقات تو ملاقات بات کرنے کی بھی فرصت نہیں تھی، اور جبکہ روزانہ ایک قرآن شریف ختم کرنے اور احتیاطاً کچھ زیادہ پڑھنے کا معمول تھا (کہ مبادا انتیس۲۹ کا چاند ہو جائے[1]) تو یوں بھی تواضع اور خاطر داری میں گفتگو و ملاقات کی فرصت ملنی مشکل تھی، حکیم طیب صاحب رام پوری مرحوم کے حضرت شیخ سے خاندانی تعلقات و عزیزداری تھی، اور حضرت حکیم ضیاء الدین صاحب سے تعلق کی بناء پر جو اس سلسلہ کے مشائخ میں تھے، حضرت شیخ اور اس سلسلہ کے سب بزرگ ان کا خاص لحاظ کرتے تھے، ایک مرتبہ وہ رمضان المبارک میں شیخ کے یہاں آگئے، جب بھی انھوں نے ملاقات کا ارادہ ظاہر کیا تو خدام نے کہا کہ یہ وقت حضرت شیخ کی مصروفیت کا ہے، اس وقت بات کرنے کی فرصت نہیں، جب ان کی ملاقات ہوئی تو انھوں نے شیخ سے کہا:۔

"بھائی جی! السلام علیکم، بات نہیں کرتا صرف ایک فقرہ کہوں گا، رمضان اللہ کے فضل سے ہمارے یہاں بھی آتا ہے، مگر یوں بخار کی طرح کبھی نہیں آتا، السلام علیکم جا رہا ہوں[2]"

---

[1] شیخ کی آپ بیتی سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۳۳۸ھ کے ماہ مبارک میں ایک قرآن روزانہ پڑھنے کا معمول شروع ہوا، جو تقریباً ۱۳۵۰ھ تک رہا، بلکہ اس کے بھی کچھ بعد تک (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو آپ بیتی ۲ ص ۳۵-۳۶

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "آپ بیتی" ۲ ص ۳۷

رمضان المبارک کا نظام الاوقات

رمضان المبارک میں شیخ کا نظام الاوقات بہت بدل جاتا، سرگرمی، جفاکشی، بلند ہمتی، ذوق عبادت و تلاوت اور یکسوئی و انقطاع اپنے نقطۂ عروج پر ہوتا۔

راقم السطور کو (۱۳۶۶ھ ۱۹۴۶ء) میں ایک مرتبہ پورا رمضان ساتھ گذارنے کی سعادت حاصل ہوئی، نظام الدین میں قیام تھا، اور شیخ کی خصوصی شفقت و تعلق کی وجہ سے بہت قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا، پورے مہینہ کا اعتکاف تھا، روزانہ ایک قرآن شریف ختم کرنے کا التزام تھا، قدرے اضافہ کے ساتھ، (تاکہ اگر ۲۹ کا چاند ہو جائے تو تیس ۳۰ قرآن مجید ختم کرنے کے معمول میں فرق نہ آئے) نظام الاوقات یہ رہتا تھا، کہ افطار صرف ایک مدنی کھجور سے، پھر ایک پیالی چائے، اور ایک بیڑہ پان، نماز مغرب کے بعد اوّابین شروع فرما دیتے جن میں کئی پارے پڑھتے، اوّابین سے فراغت کے بعد اور عشاء کی نماز سے پیشتر ایک خصوصی مجلس ہوتی جس میں خاص عزیز و خدام شریک رہتے، عشا اور تراویح کے بعد پھر مجلس ہوتی جس میں ہلکی سی افطاری عموماً امرود یا کیلہ کا کچالو یا کچھ پھلکیاں برے وغیرہ، لیکن قلیل مقدار میں، کھانے کا اس وقت بھی ذکر نہیں، یہ گرمیوں کا زمانہ تھا، مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ بہت ٹھہر ٹھہر کر قرآن مجید پڑھنے کے عادی تھے، اس لئے تراویح میں بہت دیر ہو جاتی، گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ مجلس میں بیٹھ کر حاضرین مجلس تو آرام کرتے چلے جاتے، شیخ نوافل میں مشغول ہو جاتے، سونے کا ایک منٹ کے لئے بھی معمول نہ تھا، اخیر وقت میں سحر کھاتے، اور چوبیس ۲۴ گھنٹے میں یہی کھانے کا وقت تھا، نماز فجر اول وقت ہو جاتی، نماز کے بعد آرام فرماتے اور دن نکلنے کے بعد بیدار ہوتے، چوبیس ۲۴ گھنٹے میں یہی سونے کا وقت تھا، پھر دن بھر قرآن مجید ہی کا

دور رہتا، یہی رمضان کا سب سے بڑا معمول تھا، جو کچھ وقت ملتا، قرآن مجید کی تلاوت اور دور میں گذرتا۔

رمضان کی اسی مشغولیت اور علوئے ہمت میں صحت کے تنزل کے باوجود اور ترقی ہی ہوتی چلی گئی، ۸۵-۱۳۸۶ھ ۶۵-۶۶ء کے رمضان کی تفصیل ایک خاص، اور ہروقت کے حاضر باش[۱] اس طرح تحریر کرتے ہیں:۔

"وسط شعبان سے ۲۸ رمضان تک جو مہمان باہر سے آئے، اور پورا رمضان یا کچھ ایام گذار کر واپس گئے، ان کی ایک فہرست ایک خادم نے بطور خود مرتب کی تھی، اس فہرست میں ۳۱۳ مہمانوں کے نام ہیں۔

حضرت شیخ کا نظام الاوقات رمضان شریف میں یہ رہا، سحری کے لئے جب لوگ بیدار ہوتے تو حضرت عموماً نوافل میں مشغول ہوتے، اور جب سحری کا وقت ختم ہونے لگتا تو ایک دو انڈے نوش فرماتے، اور چائے کی ایک پیالی، پھر جماعت تک تکیہ لگائے لوگوں کی طرف متوجہ رہتے، مہمان حضرات آمنے سامنے ہوتے، بعد نماز فجر آرام فرماتے، تقریباً ۹ بجے دن تک، پھر ضروریات سے فارغ ہو کر نوافل میں مشغول ہو جاتے، دوپہر زوال کے قریب تک، پھر ڈاک ملاحظہ فرماتے، اور بعض ضروری خط لکھواتے، اذان ظہر تک، پھر نماز میں مشغول ہوتے، بعد ظہر فوراً تلاوت شروع فرماتے مسلسل عصر تک، مہمانوں کو ہدایت تھی کہ سب لوگ ہمہ تن ذکر میں مشغول ہو جائیں قبیل عصر تک، چنانچہ ذاکرین ذکر میں مشغول ہوتے، اور دوسرے حضرات تلاوت میں مشغول رہتے عصر تک،

---

[۱] مولانا منور حسین صاحب بہاری مظاہری خلیفہ مجاز حضرت شیخؒ

بعد عصر حضرت قرآن شریف سناتے، اکثر مہمان یا تو قرآن شریف سنتے، یا خود تلاوت کرتے، قبیل افطار تک، صرف چند منٹ پہلے تلاوت موقوف کرکے مراقب ہوجاتے، مہمانوں کو ہدایت تھی کہ صحن مسجد میں افطاری کے دسترخوان پر چلے جائیں، اور حضرت اکیلے پردہ میں ہوجاتے، اذان پر مدنی کھجور سے افطار اور اس پر زمزم ایک پیالی نوش فرماتے، پھر مراقب ہوجاتے، یا ٹیک لگا کر بیٹھنے، نماز مغرب سے فراغت کے بعد مہمانوں کو کھانا کھلایا جاتا، اور حضرت دیر تک نوافل میں مشغول رہتے، اذان کے آدھ گھنٹہ پہلے تک، اس وقت ایک دو انڈے نوش فرماتے، اور ایک پیالی چائے، یہ چائے بھی ہفتہ عشرہ کے بعد بہت اصرار پر شروع ہوئی، اس طرح انڈا بھی سخت اصرار پر منظور فرمایا تھا، روٹی چاول وغیرہ کی قسم سے کوئی چیز بھی رمضان بھر بلکہ ایک دن پہلے بھی نوش نہیں فرمایا۔

اذان عشاء سے آدھ گھنٹہ پہلے پردہ ہٹایا جاتا، حضرت ٹیک لگا کر مہمانوں کی طرف متوجہ رہتے، عجب منظر ہوتا، نئے آنے والے ملتے، پھر اذان ہوجانے پر ضروریات سے فارغ ہو کر نوافل، پھر فرض و تراویح میں مشغول ہوجاتے، اس رمضان میں تین قسم کی سماعت فرمائی، پہلے مفتی یحییٰ صاحب نے سنایا، پھر حافظ فرقان صاحب نے، پھر میاں سلمان سلمہ پسر مفتی یحییٰ صاحب نے، پورا ماہ اعتکاف میں گزرا، اور اکثر و بیشتر مہمان بھی معتکف رہے، حتیٰ کہ بسا اوقات ڈاکخانہ بھیجنے کے لئے کسی آدمی کا ملنا مشکل ہوگیا تھا، بس حضرت کے تین چار خادم کو خاص کرکے ضروریات کے لئے غیر معتکف

دیکھا گیا۔

آخر عشرہ میں یا اس سے کچھ پہلے بعض بعض دوستوں کے بار بار مٹھائی یا کباب لانے کی بناء پر تراویح کے بعد ایک دو لقمہ مٹھائی یا شامی کباب بھی نوش فرما لیتے، مگر اکثر تو تقسیم ہی کرا دیتے، اوائل رمضان میں اعلان کرا دیا گیا تھا یعنی حضرت نے خود فرما دیا تھا کہ تراویح کے بعد کتاب ہوا کرے گی، چنانچہ کتاب ہی سنانے کا معمول رہا، اور اس وقت چنے یا پھلکی وغیرہ کا جو معمول پہلے سے چلا آرہا تھا، اس رمضان میں بند کروا دیا گیا تھا کہ وقت ضائع ہوگا، کتاب وغیرہ سے فراغت کے بعد فرماتے، حضرات جاؤ وقت کی قدر کرو، چنانچہ اکثر تلاوت یا نماز میں لگ جاتے، اور حضرت بھی مشغول ہو جاتے، کچھ دیر کے بعد کچھ دیر کے لئے آرام فرماتے، مگر تنام عینی ولا ینام قلبی کی طرح کیفیت رہتی کہ ابوالحسن سلمہ سے جو پاس ہی کو ہوتے کبھی کوئی بات فرما بھی دیتے، اور یہ فرماتے کہ تم لوگوں کی تلاوت اور ذکر سے میرے آرام میں فرق نہیں آتا۔"

اگلے رمضان (۱۳۸۶ھ) کا نظام تقریباً وہی رہا، کچھ چیزوں میں تبدیلی تھی، مولانا منور حسین صاحب بہاری[1] نے اپنے مکتوب میں جو حالات لکھے ہیں، اس کی چند اہم باتیں یہ ہیں:-

"۲۹ر شعبان کو فجر کی نماز سے پہلے ہی مہمانوں اور معتکفوں نے اپنی اپنی جگہوں پر قبضہ کرنا، اور بستر ے پھیلانے شروع کر دیئے، چنانچہ بعد فجر جو لوگ گئے

---

[1] مولانا منور حسین بہاری مظاہری خاص طور پر رمضان المبارک کے انتظام و اہتمام کے بڑے ذمہ داروں اور منتظمین میں ہوا کرتے تھے۔

تو اکثروں کو تیسری صف میں جگہ ملی، حضرت پہلے ہی اعلان فرما چکے تھے کہ
۲۹ شعبان کو بعد عصر مسجد ہی سے اعتکاف گاہ منتقل ہو جائیں گے، چنانچہ
تشریف لے گئے، اور تو شے سے اوپر سو سے تین چار کم مہمان بھی مسجد
دار الطلبہ جدید میں اقامت و اعتکاف کی نیت سے پہونچ گئے، حالانکہ
مسجد بہت وسیع اور اندر چھ صفوں کی جگہ ہے مگر مہمانوں اور سامان سے مسجد
بھر گئی، چنانچہ جو مہمان رات کو یا صبح سے پہلے یا بعد پہونچے ان کو مسجد کے برآمدے
میں جگہ دلوائی گئی، شام کے دسترخوان میں سو سے کم اور سحری کے وقت سو سے
زائد مہمان ہو گئے تھے، پھر مہمان آنے گئے، اور برآمدہ مسجد کے پُر ہو جانے پر
اندرون مسجد جگہ جا بجا دلوائی گئی، اور ہر مہمان کو تقریباً ڈیڑھ فٹ کی جگہ اخیر
کے دو عشروں میں میسر رہی، مہمانوں کی کثرت کی وجہ سے دوسرے عشرہ کے
وسط میں ایک عظیم الشان خیمہ نصب کرایا گیا یعنی مسجد کے کھلے صحن میں وہ بھی
اخیر عشرہ میں بھر گیا، پہلے ہی سے دار الطلبہ جدید کے چھ کمروں کو خالی کرالیا گیا
تھا، چنانچہ پہلے دو سرے عشروں میں تو صرف معززین کو ان کمروں میں چارپائیوں
پر ٹھہرایا جاتا تھا، مگر اخیر عشرہ میں دو کمرے تو معززین کے لئے رہے، باقی چار کمروں
میں پرال ڈلوا کر عام مہمانوں کو ٹھہرایا گیا، بعد کو سبھی کمروں میں پرال پڑے،
۲۳ سے ۲۸ تک تقریباً پونے تین سو مہمان دسترخوان پر کھاتے رہے، مزید
مولوی نصیر الدین صاحب کے پاس کھاتے رہے......" اس سال تبلیغی
جماعتیں علماء اور مدرسین اور اہل علم کثرت سے آئے، حضرت نے متعدد
اشخاص کو اجازت دی، گجرات، بمبئی، پالن پور کے مہمانوں کی تعداد نمایاں تھی،

یوں یوپی والوں کی تعداد مجموعی طور پر زیادہ تھی، افریقہ، انڈمان، میسور، مدراس بنگال، اڑیسہ، بہار اور آسام کے مہمان بھی تھے۔

ظہر سے عصر تک تلاوت فرماتے رہتے، تمام مہمان ذکر میں مشغول رہتے، عصر تک اکثر ذکر جہری میں بعض ذکر سری یا مراقبہ میں اور کچھ تلاوت میں بات چیت کرنے کی قطعی اجازت نہیں تھی، عام ہدایت تھی کہ ہمارے یہاں آؤ تو بات چیت نہ کرو، خواہ سو رہو یا خاموش بیٹھے رہو، کوئی حرج نہیں عصر کے بعد کتابیں سنائی جاتیں، امداد السلوک، علامہ سیوطی کا ایک رسالہ، نیز ایک اور رسالہ، پھر اتمام النعم ترجمہ تبویب الحکم، پھر اکمال الشیم شرح اتمام النعم سلوک کی کتابیں پورے رمضان میں سنائی گئیں، افطار سے پندرہ منٹ پہلے کتاب سنانی موقوف کر دیتے، اور پردے میں مراقب ہو جاتے، مدنی کھجور اور زمزم سے افطار فرماتے، کچھ کھانے کا معمول نہیں تھا، پھر مراقب ہو جاتے، نماز مغرب کے بعد تقریباً پون گھنٹے نوافل میں مشغول رہتے، پھر دو انڈے کی زردی نوش فرما کر ایک پیالی چائے پی لیتے۔

پردہ ہٹا دیا جاتا تقریباً سوا سات بجے عام مجلس شروع ہو جاتی، نئے آنے والوں سے مصافحہ فرماتے، اور کب تک قیام کا سوال فرماتے، اور محل قیام کے لئے ہدایت فرماتے، پھر ۸ بجے تک بزرگوں کے واقعات بیان فرماتے، اس درمیان میں بیعت بھی فرماتے، اذان ہوتے ہی نماز کی تیاری کو فرماتے، اور خود ضروریات سے فارغ ہوتے اور نوافل شروع فرماتے۔

تراویح سے فراغت پر سورۂ یٰس کا ختم ہوتا، اور دیر تک دعا فرماتے رہتے، تبلیغی جماعت کے مخصوص حضرات ملتے تو ان سے دعا کی فرمائش کرتے پھر کتاب سنانے کا سلسلہ ساڑھے گیارہ بجے تک رہتا، اور تبلیغی کارروائی سنائی جاتی، اس کتابی مجلس کے

اختتام پر تقریباً بارہ ۱۲ بجے شب کو پردہ گرا دیا جاتا، اس سال گھر والوں اور دوستوں
کے اصرار و تقاضہ اور اس بناء پر کہ بالکل فاقہ رہنے پر پیاس کا غلبہ ہوتا تھا، اور
پانی پینے پر معدہ میں رطوبت بہت بڑھ گئی تھی جس کے نتیجہ میں رمضان کے بعد بھی
کچھ عرصہ تک کچھ کھایا نہیں جاتا تھا، افطاری کا سلسلہ شروع کیا گیا، حضرت کچھ تفکہ
فرمالیتے، پون بجے تک مخصوص مجلس جاری رہتی، مراقبہ کی کیفیت رہتی، ایک بجے
کے بعد سو جاتے، چار بجے اٹھتے، ضروریات سے فارغ ہو کر نوافل میں مشغول ہو جاتے،
صبح صادق سے آدھ گھنٹہ پہلے دودھ، پاپے کے چند چمچے نوش فرما کر ایک پیالی یخنی
نوش فرماتے، پھر نوافل میں مشغول ہو جاتے، یہاں تک کہ اذان ہو جاتی"۔

۱۳۹۵ھ کے رمضان کا نظام الاوقات جو خود شیخ نے آپ بیتی میں لکھا ہے،
حسب ذیل ہے:۔

"بعد مغرب اوابین میں دو پارے، بعدہٗ چائے، استنجا وغیرہ، بعدہٗ مجلس
از ۸ - ۸½، اسی میں بیعت و گفتگو عشاء، از ۹ تا ۱۰½، بعدہٗ ختم یٰسین
و دعا، بعدہٗ فضائل رمضان، تا ۱۱¼ سوا گیارہ، بعدہٗ الوداعی مصافحوں
کے بعد ۱۲ تک کیواڑ بند ۳ بجے تک، تین بجے کواڑ کھلتے اور سحر کا انتظام ہوتا،
تہجد میں دو پارے، بعد نماز فجر آرام تا ۹ بجے، بعدہٗ قرآن شریف دو پارہ
دیکھ کر تا ۱۱ متفرقات تا ایک، بعد ظہر ختم خواجگان، اور ذکر، دو پارے سنانے کا
معمول، بعد عصر ارشاد و اکمال[1]"۔

۱۳۸۵ھ سے شیخ نے دار الطلبہ جدید کی مسجد میں رمضان گزارنا شروع کیا،

---

[1] آپ بیتی ۷ ص ۱۱۶-۱۱۷

ہر سال مجمع بڑھتا چلا گیا، ۱۳۸۵ھ میں چالیس نفر معتکف تھے، اخیر میں دو سو تک تعداد پہونچ گئی، ۱۳۸۶ھ میں دو سو سے معتکفین کی تعداد شروع ہوئی، ۱۳۸۷ھ میں خیمے لگانے پڑے، طلبہ کے جو حجرے خالی تھے، ان میں مہمانوں کو ٹھہرایا گیا۔ ۱۳۹۴ھ کا رمضان سہارنپور میں گزرا، دار الطلبہ جدید کی مسجد دو منزلہ ہوگئی تھی، مگر وہ بھی معتکفین کے لئے کافی نہ ہوئی، مہمانوں کے لئے دار الطلبہ کے حجرے خالی کرائے گئے، شروع رمضان میں ۸-۹ سو کا اندازہ تھا، اخیر رمضان میں مولوی نصیر الدین صاحب نے بتایا کہ آج اٹھارہ سو مہمان ہیں، عشرہ اولی کے ختم ہی پر مہمان ایک ہزار تک پہونچ گئے تھے، ۲۷-۲۸ رمضان تک تعداد دو ہزار تک پہونچ گئی۔[۱]

نظام الاوقات یہ تھا، ۱۱ بجے تقریباً ایک گھنٹہ وعظ، ظہر کے بعد عصر تک ختم خواجگان اور ذکر بالجہر، عصر کے بعد اکمال الشیم اور ارشاد الملوک، مغرب کے بعد تقریباً ایک گھنٹہ نوافل اور طعام، اس کے بعد عشاء کی اذان تک نو وارد آنے والوں اور مقیمین سے ملاقات، عید کے بعد بھی دار جدید کی مسجد میں کئی دن قیام کرنا پڑا، اس لئے کہ مجمع بہت زیادہ تھا،[۲] شیخ نے یکم شوال ۹۴ھ کے بارے میں لکھا ہے تو آج کے رخصتی مصافحوں سے سمجھا تھا کہ مہمان سو پچاس ہی رہ گئے ہوں گے، مگر ابھی تو آج اور کل کے ٹھہرنے والے بھی پانچسو کے قریب ہیں۔[۳]

سہارنپور کے رمضان کے زمانہ میں اگرچہ مقیمین پورے انہماک و یکسوئی کے ساتھ (الا ماشاء اللہ) تلاوت و نوافل، اور رمضان کے خصوصی معمولات میں منہمک رہتے، شیخ بار بار فرماتے، جتنا جی چاہے ساتھی سوئیں، اور کھائیں، لیکن باتیں نہ کریں کہ سب سے

---

[۱] آپ بیتی ۷ ص ۶۶ [۲] ایضاً [۳] ایضاً ص ۱۷

زیادہ مضر ہی ہے، لیکن شیخ کو پھر بھی اطمینان نہیں ہوتا تھا کہ رمضان کے اوقات پوری طرح وصول کئے جا رہے ہیں، یا اس میں کوتاہی ہے، کبھی کبھی شیخ اس کو از راہ تواضع و احتساب نفس میلے سے تعبیر فرماتے، ۲۴ فروری ۷۴ء کے ایک مکتوب میں جو راقم سطور کے نام ہے، تحریر فرماتے ہیں:-

"اپنے یہاں کے ہجوم کے متعلق آپ کو بھی معلوم ہوگا کہ میں کئی سال سے مولوی منور، مفتی محمود وغیرہ خصوصی احباب سے بار بار یہ سوال کرتا تھا کہ اس میلہ سے جو رمضان میں یہاں لگتا ہے، فائدہ زیادہ ہے یا نقصان؟"

ایک پُراثر و حسب حال نظم

اس موقعہ پر مناسب ہوگا کہ عزیزی مولوی محمد ثانی مرحوم کی وہ نظم درج کر دی جائے، جس میں رمضان المبارک کو وداع کہنے کے سلسلہ میں اس تاریخی موقعہ، اس پرکیف منظر اور اس کے ایک تاریخی یادگار بن جانے کی طرف لطیف اشارے کئے گئے ہیں، یہ نظم جب مولوی معین الدین صاحب نے بلند آواز سے پڑھی تو ایک سماں بندھ گیا، خود شیخ پر ایک اثر معلوم ہوتا تھا، خاص طور پر آخری دو شعروں پر بہت سی آنکھیں اشکبار، اور پڑھنے والے کی آواز گلوگیر ہو گئی۔

وداع رمضان

رحمتِ حق آئی قسمت در پہ چلے   سجدہ ریزی کو خدا کے گھر چلے

نعمتوں سے گود بھر نے خوش نصیب   زاہدانِ با صفا بڑھ کر چلے

وا ہوئے در بزمِ رحمت کے تمام	اہلِ دردو سوز کھینچ کر چلے
گلشن رحمت کی ہر دم سیر کی	اپنے دامن کو گلوں سے بھر چلے
رہ گئے محروم ہم ہی کم نصیب	جھاڑ کر دامن کو اپنے گھر چلے
"شمع کی مانند اس کی بزم میں	چشم تر آئے تھے دامن تر چلے"
قدر نعمت کی نہ کچھ ہم کر سکے	بوجھ عصیاں کا لئے سر پر چلے
ہائے رے حسرت نصیبی وائے غم	"کس لئے آئے تھے اور کیا کر چلے"
نور سمٹا چاندنی پھیکی پڑی	سر چھپانے کو مہ و اختر چلے
ماہ رحمت کے شب و روز و سحر	ہر طرف تم نور برسا کر چلے
تم سے ملتی تھی دلوں کو تازگی	تم چلے ارمان سارے مر چلے
الفراق اے ماہ رمضاں الفراق	زخم دل پر کیا لگے نشتر چلے
آئے رحمت کو لئے ہر سال تو	تیری رحمت کی ہوا گھر گھر چلے
ایک جھونکا تیری رحمت کا ادھر	بہر الطاف اے کرم گستر چلے
ہوں نہ ہوں یہ لطف کے دن پھر نصیب	اور دورِ بادۂ کوثر چلے
اور بھی کچھ اور بھی کچھ اور بھی	جانے کب در بند ساقی کر چلے

"ساقیا اب لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے"

بابِ ششم

مدینہ طیبہ کا مستقل قیام، طیبہ کے لیل و نہار، ہندوستان کے چند سفر اور رمضان المبارک

آخری سفر حجاز اور مستقل قیام

حضرت شیخ کی مدۃ العمر کی تمنا تھی کہ مدینہ طیبہ جاکر رخت سفر کھولدیں، اور جن کی سنت و شریعت اور حدیث کی ساری عمر خدمت کی اور ان کے دامن سے وابستہ ہے، انھیں کے قدموں میں بقیہ زندگی گذار دیں، ان کے محبوب شیخ و مرشد (مولانا خلیل احمد صاحبؒ) کی بھی یہی آرزو و کوشش تھی، اللہ نے ان کو کامیاب کیا، اب جبکہ ضعف بصارت اور مختلف قسم کی معذوریوں کی وجہ سے درس و تدریس، اور براہ راست مطالعہ اور تصنیف کا موقعہ بھی نہیں رہا تھا، اس تمنا میں مزید شدت و قوت پیدا ہو گئی، بالآخر ۱۸ ربیع الاول ۹۳ھ (۲۳ اپریل ۷۳ء) کو اس نیت سے حجاز کے لئے روانہ ہو گئے گویا بقول اقبالؒ ؎

ایں پیری رہِ یثرب گرفتم — نوا خواں از سرورِ عاشقانہ
چو آں مرغے کہ در صحرا سرِ شام — کشاید پر بفکرِ آشیانہ

یہ وہی سفر تھا جس کے بعد مستقل قیام ہوا، اور شیخ نے ہجرت کی نیت فرمائی۔[1]

---

[1] آپ بیتی ۷ ص ۱۰

سہ شنبہ ۲۶ ربیع الاول ۹۳ھ (یکم مئی ۷۳ء) کو بمبئی سے روانگی ہوئی، مجمع تعداد و شمار سے افزوں تھا، دہلی کے ہوائی اڈہ پر جماعت کے لوگوں نے اتار لیا، لوگوں نے زیارت کی، اور بہت سے لوگوں نے بیعت کا شرف حاصل کیا، ۲۷ ربیع الاول ۹۳ھ (۲ مئی ۱۹۷۳ء) کو مکہ معظمہ پہونچ گئے، اور عمرہ سے فراغت حاصل کی، اس سفر میں مکہ معظمہ میں بھائی سعدی[1] کے گھر، اور مدرسہ صولتیہ کے دیوان میں قیام رہا، مکہ معظمہ کے قیام میں طبیعت ناساز رہی، مدینہ پاک جانے کا تقاضہ دوسرے ہی دن سے شروع ہو گیا تھا، مگر خدام و رفقاء کی رائے نہ ہوئی، بالآخر ۱۹ مئی ۷۳ء کو بذریعہ کار مدینہ طیبہ روانہ ہوئے، اور اگلے دن ½۱۲ بجے مدرسہ شرعیہ پہونچ گئے، اور وہاں مستقل قیام ہو گیا، جو باب النساء کے بالمقابل مسجد شریف سے مشکل سے چند قدم کے فاصلہ پر ہے، اس لئے مسجد نبوی میں حاضری اور نمازوں میں شرکت آسان تھی،

---

[1] بھائی سعدی کا پورا نام محمد سعید رحمۃ اللہ ہے، وہ مولانا محمد سعید ناظم اول مدرسہ صولتیہ کے پوتے حکیم محمد نعیم صاحب کیرانوی مکی کے بیٹے اور مولانا محمد سلیم صاحب ناظم ثانی مدرسہ صولتیہ کے بھتیجے ہیں، حکومت سعودیہ میں مکہ معظمہ میں وہ کاتب العدل (رجسٹرار) کے عہدہ پر فائز ہیں، اس وقت مکہ معظمہ کے عمائد و رؤساء میں ہیں، اسی سنہ (۹۳ھ) سے وفات تک مکہ معظمہ میں انھیں کا وسیع اور شاندار دولت خانہ حضرت کے رفقاء کی مستقل قیام گاہ رہا، وہ پروفیسر حافظ محمد عثمان صاحب کاندھلوی (سابق صدر شعبۂ ریاضی پشاور یونیورسٹی) کے نواسے بھی ہیں، جو حضرت شیخ کے رشتہ کے ماموں تھے، اور مولوی مصباح الحسن صاحب کاندھلوی مرحوم کے داماد ہیں، حضرت کے ساتھ انھوں نے فرزندانہ تعلق و سعادت کا اظہار کیا، حضرت شیخ کو بھی ان کے ساتھ پدرانہ و بزرگانہ شفقت تھی، حضرت شیخ اور ان کے قافلہ کے سلسلہ میں انھوں نے ہمیشہ سنت عثمانی رض کی تقلید کی، اور یہ ان کی خاندانی سعادت اور وراثت ہے

شیخ پہلے اقدام عالیہ میں حاضر رہتے، لیکن اس مرتبہ پاؤں کی معذوری کی وجہ سے مشرقی دیوار کے برابر باب جبریل سے ملحق جو چبوترہ ہے، اس کو مستقر بنایا۔

مدینہ کا نظام الاوقات

مدینہ کے قیام میں صبح کی نماز کے بعد مجلس ذکر ہوتی، پھر شیخ تھوڑی دیر آرام فرماتے اور رفقاء ناشتہ کرتے، بیدار ہونے کے بعد کچھ علمی اور تصنیفی مشاغل رہتے، یا ڈاک لکھوائی جاتی، ظہر، عصر، مغرب، عشاء سب مسجد شریف میں ادا ہوتی، عصر بعد مدرسہ علوم شرعیہ کے صحن میں عام مجلس ہوتی، جس میں اکثر کوئی کتاب پڑھی جاتی، اس دوران خاص زائرین اور ممتاز علماء جو ملاقات کے لئے آتے ان سے تعارف و ملاقات ہوتی، عشاء کے بعد عام دستر خوان بچھتا، سہارنپور کے برخلاف جہاں دوپہر کا کھانا اصل تھا جس میں شیخ بڑے اہتمام سے شرکت فرماتے، اور رات کا کھانا برائے نام ہوتا جس میں شیخ کی شرکت ضروری نہ تھی، یہاں مدینہ طیبہ کے قیام میں اصل کھانا رات کا تھا جس میں کسی عزیز مہمان کی غیر حاضری حضرت شیخ کو بہت محسوس ہوتی، راقم سطور کو اس سے بہت واسطہ پڑ چکا ہے، اس لئے وہ بالعموم مدینہ طیبہ میں کسی دوسری جگہ رات کی دعوت قبول نہ کرتا، اس وقت حضرت شیخ کی طبیعت مبارک پورے نشاط و انبساط پر ہوتی، عزیز مہمانوں کی خاطر داری اور ان کی نگہداشت اسی طرح ہوتی جیسی دوپہر کے دستر خوان پر سہارنپور میں، مہمانوں کے کھانے کا انتظام زیادہ تر صوفی محمد اقبال صاحب[1]

---

[1] صوفی محمد اقبال ہوشیارپوری ان خوش قسمت افراد میں ہیں جن پر حضرت شیخ کی نظر خاص رہی، اور انھوں نے بھی سعادت و خدمت کا بڑا حصہ پایا، اور اعتماد و اختصاص، اور اجازت خاص سے سرفراز ہوئے، اور اخیر وقت تک جوارِ رسول ﷺ، اور اپنے شیخ کے دامن عاطفت میں رہے، شیخ کے ملفوظات و افادات، اور حالات و مبشرات پر ان کے متعدد رسالے ہیں، جو چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔

کے ذمہ ہوتا، ڈاکٹر اسماعیل[1] مرچنٹ اور دوسرے خدام اہل تعلق بھی اسی میں پیش پیش رہتے، مسجد نور میں (جو مدینہ پاک کا تبلیغی مرکز ہے) اہم اجتماعات میں شرکت فرماتے، اور بقیع کی زیارت کو بھی جاتے۔

حجاز کے مخصوص محبین و خدام

حجاز سے اس روحانی یا قلبی تعلق کے ماسوا (جس کا ہم پلہ اور ہمسر کوئی تعلق نہیں) شیخ اور ان کے خاندان کا اس پاک و مقدس سرزمین سے ایک طرح کا وطنی اور عزیزانہ تعلق تھا، اور وہ ان کے لئے وطن ثانی کی حیثیت رکھتی تھی، مکہ معظمہ میں مولانا محمد سعید صاحب کیرانوی ناظم اول مدرسہ صولتیہ کا خاندان تھا جس سے برادری اور عزیزداری کے تعلقات تھے، مولانا محمد سلیم صاحب مرحوم ناظم مدرسہ صولتیہ ایک عزیز اور معزز فرد خاندان تھے، اور مدرسہ صولتیہ کے دیوان میں (جہاں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کے قیام کی ایک بڑی مدت گذری تھی) عرصہ تک شیخ کا بھی قیام رہا، مولانا محمد سلیم صاحب کے صاحبزادہ مولوی مسعود شمیم صاحب (حال ناظم مدرسہ صولتیہ) اور مولانا کے برادر زادہ الحاج محمد سعید رحمۃ اللہ (معروف بہ سعدی) خاندان کے بچوں کی طرح تھے، حکیم محمد یامین صاحب جو عرصہ سے مدرسہ میں مقیم اور مکہ کے مہاجر ہیں، رشتہ کے ماموں ہوتے تھے، یہاں مدرسہ میں پہونچکر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے سہارنپور سے کاندھلہ یا دہلی چلے گئے۔

---

[1] ڈاکٹر اسماعیل مرچنٹ حضرت کے مخلص خادم، اور معالج خاص رہے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو حضرت شیخ کی خدمت کے لئے دوسرے مقامات کے قیام اور تعلق ملازمت سے یکسو کرکے گویا حضرت شیخ کی خدمت ہی کے لئے مدینہ میں رکھا تھا، حضرت شیخ کے خاص مزاج داں، اور صحت کے نشیب و فراز سے سب سے زیادہ واقف تھے۔

یہیں مکہ معظمہ میں حضرت کے خادم خاص اور مجاز باختصاص ملک مولوی عبدالحفیظ کا بھی گھر تھا، جن کو اپنی فطری سعادت مندی، اطاعت شعاری، اور مزاج شناسی کی وجہ سے حضرت کے یہاں وہ مقام حاصل تھا، جو کم ارادت مندوں کو حاصل ہوسکا، حضرت کی عربی تصنیفات خصوصًا "اوجز المسالک" اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ کی شہرۂ آفاق شرح ابوداؤد "بذل المجهود" اور دوسرے عربی رسائل کی طباعت کے اہتمام اور ان کی اشاعت کے لئے مکہ معظمہ میں مستقل مکتبہ باب العمرہ پر مکتبۂ امدادیہ کے نام سے، اور طباعت کے لئے مدینہ طیبہ میں مستقل مطبع مطابع الرشید کے نام سے قائم کرنے کی وجہ سے ان کو حضرت کی ایسی مسرت وابتہاج اور ایسی دلی دعائیں حاصل ہوئیں، جو بڑے مجاہدوں اور ایثار وقربانی کے بعد یاران باختصاص کو حاصل ہوتی ہیں، افریقہ اور ہندوستان کے سفر میں (جن کا ذکر آئندہ باب میں آرہا ہے) وہ حضرت کے رفیق خاص، خاص موقعوں پر دعاء کرانے والے، جمعہ کے امام وخطیب، اور حضرت کے ترجمان رہتے، ان کے والد محترم ملک عبدالحق صاحب عرصہ سے مکہ معظمہ ہجرت کرکے آگئے تھے، اور یہاں انھوں نے کارخانہ قائم کرلیا تھا، ان کے سب صاحبزادے خدمت کے لئے، اور ان کی گاڑیاں اور وسائل حضرت کی راحت کے لئے وقف تھے۔

حضرت کے بعد کی مکہ معظمہ میں قیام گاہ بھائی سعدی کا وسیع وشاندار محل تھا، جس کے قریب ہی متعدد ہندوستانی وپاکستانی اہل تعلق آباد ہیں، جن میں ہمارے عزیز خاص مولوی ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جہاں سالہا سال سے اس عاجز کے رفقاء، اور اعزہ کا قیام رہتا ہے، اور وہ بھی حضرت سے نیازمندانہ اور خادمانہ تعلق رکھتے ہیں، حضرت کی بھی ان کے پورے گھر پر شفقت تھی، ان کا گھر بھی بھائی سعدی کے

گھر سے چند گز کے فاصلہ پر ہے، متصل ہی محلہ کی مسجد ہے، جس کو بھائی سعدی نے خاص توجہ واہتمام سے وسیع و مکمل کیا ہے، اسی نسبت سے وہ "مسجد الرحمۃ" کے نام سے مشہور ہے، یہاں سے تھوڑے ہی فاصلہ پر حائر کا محلہ ہے، جہاں تبلیغی جماعت کا خاص مرکز، مسجد اور مہمان خانہ ہے، اور وہ ہندوستانی، پاکستانی رفقاء جماعت کی خاص فرودگاہ ہے۔

جہاں تک مدینہ طیبہ کا تعلق ہے، وہاں سے حضرت شیخ کا تعلق اور بھی گہرا ہے، یہاں اپنے شیخ و مرشد حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کے ساتھ شیخ نے مہینوں قیام کیا ہے، اور شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کے برادر بزرگ مولانا سید احمد صاحب فیض آبادی کی شفقتوں، اور میزبانیوں کا لطف اٹھایا ہے، جو سالہا سال تک گنگوہ میں ان کے والد ماجد مولانا محمد یحییٰ صاحب کے رفیق خاص اور شریک دسترخوان رہے ہیں، مولانا سید احمد فیض آبادی کے بعد ان کے اور مولانا مدنی کے برادر خورد مولانا سید محمود احمد صاحب خاص تعلق رکھتے تھے، اور انھیں کی وجہ سے مدرسہ علوم شرعیہ شیخ کی مستقل قیام گاہ قرار پایا، مولانا سید محمود صاحب کو شیخ سے اتنا تعلق اور محبت تھی، کہ اپنے باغ کے آم بڑے اہتمام سے ان کے لئے ہندوستان بھیجنے کا انتظام کرتے، اگر وہ نہیں پہونچ سکتے تھے، تو ان کا شیرہ ہی نکال کر بھیج دیتے، حضرت شیخ نے بھی ان تعلقات کا ایسا پاس کیا کہ ان کی وفات کے بعد ان کا رسالہ "الحظ الاوفر فی الحج الأکبر" بڑے اہتمام سے شائع کیا، اور اس ناچیز سے اس پر مقدمہ اور تعارف لکھوایا، مولانا سید محمود صاحب کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادہ مولانا سید حبیب (حال مدیر الاوقاف) نے جو امیر مدینہ کے خاص مشیر و معتمد اور مدینہ طیبہ کے اعیان خاص میں ہیں، ان کی نیابت کی، اور اعزاز و اکرام

کے ساتھ مدرسہ شرعیہ میں قیام کی سہولتیں مہیا کیں۔

مدینہ طیبہ کے قیام میں شیخ کے سفروں کی تنظیم، ان کو طے کرانے، اور ان کے لئے ہر طرح کے انتظامات کرنے، نیز قیام کے دوران بھی ضبط و نظم قائم کرنے میں قاضی عبدالقادر صاحب کا خاص حصہ رہتا تھا، جو محض شیخ کی خدمت اور انتظام کے لئے اپنے وطن جہاوریاں پاکستان سے آکر پورے پورے ماہ قیام کرتے، اور صرف اہم بیرونی تبلیغی اجتماعات کے لئے عارضی طور پر جاتے، اسی طرح حجاز کی جماعت تبلیغ کے امیر مولانا محمد سعید خاں بھی خادمانہ اور مخلصانہ تعلق رکھتے تھے، اور مسجد نور کے قیام کے علاوہ بھی جو ان کی خاص قیام گاہ ہے، اپنے کو ایک طرح کا میزبان اور ذمہ دار سمجھتے، اسی طرح مدینہ طیبہ کے خاص اہل تعلق اور حاضر باشوں میں حاجی انیس احمد صاحب (فرزند خان بہادر حاجی شیخ رشید احمد صاحب میرٹھی) مولانا آفتاب عالم صاحب (فرزند مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی) عزیز گرامی سید حسن عسکری طارق، قاری عباس صاحب بخاری وغیرہ تھے، طارق صاحب کو حضرت شیخ کی خصوصی شفقت اور قرب حاصل تھا۔[1]

افسوس ہے کہ ممالک عربیہ ہی نہیں پوری نئی نسل کے ذوق و نقطۂ نظر کے بدل جانے، اور تصوف کے خلاف مختلف جماعتوں کی طرف سے غلط فہمیاں اور بدگمانیاں پیدا کر دینے کی وجہ سے عرب فضلاء، جامعات و کلیات کے نوجوان طلبہ، اور باہر کے

---

[1] مدینہ طیبہ کے خصوصی خدام میں مولوی عبدالقدیر حیدرآبادی، مولوی حبیب اللہ، مولوی نجیب اللہ، مولوی اسماعیل بدات اور حکیم عبدالقدوس صاحب، افراد خاندان اور بچوں میں مولوی شاہد اور حافظ جعفر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

آنے والے عرب حجاج وزائرین نے اس زریں موقعہ سے بہت کم فائدہ اٹھایا، کہ ایک متبع سنت محدث جلیل، عالم ربّانی، اور قوی النسبت شیخ مسجد نبوی کے زیر سایہ اور صاحب مسجد کے زیر قدم خدمت و تربیت کے لئے سب کشتیاں جلاکر مستقل پڑا ہوا ہے، کبھی کبھی جب باہر کے کسی عالم سے اس جلیل القدر شخصیت کے تعارف کی نوبت آتی، تو وہ ملاقات کا اشتیاق ظاہر کرتے اور حاضری دیتے ان میں ناچیز کو ان دو۲ تین۳ حضرات کی رہنمائی کا شرف حاصل ہوا (استاذ اکبر شیخ عبد الحلیم محمود شیخ الجامع الأزہر، استاذ محمد المبارک سابق عمید کلیۃ الشریعۃ دمشق وسابق وزیر شام، علامہ الحبیب بلخوجہ محدث ومفتی تونس) اور بھی کچھ ممتاز علماء عرب ہوں گے، جو جامعہ اسلامیہ، مدینہ منورہ کی مجلس استشاری اور مجلس اعلیٰ میں شرکت کے لئے آتے تھے، اور راقم سطور کو رکنیت کی وجہ سے ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا موقعہ ملتا تھا۔

حضرت شیخ کی قانونی کفالت، ٹکٹ کا بھیجنا وغیرہ امور مستقلا الحاج محمد سعید رحمۃ اللہ (بھائی سعدی صاحب) کے ذمہ رہتا تھا، اس مرتبہ شیخ کے آنے کے بعد سے ویزہ میں توسیع کی خاص کوشش کی اور شیخ محمد صالح القزّاز امین عام رابطۂ عالم اسلامی کے ذریعہ سلسلہ جنبانی شروع کی، مکہ کے مشہور عالم سید محمد علوی مالکی نے بھی اس کوشش میں حصہ لیا، یہ کوششیں جاری تھیں کہ ۱۶ جمادی الاولی ۱۳۹۳ھ (۱۷ جون ۱۹۷۳ء) کو اچانک اطلاع ملی کہ اقامہ بن گیا ہے، لوگوں نے اس پر بڑا تعجب کیا کہ یہاں دس۱۰ دس۱۰، پندرہ۱۵ پندرہ۱۵ برس سے لوگ پڑے ہوئے ہیں، مگر اب تک باوجود بڑوں بڑوں کی سفارش کے نہیں بنا، یہ بھی خبر تھی کہ شیخ کا اقامہ براہ راست ملک فیصل نے بغیر مجلس کے

خود ہی منظور کر کے بھیج دیا، بہر حال اس میں شیخ صالح قزاز، اور شیخ محمد علوی کی مساعی جمیلہ کو دخل ہے، اقامہ تو ضابطہ کی کاروائیوں کے بعد بہت تاخیر سے ملا جس کی ابتداء ۲۳ رجادی الثانیہ ۱۳۹۳ھ سے ہوئی، ۲۵ راگست ۱۹۷۳ء کو شیخ پاکستان کے ارادہ سے جہاں رائے ونڈ کا تبلیغی اجتماع ہونے والا تھا، مکہ معظمہ کے لئے روانہ ہوئے، مگر یہ سفر نہیں ہوسکا، اس عرصہ میں رمضان شروع ہوگیا، شیخ مولانا محمد سلیم صاحب کے یہاں کھانے سے فراغت کے بعد سیدھے تنعیم جاتے، وہاں سے عمرہ کا احرام باندھ کر طواف وسعی سے فارغ ہوکر بھائی سعدی کے یہاں جاتے، وہیں آرام فرماتے، پندرہ ۱۵ رمضان کی تراویح پڑھ کر شیخ مدینہ کے لئے روانہ ہوئے کہ جو رمضان حجاز میں ہوتا تھا، اس کا نصف اول مکہ میں عمروں کے شوق میں اور نصف آخر مدینہ پاک میں مسجد نبوی میں اعتکاف کی طلب میں گذرتا تھا، اس مرتبہ شیخ کا معتکف باب سعود سے ذرا آگے چل کر تھا، چھبیسویں ۲۶ رمضان کی شب میں اسرائیلی جنگ کی بڑی سخت خبریں سننے میں آئیں، اس کے لئے ختم بخاری کا اہتمام کیا گیا، رات کے ریڈیو ہی پر جنگ کے بند ہونے کا اعلان ہوگیا۔

ہندوستان و پاکستان کے سفر

رمضان کے بعد سے شدت سے بخار کا سلسلہ شروع ہوا، اس کی وجہ سے اس سال حج میں شرکت نہ ہوسکی، اس سال مولانا انعام الحسن صاحب نے اپنے رفقاء کے ساتھ حج کیا۔

اب اقامہ کی وجہ سے شیخ کا حجاز کا قیام اصل تھا، اور دوسری جگہ کا عارضی، کہ چھ ۶ ماہ سے زیادہ صاحب اقامہ کو باہر رہنے کی اجازت نہیں، ان میں اقامہ منسوخ ہوجائے گا' مولوی ہارون مرحوم کے انتقال کی وجہ سے' اور بعض دوسرے مسائل وضروریات کی بناء پر اہل تعلق کا تقاضہ تھا کہ حضرت شیخ ہندوستان تشریف لائیں، بعض اہل خلوص[1] کا مشورہ تھا،

[1] شیخ نے اپنی آپ بیتی میں اس سلسلہ میں راقم سطور اور مولانا انعام صاحب کا نام لیا ہے۔

کہ اگر ہندوستان تشریف لانا ہے تو پھر رمضان سہارنپور میں گذرنا چاہیئے تاکہ اس قیام سے اجتماعی اور دور رس فائدہ اٹھایا جا سکے، پاکستانی احباب کی مساعی سے اس مرتبہ پاکستان کا ویزہ مل گیا، اس بناء پر ۳ جمادی الاولیٰ ۹۴ھ (۲۴ مئی ۷۴ء) کو مدینہ پاک سے مکہ کے لئے روانگی ہوئی، راقم سطور بھی ساتھ تھا، بعد مغرب روانگی ہوئی، اور ڈاکٹر اسماعیل صاحب (جو اس زمانہ میں بدر کے ڈاکٹر تھے) کی درخواست پر تقریباً بیس گھنٹے بدر میں قیام رہا، شب کو مسجد عریش کے میدان میں سوئے، بعد عصر بدر سے روانگی ہوئی، اور شب میں مدرسہ صولتیہ پہونچے۔

۲۲ جون ۷۴ء کو شیخ جدہ سے کراچی کے لئے روانہ ہوئے، اور ۳ بجکر ۲۵ منٹ پر کراچی پہونچ گئے، وہاں مجمع بہت تھا، ڈھائی تین ہزار کا اندازہ ہے، ظہر کی نماز کی مسجد میں پڑھی، کراچی میں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے مدرسہ، اور مولانا محمد یوسف صاحب بنوری کے مدرسہ بھی جانا ہوا، اسی قیام میں مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی تھانوی سے ملاقات ہوئی، جمعہ کو رائے ونڈ کے لئے روانگی ہوئی، جہاں مشتاقین کا بڑا ہجوم تھا، رائے ونڈ سے ڈھڈیاں جانا ہوا، وہاں بھی بڑا ہجوم تھا، چونکہ دہلی کے ٹکٹ کراچی سے تھے، اس لئے کراچی جانا پڑا، ۱۴ جولائی کو کراچی سے دہلی پہونچنا ہوا، اور ایک دن دہلی قیام کے بعد سہ شنبہ ۱۶ جولائی کو سہارنپور پہونچ گئے، مشتاقان دید دور دور سے سفر کر کے زیارت کے لئے آتے رہے۔

اس قیام ہندوستان میں ایک سفر میوات کا بھی ہوا اور اگست کے تبلیغی اجتماع سہارنپور میں بھی شرکت ہوئی۔

اس سال (۱۳۹۴ھ) کا رمضان اسی دھوم دھام کے ساتھ دار جدید کی مسجد

میں ہوا، لوگوں کا شروع سے اندازہ تھا کہ اس سال مجمع بہت ہوگا، چنانچہ ایسے ہی ہوا، شروع رمضان میں آٹھ ۹ نوسو کا اندازہ تھا، اور آخر رمضان میں اٹھارہ ۱۸ سو تک پہونچ گیا[1] تراویح میں تین ۳ پارے روز سننے کا معمول تھا تاکہ ہر عشرہ میں ایک قرآن ہو سکے، اس سال مولوی خالد (برادر خورد مولوی سلمان صاحب) نے قرآن شریف سنایا، راقم سطور کی بھی معمول کے مطابق دو دن کے لئے حاضری ہوئی، میری حاضری پر حضرت کا بعد تراویح افطاری کا معمول بہت اہتمام سے ہونے لگتا۔

رمضان میں بھی شیخ کی طبیعت کچھ خراب رہی، اور امراض بڑھتے ہی چلے گئے، ۱۵ ذی قعدہ ۱۳۹۴ھ (۳۰ نومبر ۱۹۷۴ء) کو سہارنپور سے سفر حجاز کی روانگی شروع ہوئی، ہجوم اتنا تھا کہ کچے گھر سے دار الطلبہ تک آدمی ہی آدمی تھے، ۱۸ ذی قعدہ ۱۳۹۴ھ (۳ دسمبر ۱۹۷۴ء) کو دہلی سے بذریعہ طیارہ بمبئی اور ۶ دسمبر ۲۱ ذی قعدہ کو بمبئی سے کراچی روانگی ہوئی، اور اگلے دن بخیریت مکہ معظمہ پہونچ گئے، ایام حج کے قرب کی وجہ سے مکہ میں ہجوم بہت تھا، اس لئے زیادہ تر قیام مدرسہ صولتیہ میں رہا، ۷ ذی الحجہ مستقلاً سعدی صاحب کے یہاں منتقل ہوگئے، حج سے فراغت کے بعد ۱۵ ذی الحجہ (۲۹ دسمبر) کو رات کو بدر میں قیام کر کے اگلے دن مدینہ طیبہ پہونچے، اور حسب معمول مدرسہ علوم شرعیہ میں قیام ہوگیا۔

۱۳۹۵ھ میں پھر ہندوستان کا سفر پیش آیا جس میں کچھ اشارۂ غیبی کو بھی دخل تھا[2]، شیخ نے اس بناء پر رمضان ہندوستان میں گذارنے کا ارادہ کر لیا، اور ۲۸ رجب ۹۵ھ (۶ اگست ۷۵ء) کو مکہ مکرمہ سے روانگی ہوئی، اور اسی روز بمبئی پہونچ گئے،

---

[1] تفصیل پچھلے باب میں گذر چکی ہے۔ [2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، آپ بیتی ج ۷ ص ۱۰۶

بمبئی سے چل کر ۹ راگست ۷۵ء یکم شعبان ۹۵ھ کو نظام الدین پہونچنا ہوا، ۱۲ راگست ۷۵ء ۳ رشعبان ۹۵ھ کو بخاری شریف کا ختم ہوا، اول مسلسل بالاولیۃ کی حدیث پڑھی گئی، اس کے بعد مولوی یونس صاحب نے بخاری کی آخری حدیث پڑھی، متن دونوں کا شیخ نے پڑھا، یکم رمضان المبارک دوشنبہ ۸ ستمبر کو شیخ اپنے معمول کے مطابق عصر کے بعد ہی دار جدید میں پہونچ گئے۔

عشرۂ اولیٰ میں مولوی زبیر نے، وسطیٰ میں مولوی خالد نے، اور آخر میں مولوی سلمان صاحب نے قرآن شریف ختم کیا، سہارنپور سے چل کر کاندھلہ، پانی پت، سرہند، ہوتے ہوئے بذریعہ کار رائے ونڈ پہونچے، اور وہاں کے تبلیغی اجتماع میں شرکت کرکے ڈھڈیاں، راولپنڈی، اور وہاں سے بذریعہ ہوائی جہاز کراچی پہونچے، اور وہاں سے سیدھے جدّہ کے لئے روانہ ہو گئے، مکہ معظمہ میں عمرہ سے فارغ ہوئے، اور قیام فرمایا، اور مناسک حج ادا کئے[1]، اس سال مولانا انعام الحسن صاحب بھی حج میں شریک تھے، حج سے فراغت کے بعد مدینہ طیبہ واپسی ہو گئی۔

۱۳۹۶ھ میں پھر ہندوستان کا سفر پیش آیا، جو ۱۴ رجمادی الثانیہ ۱۳۹۶ھ (۱۲ رجون ۷۶ء) کو شروع ہو کر ۲۲ رذی قعدہ ۹۶ھ ۱۵ رنومبر ۷۶ء کو اختتام پذیر ہوا، اس سفر میں بھی رمضان المبارک دار الطلبہ جدید میں گذرا، عشرۂ اولیٰ میں مولوی سلمان صاحب نے، ثانیہ میں مولوی خالد نے، اور ثالثہ میں مولوی زبیر صاحبزادہ مولانا انعام الحسن صاحب نے قرآن شریف ختم کیا، بیرون ممالک سے بہت سے ممتاز اہل تعلق آئے تھے، راقم سطور اور اس کے رفقاء بھی تین شب کے لئے حاضر ہوئے۔

رمضان سے فارغ ہو کر کراچی ہوتے ہوئے جدہ کی روانگی ہوئی، عمرہ، ہجوم اور

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، آپ بیتی ۷

بخار کی وجہ سے مشکل تھا، اس لئے جدہ سے براہ راست مدینہ طیبہ روانگی ہوگئی۔

۲۴ مئی ۷۷ء کو سعدی صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ بسلسلۂ تابعیہ جو درخواست جلالۃ الملک کو بھیجی گئی تھی، اس کی منظوری کی اطلاع آگئی ہے، کچھ عرصہ کے بعد اس کی تکمیل ہوگئی، ۲۱ جون ۷۷ء کو تابعیہ شیخ تک پہونچ گیا، اس پر انھوں نے ہجرت کی نیت کرلی، تابعیہ ملنے کے بعد جو مکتوب اس عاجز کے نام تحریر فرمایا گیا ہے، اس میں تحریر ہے:

"تابعیہ ملنے کے بعد بجائے مسرت کے فکر غالب ہوگیا، کہ معلوم نہیں وطنیت کے آداب کی رعایت کرسکوں گا یا نہیں، دعا فرمائیں، اللہ تعالیٰ یہاں کے آداب کی رعایت کرادے۔"[1]

مکتوب پر پہلی مرتبہ شیخ الحدیث مہاجر مدنی تحریر ہے۔

تابعیہ مل جانے کے بعد جمادی الثانیہ ۱۳۹۷ھ میں پھر ہندوستان کا سفر پیش آیا، اور کراچی، دہلی ہوتے ہوئے سہارنپور پہونچنا ہوا۔ ۱۰ شعبان، ۲۸ جولائی کو مسلسلات بخاری کا ختم ہوا، اس سال ۹۷ھ کے رمضان میں ہجوم پہلے سے بھی بڑھا ہوا تھا، پہلا اور تیسرا عشرہ مولوی سلمان کا تھا، اور دوسرا مولوی خالد کا، ذی قعدہ ۹۷ھ اکتوبر ۷۷ء میں حجاز واپسی ہوگئی، جدہ سے براہ راست مدینہ طیبہ روانگی ہوئی، اس قیام میں خدام اور احباب نے بہت سے مبارک خواب دیکھے اور بشرات ہوئے،[2] اس سال سہارنپور کا رمضان ملتوی کیا گیا، اہل تعلق کو اطلاع کردی گئی کہ رمضان اپنی اپنی جگہ کریں۔[3]

۱۳۹۸ھ اور ۱۳۹۹ھ کا رمضان بھی ہندوستان، سہارنپور دارالطلبہ جدید کی مسجد میں سالہائے ماسبق کی طرح اسی شان سے ہوا، جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، ۱۳۹۹ھ

---

[1] مکتوب مورخہ ۱۹ جون ۷۷ء [2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو آپ بیتی نمبر ۷ صفحہ ۲۳۳-۲۳۴ نیز صفحہ ۲۴۳-۲۴۴
[3] منقول و مقتبس از آپ بیتی نمبر ۷ باختصار۔

کے رمضان میں تقریباً ایک ہزار معتکف ہو گئے تھے، اس لئے جگہ کی تنگی رہی، اور ایک عشرہ سے زیادہ کسی کو اعتکاف کی اجازت نہیں ملی، سالہائے ماسبق کے برخلاف اس مرتبہ صرف مولوی سلمان صاحب نے تراویح میں قرآن شریف سنایا۔

۱۴۰۰ھ (جولائی ۱۹۸۰ء) کا رمضان پاکستانی خدام، اہل تعلق کے اصرار اور قدیم خواہش و تمنا کی بناء پر فیصل آباد (سابق لائل پور) میں ہونا طے پایا، اس قیام کے خاص داعی و منتظم و ذمہ دار مولانا مفتی زین العابدین صاحب جو حضرت کے ممتاز مجازین و تبلیغی جماعت کے اہم ذمہ داروں میں تھے، پاکستانی خدام، تبلیغی جماعت کے کارکنوں، حضرت رائے پوری سے تعلق رکھنے والوں، اور مدارس عربیہ کے اساتذہ و فضلاء نے اس موقعہ کو غنیمت بلکہ نعمت سمجھا، اور اس سے پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، قیام دار العلوم فیصل آباد اور اس کی مسجد میں تھا، یہ رمضان پوری مشغولیت، دینی برکتوں اور روحانی فیوض کے ساتھ گذرا، معمولات کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ:۔

عشاء کی اذان سے نصف گھنٹہ قبل شیخ کی خصوصی مجلس ہوتی، علی العموم شیخ مراقب تشریف فرما رہتے، مجمع بھی حلقہ بنا کر مراقب ہوتا، تھوڑی دیر اس سکوت و مراقبہ کے بعد نئے آنے والوں کی بیعت کا سلسلہ شروع ہوتا (جن کی تعداد روزانہ تقریباً ۲۰-۳۰ ہوتی) حضرت کی طرف سے مولوی احسان صاحب استاد مدرسہ عربیہ رائے ونڈ لاہور، بیعت سے پہلے ضروری اعلانات کرتے کہ حضرت شیخ آہستہ آہستہ بیعت کے کلمات ارشاد فرماتے، اور مولوی احسان صاحب بآواز بلند کہتے جاتے، سارا مجمع بیک زبان ان کی اقتداء میں بیعت کے کلمات اپنی زبان سے ادا کرتا، اس سال تراویح میں صرف سوا پارہ قرآن ہوتا تھا، تراویح کے بعد سورۂ یٰس کا ختم ہوتا، پھر دعا، پھر کتاب

پڑھی جاتی، شیخ کا حجرہ بند ہو جاتا، اور لوگ انفرادی طور پر مشغول ہو جاتے، ظہر کی نماز کے بعد ختم خواجگان، دعاء ذکر کا حلقہ ہوتا، عصر کے بعد مجلس ہوتی جس میں مولوی معین الدین صاحب وہ کتابیں اور رسائل پڑھتے، جن کا رمضان میں معمول ہے، مجمع پر ایک کیفیت طاری رہتی، یہ سلسلہ افطار سے تھوڑی دیر قبل بند ہوتا۔

حضرت شیخ نے فیصل آباد سے سہارنپور آکر ناچیز کے نام ۱۹ ارشوال ۱۴۰۰ھ کو جو گرامی نامہ تحریر فرمایا، وہ یہاں نقل کیا جاتا ہے :۔

المخدوم المکرم حضرت مولانا الحاج ابوالحسن علی میاں زاد مجدہم

بعد سلام مسنون، آپ حضرات کے اعذار کے باوجود خط کا انتظار رہتا ہے، میں فیصل آباد میں تو اچھا خاصہ رہا، وہاں سے دلّی بھی اچھی طرح آگیا لیکن سہارنپور آکر لب سر بلکہ لبِ گور ہوں، چوبیس ۲۴ گھنٹے چارپائی پر سوار رہتا ہوں، نہ ملنا نہ جلنا، نماز بھی گھر پڑھتا ہوں، بسا اوقات خیال آوے کہ لب گوری تو کہیں مجھے ہند نہیں لائی، کوکب پچاس نسخے اور "تاریخ دعوت وعزیمت" کا چوتھا حصہ بھی مل گیا، باوجود شدید اشتیاق کے ابھی تک نہیں سن سکا، طبیعت اتنی گری ہوئی ہے کہ نہ کھانا نہ پینا، دواؤں کے چند چمچے دن بھر کی غذا ہے، آپ کی پریشانیاں اور معذوری سن کر اور بھی قلق ہو رہا ہے، آپ کا یہ مشورہ کہ روانگی میں جلدی نہ کریں، بہت سوں کا مشورہ ہے، مولوی انعام کی بھی رائے یہ ہے کہ صدی شروع ہونے کا انتظار کرو، مگر طبیعت بہت گھبرا رہی ہے، یہ مجھے خوب یقین ہے کہ سہارنپور آمد کا تقاضہ آپ حضرات کو مجھ سے زائد ہوگا، مگر مجبوریاں ایسی سر پر ہیں، کہ مقدرات کے سامنے کچھ نہیں ہو سکتا، یہ خط بھی آپ کے رفع انتظار کے لئے لیٹے لیٹے لکھوا رہا ہوں، زندگی ہے تو ملاقات ہو ہی جائے گی۔

۱۹ ارشوال ۱۴۰۰ھ بقلم شاہد

بابِ ہفتم

انگلستان اور جنوبی افریقہ کے یادگار دعوتی و تربیتی سفر

انگلستان کا پہلا سفر

جون ۱۹۷۹ء میں حضرت شیخ پہلی بار انگلستان تشریف لے گئے، آپ کا یہ سفر آپ کے خلیفۂ مجاز مولوی یوسف متالا صاحب کی دعوت پر ہوا جنھوں نے "ہولکمب بری" (HOLCOMB BURY) لنکاشائر میں ایک بڑا دینی عربی مدرسہ دارالعلوم ہولکمب بری کے نام سے کئی سال پیشتر قائم کیا تھا، جو برطانیہ کا سب سے بڑا عربی مدرسہ اور تربیتی و دعوتی مرکز بن گیا ہے[1]، یہ مدرسہ بڑی شہری آبادی بولٹن سے ۸-۱۰ میل کے فاصلہ پر ہولکمب ہل (HOLCOMB HILL) نامی پہاڑی پر واقع ہے، یہ اصل میں ایک سینوٹیریم تھا، جو کسی وجہ سے چھوڑ دیا گیا، اس کو غالباً ۱۹۷۳ء میں ایک لاکھ پندرہ ہزار (۱۱۵) پونڈ کے عوض دارالعلوم کے لئے خرید لیا گیا۔

حضرت شیخ ۲۴ / جون ۱۹۷۹ء کو ۱۰½ بجے شب میں مانچسٹر کے ہوائی اڈہ پر اترے، قرب و جوار اور دور دراز سے سیکڑوں آدمی ان کے استقبال اور دیدار کے لئے

---

[1] مئی ۱۹۷۶ء کے سفر انگلستان میں راقم سطور نے مدرسہ کو دیکھا، اور وہاں ایک شب گذاری، اس مدرسہ کے بانی مولوی یوسف متالا، اور ان کے بھائی مولوی عبدالرحیم متالا پر حضرت شیخ کی بڑی توجہ اور شفقت تھی اور یہ دونوں بھائی شیخ کے بڑے مخلص خدام اور منتسبین میں ہیں۔

پہونچ چکے تھے آپ کو جس جگہ کار سے اتر کر اپنے کمرہ تک پہیوں والی کرسی کے ذریعہ آنا تھا، وہاں لوگ دورویہ قطاروں میں کھڑے ہوگئے، اوران کو آپ کی ایک جھلک دیکھنے کا موقعہ مل گیا، نماز عشاء کے بعد جبکہ آدھی رات کا وقت تھا، آپ نے لوگوں سے مصافحہ کیا، قریب قریب ایک گھنٹہ اس عمومی ملاقات میں لگ گیا، ½۱ بجے سو کر ۴ بجے فجر کے لئے اٹھ گئے، اس کے بعد سے باقاعدہ روزانہ کا پروگرام شروع ہوگیا، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

نماز فجر کی ادائیگی کے بعد اوراد و وظائف، ½۸ بجے ناشتہ، ½۱۰ بجے سے ½۱۱ تک تصوف و تزکیہ سے متعلق شیخ کی کسی کتاب سے تعلیم، ایک بجے دوپہر کا کھانا، ½۳ بجے ظہر کی نماز، نماز کے بعد مشائخ کا معمول بہ ختم، اور اجتماعی دعا، پھر ذاکرین کا ذکر بالجہر، اور بقیہ لوگوں کی درود و استغفار، اور تسبیحات میں مشغولیت، اس کے بعد ۶ بجے شام کی چائے، ½۶ بجے سے ½۷ تک مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ کا بیان، ۸ بجے نماز عصر، نماز کے بعد شام کا کھانا، پونے دس بجے مغرب کی نماز، اور نماز کے بعد نماز ہی کی جگہ میں قریب پون گھنٹہ کی شیخ کی عمومی مجلس، پھر ½۱۱ بجے عشاء کی نماز، شام کے ۶ بجے سے قرب وجوار کے لوگ بھی اپنی دکانوں، دفتروں اور کارخانوں وغیرہ سے چھٹی پاکر جوق در جوق مدرسہ میں پہونچ جاتے تھے، اس وقت بھی مجمع ہزاروں کا ہوتا تھا، شیخ کی ہدایت پر یہ مجمع کم سے کم ایک ہزار بار درود شریف کا ورد پورا کرلیتا تھا، حضرت نے پہلے ہی دن مجلس میں فرمادیا تھا کہ مجھے دیکھنے کے لئے جمع ہوجانے سے کچھ نہیں ملے گا، جو کچھ ملے گا، کچھ کرنے سے ملے گا، کم از کم اتنا ضرور کرو کہ ایک ایک ہزار بار درود شریف ہر شخص پڑھ لے، اس کے علاوہ اوقات میں بھی غیر ضروری باتوں سے احتراز کرتے ہوئے، دل و زبان کو زیادہ سے زیادہ اللہ کے ذکر میں مشغول رکھو، درود شریف پورے ہونے کے بعد ان لوگوں کی بیعت شروع ہوتی تھی،

جو حضرت سے بیعت ہونا چاہتے تھے، اس بیعت میں ایمان کی تجدید، گناہوں سے توبہ، اور آئندہ کے لئے اطاعت وراست بازی کا عہد واقرار، حضرت اپنی زبان سے بیعت کے الفاظ فرماتے، اور ملک عبد الحفیظ صاحب مائک پر دہرا دیتے۔

شیخ کا قیام انگلستان میں ۱۰-۱۱ دن رہا، انھیں میں سے درمیان کا ایک دن (پنجشنبہ ۲۸ جون) برطانیہ کے تبلیغی مرکز ڈیوزبری کے لئے رکھا گیا تھا، پورے قیام میں بس یہی ایک سفر دار العلوم سے باہر کا فرمایا گیا، صبح ۱/۲-۱۰ اگیارہ بجے روانگی ہوئی، ۱۲ بجے ڈیوزبری سے چند میل ورے باٹلی پہونچکر ذرا دیر کا قیام فرمایا، کیونکہ یہاں خواتین کے بیعت کا پروگرام تھا، آپ ڈیوزبری سے روانہ ہوئے تو وہاں مقیمین کا بیشتر حصہ بھی آپ کے آگے پیچھے اس طرح ہولیا، جیسے شمع کے ساتھ پروانے، ان کے علاوہ ڈیوزبری کے جوار سے جو آمد شروع ہوئی تو ہر طرف سے موٹریں ہی موٹریں آتی ہوئی نظر آتی تھیں، اور اس شعر کی تصدیق ہوتی تھی ؎

منعم بکوہ و دشت وبیاباں غریب نیست
ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت

ڈیوزبری کے علاوہ دار العلوم سے ۸-۱۰ میل پر اس علاقہ کے بڑے شہر بولٹن میں آپ ہی کے نام کی زکریا مسجد واقع ہے، یہاں اتوار یکم جولائی کو ۱۲ بجے دن سے ظہر تک کا پروگرام تھا، جہاں مفتی محمود حسن صاحب کا بیان اور خواتین کی بیعت عمل میں آئی، اور دوپہر کا کھانا بھی وہیں ہوا۔

۵ رجولائی ۱۹۷۹ء کی صبح ۹ بجے آپ مانچسٹر ایرپورٹ سے پرواز کر کے ۱۰ بجے کے قریب لندن کے ہیتھرو ایرپورٹ پر تشریف لائے، یہاں سے آپ کو ایرانڈیا کے ذریعہ

دہلی تشریف لے جانا تھا، ۲ بجے وہاں سے پرواز ہوئی اور آپ بخیر وعافیت دہلی پہونچے۔[1]

جنوبی افریقہ کا تاریخی رمضان

شیخ کے سن مبارک (حضرت شیخ کی اس وقت عمر ۸۶ سال تھی) ضعف وامراض اورعوارض دیکھتے ہوئے جن کا حال یہ تھا کہ نقل وحرکت تو بڑی چیز ہے، خود سے کروٹ بدلنے اور اٹھ کر بیٹھ جانے سے بھی معذور تھے، رمضان گذارنے کے لئے جنوبی افریقہ کے سفر کا ارادہ وفیصلہ خدا کی قدرت کی ایک نشانی، اور شیخ کی ایک کھلی کرامت تھی، جس کی توجیہ اس کے سوا کسی چیز سے نہیں کی جاسکتی کہ اللہ تعالےٰ کو اس دور دراز ملک کے (جو اسلامی ومغربی تہذیب کے تصادم وتقابل کی خاص جولان گاہ ہے، اور جہاں لاکھوں کی تعداد میں ہندوستانی نسل کے فرزندان توحید آباد ہیں، جنھوں نے ابھی تک دولت ومغربیت کے فتنوں کے باوجود اسلام کی امانت کو اپنے سینہ سے لگائے رکھا ہے، اور جن کی نسلوں میں دین کا احترام، اور اہل دین کی قدردانی برابر منتقل ہوتی رہی ہے) مسلمانوں کی کوئی ادا پسند آئی، اور ان کو فائدہ پہونچانے کے لئے پیاسوں کے کنویں پر جانے کے بجائے (جو وہ اپنے مقدور بھر کرتے رہے ہیں) کنویں کو پیاسوں کے پاس بھیج دیا، یہ طویل سفر متعدد اشارات غیبی اور مبشرات کی بناء پر کیا گیا، اس سفر میں دین کے شائقین وطالبین، اور اہل تعلق نے جس طرح پروانہ وار ہجوم کیا، اور جس طرح ملک کے دور دراز گوشوں کے لوگ ایک مقناطیسی کشش سے جمع ہوئے، اور انھوں نے

---

[1] یہ معلومات اختصار کے ساتھ مولوی عتیق الرحمٰن صاحب سنبھلی کے مضمون شائع شدہ "الفرقان" بابت ماہ اگست ۱۹۷۹ء رمضان المبارک ۱۳۹۹ھ سے ماخوذ ہیں، مولوی عتیق صاحب ان مجالس میں شریک اور حالات کے شاہد عینی تھے۔

اپنی شیفتگی اور گرویدگی کا اظہار کیا، اس نے تیرہویں صدی کے ثلث اول میں حضرت سید احمد شہیدؒ کے دوآبہ کے دورہ، اور سفر حج و ہجرت کے دور کی یاد تازہ کردی، وہاں کے طالبین کو جو دینی اور روحانی فوائد حاصل ہوئے ان سے ان مبشرات کی صداقت بھی ظاہر ہوگئی، خود حضرت شیخ اپنے ایک خادم کے نام ایک گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"بہت سے مبشرات و منامات کے پیش نظر امسال جنوبی افریقہ میں رمضان مبارک گذارنے پر اصرار اور زور احباب کی طرف سے ہو رہا ہے، معذوری وضعف و ناتوانی، اور بیماری کی وجہ سے میری ہمت ہوتی نہیں کہ وعدہ کروں، مگر مبشرات و منامات کی کثرت کی وجہ سے ہمت کرلی"

شیخ نے اس سفر کے داعی خاص و محرک مولوی یوسف تتلا صاحب سے کچھ شرطیں بھی کیں، ان میں سے ایک یہ تھی کہ میرا اور میرے رفقاء کا کرایہ میرے ذمہ ہوگا، اُن لوگوں کے علاوہ جن کا معمول ہمیشہ ہدیہ بھیجنے کا ہے، کوئی ہدیہ لینے کی اجازت نہیں، کھانے میں تکلف نہ کیا جائے، بہت سادہ کھانا ایک دو قسم کا ہو، دوستوں کو اس پر راضی کرلیں کہ وہ مجھے ایک دو دن کے لئے کہیں نہ لے جائیں، آنا جانا میرے بس کا نہیں، البتہ ذاکرین کو اکٹھا کریں جو اہتمام سے ذکر کریں، اس دوران افریقہ کے متعدد حضرات کی جانب سے سفر کا کرایہ اور دیگر اخراجات ادا کرنے کی پیش کش پہونچی لیکن آپ نے اسے منظور نہیں فرمایا، اور اپنا اور اپنے خدام کا کرایہ اپنی جیب خاص سے مرحمت فرمایا، جو کہ پاکستانی روپیہ کے حساب سے دو لاکھ روپیہ بنتا تھا۔

مولانا محمد سعید انگار صاحب کی درخواست پر جو اسلامک سنٹر ری یونین (RE UNION) کے ڈائرکٹر ہیں، آپ نے اسٹینگر (STANGER) جاتے ہوئے ری یونین کا

سفر منظور فرمالیا، اور شرط کردی کہ وہاں خانقاہوں کے قیام اور ذکر کے اہتمام کی کوشش کریں گے، آپ ۴ر شعبان ۱۴۰۱ھ (۶ر جون ۱۹۸۱ء) بروز ہفتہ مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے، مکہ مکرمہ میں عمرہ سے فارغ ہوئے، وہاں ۹-۱۰ دن قیام کر کے ۱۶ر جون، ۱۴ر شعبان کو جدہ سے ری یونین کے لئے روانہ ہوئے، ری یونین (REUNION) پہونچ کر وہی معمولات شروع کر دیئے گئے، جو رمضان میں ہوتے ہیں، ۳-۴ دن وہاں ٹھہر کر ۲۰ر جون شنبہ کی صبح سینٹ ڈینس (SAINT DENIS) سے سینٹ پییر (SAINT PIERRE) تشریف لے گئے، اگلے دن ۲۱ر جون کو ڈربن (DURBAN) کے لئے روانہ ہوئے، وہاں بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا گیا، آپ کی تشریف آوری سے قبل ہی لوگوں نے داڑھیاں رکھنا شروع کر دی تھیں، اور دینی جذبہ حیرت انگیز طور پر بڑھ چکا تھا، ۲۹ر شعبان کو آپ اپنے تمام مہمانوں کے ساتھ اسٹینگر[۱] (STANGER) کی جامع مسجد منتقل ہو گئے، اور آپ نے پورے ماہ کے اعتکاف کی نیت کر لی۔

یہ زمانہ اس علاقہ میں (ہندوستان کے برخلاف خط استواء پر ہونے کی وجہ سے) انتہائی سردی کا تھا، لیکن اسٹینگر ذرا نشیب پر واقع ہے، اس لئے یہاں موسم قدرے معتدل رہتا ہے، اسٹینگر کی جامع مسجد کا انتخاب اس لئے کیا گیا کہ مسجد نہایت وسیع اور تین[۳] حصوں پر مشتمل ہے، اوپر کے حصہ میں تقریباً بارہ[۱۲] سو افراد کی گنجائش ہے، اور نیچے دو حصوں میں تقریباً ایک ہزار افراد سما سکتے ہیں، بیت الخلاء وغیرہ کافی تعداد میں ہیں، گرد و پیش گاڑیاں کھڑی کرنے کی وسیع جگہ ہے، گرم، ٹھنڈے پانی کا بندوبست بھی ہے، محل[۱] وقوع نہایت پرسکون ہے۔

ایک بیان کے مطابق ہفتہ اتوار کو چھ[۶] سات[۷] ہزار کا مجمع ہو جاتا، جگہ کی کمی کو

[۱] اسٹینگر (STANGER) جنوبی افریقہ میں صوبہ نیٹال (NATAL) کا ایک شہر ہے۔

پورا کرنے کے لئے تینوں اطراف میں چار عدد خیمے نصب کئے گئے، ہفتہ اتوار کو مجمع کا نظم کرنے کے لئے وائرلیس سیٹ کرنا پڑا، ایک انفارمیشن سینٹر (معلوماتی مرکز) مسجد سے متصل عارضی طور پر قائم کیا گیا، مہمانوں کی خدمت کے لئے سو افراد پر مشتمل ایک جماعت متعین تھی، جن میں پچاس سحر کے لئے، اور پچاس افطار کے لئے مخصوص تھے۔

رمضان کے اس قیام سے اس پورے علاقہ میں دین کا ایک نیا ذوق پیدا ہوا، لوگوں کی ہمتیں بلند ہوگئیں، بہت سی جگہ مجالس ذکر کے قیام کا سلسلہ شروع ہوگیا، بہت سی جگہ نئی مسجدوں کی بنیاد پڑی، مدارس دینیہ، اور مکاتب قرآنیہ کا قیام عمل میں آیا، اچھے اچھے صاحب ثروت گھرانوں میں دینی علم کا شوق پیدا ہوا، اور انھوں نے اپنے بچوں کو دور دراز کے مدارس دینیہ میں بھیجنے کا فیصلہ کیا، دوسری طرف تبلیغی جدوجہد میں (جو کئی سال سے جنوبی افریقہ میں جاری ہے) نئی جان پڑی، دور دراز علاقوں سو سو دو دو سو میل کی مسافت سے، بلکہ دوسرے افریقی ملکوں سے بھی لوگ زیارت کے لئے آتے رہے، وہ اپنے جیب و دامن کو فیوض و برکات سے بھر بھر کر واپس جاتے، جدائی کے وقت بڑے متأثر آبدیدہ نظر آتے۔

حضرت نے پورے ماہ کے اعتکاف کی نیت فرمائی، معمولات حسب ذیل تھے:۔

بعد ظہر ختم خواجگان و دعا، پھر مجلس ذکر، بعد عصر کتابی تعلیم، پھر افطار، بعد مغرب نوافل، بعد طعام مجلس اور بیعت، بعد تراویح ختم یٰس شریف اور دعا، پھر فضائل درود شریف کی خواندگی، پھر واردین و زائرین سے مصافحہ کا سلسلہ شروع ہوتا، اور عموماً گھنٹہ بھر، بلکہ زیادہ ہی وقت لگتا، معتکفین و زائرین رات کو کچھ نوافل و تلاوت میں شب بیدار رہتے، کچھ آرام کرتے پھر سحری اور تسبیح و تہلیل میں مشغول رہتے، فجر با اشراق

کے بعد اکثر لوگ سوتے، کچھ تلاوت میں مشغول رہتے، روزانہ وعظ کا سلسلہ رہتا، ایک دن مولانا مفتی محمود صاحب گنگوہی وعظ فرماتے، ایک دن مولانا عبدالحلیم صاحب جونپوری، کتاب مولانا معین الدین صاحب، مولانا شاہد صاحب الگ الگ وقتوں میں پڑھتے، تراویح مولانا سلمان صاحب نے پڑھائی، مولانا عبدالحفیظ صاحب مکی عموماً دعا کراتے، یہ بڑی جامع اور طویل دعا ہوتی، جس میں پوری دنیا میں ہدایت کے پھیلنے اور دین اسلام کی بلندی اور سرسبزی کی دعا کی جاتی۔

معتکفین شروع رمضان میں سیکڑوں کی تعداد میں تھے، اخیر میں ہزار سے متجاوز ہو گئے، مقامی حضرات عموماً تحتانی مسجد میں اعتکاف میں رہتے، اور باہر سے آئے ہوئے فوقانی مسجد میں معتکف رہتے، جو اصل مسجد سمجھی جاتی، زائرین کا سلسلہ بڑھتا رہا، تا آنکہ ان کی تعداد ہزاروں تک پہونچ گئی، بالخصوص شنبہ اور اتوار کو تین ہزار سے متجاوز ہو کر چار پانچ ہزار تک تعداد پہونچ جاتی۔

۴ر اگست ۱۹۸۱ء ۳ر شوال ۱۴۰۱ھ منگل کو ظہر کی نماز پڑھ کر ختم خواجگان کے بعد مولانا عبدالحفیظ صاحب مکی نے الوداعی دعا کرائی، لوگ پھوٹ پھوٹ کر روئے، حضرت شیخ ضروریات سے فارغ ہو کر ۲ بجے گاڑی میں تشریف فرما ہوئے، اور اسٹینگر کی مسجد سے روانہ ہو گئے، چند مقامات پر ٹھہرتے اور دعا کرتے ہوئے سلور گلین (SILVERGLEN) وہاں سے رچمنڈ (RICHMOND) وہاں سے میرج برگ (MARTIZBURG) جہاں تقریباً تین ہزار آدمیوں نے مصافحہ کیا، وہاں سے اسپنگو بیچ (ISIPINGO BEACH) ہر جگہ الا ماشاء اللہ اوقات کے معمولات جاری رہے، یہاں مجمع تقریباً ایک ہزار کا تھا، یہیں جمعہ کی نماز پڑھی گئی، ڈربن سے وائٹ ریور (WHITE RIVER) پرائیوٹ ایرپورٹ سے روانہ ہونا تھا،

یہاں مولوی محمد گارڈی نے پورے دوؔ جہاز چارٹر کر رکھے تھے، وائٹ ریور پر بھی بڑا مجمع تھا، لیکن ہر جگہ کی طرح پولیس اور فوج کا پورا انتظام، یہاں نو مسلم سیاہ فام لوگوں کا مجمع بہت زیادہ تھا، اطراف واکناف سے آئے ہوئے لوگوں کا بھی جم غفیر تھا، تقریباً ۷۔۸ سو سیاہ فام تھے، سبھوں نے قرآن مجید شروع کیا۔

یہاں سے روانہ ہو کر بذریعہ جہاز جوہانس برگ (JOHANNESBURG) پہونچے، یہاں بھی وہی معمولات جاری رہے، جوہانس برگ سے کیپ ٹاؤن (CAPE TOWN) تشریف لے جانا ہوا، یہاں جامعہ ازہر مصر وسعودی عرب کے پڑھے ہوئے جاوی علماء جو یہاں کے قدیم باشندہ ہیں استقبال کے لئے موجود تھے، آپ نے پہلے قبرستان جاکر فاتحہ پڑھی[1]۔

کیپ ٹاؤن میں علماء کی تنظیم کے صدر نظیم محمد صاحب نے جو اصلاً جاوی ہیں، ان کی تعلیم مکہ کی ہے، حضرت کے استقبال میں تقریر کی، یہاں علماء بہت مانوس رہے، کیپ ٹاؤن سے دوبارہ جوہانس برگ واپسی ہوئی، جوہانس برگ سے لے نیشیا (LENASIA) آنا ہوا، تقریباً تین ہزار کا مجمع تھا، مصافحہ میں خاصی دیر لگی، بچوں کی بسم اللہ ہوئی، اور ایک انگریز مسلمان ہوا، ۱۵؍ اگست ۱۴؍ شوال کو لے نیشیا قیام رہا، اور بھی چند اشخاص مسلمان ہوئے، ۱۶؍ اگست، ۱۵؍ شوال کو بھی وہیں قیام رہا، چلتے وقت تقریباً ۳½ ہزار کا مجمع تھا، مصافحہ میں بہت وقت لگا، ۱۸؍ اگست، ۱۷؍ شوال کو زامبیا (ZAMBIA) کے لئے روانگی ہوئی، زامبیا والوں نے ایک مستقل فوجی جہاز زامبیا سے چارٹر کر کے جوہانس برگ

---

[1] عزیزی مولوی علی آدم ندوی ساکن کیپ ٹاؤن نے بتایا کہ یہاں کثرت سے انڈونیشیا کے جلاوطن عرب علماء ومشائخ دفن ہیں، جن کو ڈچ اپنی حکومت کے زمانہ میں سیاسی قیدی بنا کر یہاں لاکر چھوڑ دیتے تھے، ان میں متعدد صاحب نسبت مشائخ، اور صاحب کرامات بزرگ ہوتے تھے۔

بھیجا جس کا کرایہ ہندی روپیوں میں ایک لاکھ ۲۵ ہزار ہوتا ہے، یہ جہاز گیارہ سیٹوں کا تھا رخصت کے وقت ہزاروں کا مجمع تھا، تقریباً سَو سے زیادہ کاریں ہی تھیں، چونکہ الوداعی وقت تھا، اس لئے پورے ساؤتھ افریقہ سے احباب کھنچ کھنچ کر پہونچ گئے، مجمع چیخیں مار مار کر رو رہا تھا، راستہ میں خصوصی انتظام کی بنا پر مسلمانوں کی ایک چھوٹی بستی چپاٹا (CHIPATA) پر جہاز اترا، احباب کا مجمع ایک ہزار کے قریب تھا، اللہ تعالیٰ نے چپاٹا میں جہاز کو ایک بڑے خطرے سے بچالیا، اور بخیریت واپسی ہوگئی، اس سفر میں کھانے میں برکت، خطرے سے سلامتی وغیرہ کے ایسے متعدد واقعات پیش آئے، جو خاصانِ خدا کے ساتھ پیش آتے رہے ہیں، جمعہ بھی چپاٹا میں ہوا، ایک دینی مدرسہ کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔

۲۲ اگست ۲۱ شوال کو چپاٹا سے لوساکا (LUSAKA) روانگی ہوئی، لوساکا کا پورا ایرپورٹ مجمع سے بھرا ہوا تھا کئی ہزار کا مجمع تھا، نعرۂ تکبیر سے پورا ایرپورٹ گونج گیا، یہاں کے میزبانوں نے انتظامات خوب کر رکھے تھے، شامیانوں میں کئی ہزار مجمع کی گنجائش تھی، حضرت کے میزبان ابراہیم حسین لمبات والا صاحب نے پورے شہر لوساکا کے مسلمانوں کی دعوت کر رکھی تھی، تقریباً ڈھائی ہزار (۲۵۰۰) آدمیوں نے کھانا کھایا، آپ نے ۲۴ اگست کو دار العلوم کا معائنہ کیا، اور وہاں کے ذمہ داروں کی درخواست پر اس کا نام مدرسہ رحمانیہ رکھا۔

انگلینڈ کا دوسرا سفر

۲۵ اگست ۱۹۸۱ء ۲۴ شوال ۱۴۰۲ھ کو لوساکا سے انگلینڈ کے لئے روانگی ہوئی، یہ انگلستان کا دوسرا سفر تھا، ایرپورٹ جاتے ہوئے حضرت کی گاڑی کے پیچھے

ایک سوپچاس۱۵۰ کاریں تھیں، پولیس کی کاریں ـــــ اس کے علاوہ لوساکا سے جہاز روانہ ہوکر تونس کے ہوائی اڈہ پر ٹھہرتا ہوا (جہاں حضرت کے رفقائے سفر نے جماعت کے ساتھ نماز پڑھی) بخیر وعافیت لندن کے ہوائی اڈہ پہونچا، یہاں سے جہاز کے ذریعہ مانچسٹر (MANCHESTER) جانا تھا، یہاں کے دوستوں نے پچاس۵۰ سیٹوں والا ایک جہاز پورا چارٹر کر رکھا تھا، جس کا کرایہ اٹھارہ سو۱۸۰۰ پونڈ تھا، بخیر وعافیت مانچسٹر پہونچے، اور دن کو ۲ بج کر ۲۵ منٹ پر دارالعلوم بولٹن (BOLTON) پہونچ گئے، اور وہ نظام الاوقات جاری کردیا گیا، جو ہر جگہ جاری رہا، قرآن شریف کے اختتام وافتتاح اور بیعت کے اجتماعات بھی ہوتے رہے، ۲۹ اگست ۲۸ شوال شنبہ کو چونکہ تعطیل کا دن تھا، اس لئے مجمع تقریباً ۳-۳½ ہزار کا تھا۔

۳۰ اگست ۲۹ شوال یکشنبہ کو ڈیوزبری (DUWSBURY) کے مرکز تبلیغ پر جانا تھا، راستہ میں باٹلی (BATLEY) پر کچھ دیر ٹھہرنا ہوا، مسجد میں عورتوں کا مجمع تقریباً ۲ ہزار کا تھا، جو اردگرد کے حجروں اور نیچے کے حصوں میں جمع تھیں، یہ ساری عورتیں بیعت کے لئے آئی تھیں، ۱۱ بج کر ۴۰ پر ڈیوزبری پہونچے، جہاں مدرسہ کی عمارت زیرتعمیر ہے، یہاں سے غیر ملکوں کے لئے تقریباً ۳۵ جماعتیں نکلیں، اور ان کے مصافحے ہوئے، مجمع تقریباً پانچ ہزار۵۰۰۰ کا تھا، ملک کے کونہ کونہ سے زائرین آئے تھے، ڈیوزبری سے بلیک برن (BLACBURN) مدرسہ کے تین۳ شہید حضرات کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے تشریف لے گئے، جو گذشتہ سال ایک حادثہ میں شہید ہوگئے تھے۔

۵ ستمبر ۵ ذی قعدہ کو دارالعلوم میں جمعیۃ علماء برطانیہ کا اجلاس ہوا، جس میں شیخ اپنی علالت کی وجہ سے شریک نہ ہوسکے، ۶ ستمبر ۶ ذی قعدہ یکشنبہ کو ۵۲ طلبہ کی

دستار بندی ہوئی، اور بخاری شریف کا اختتام، اور مشکوٰۃ کا افتتاح بھی ہوا، آج مجمع بہت زیادہ تھا، پورا مدرسہ اور شامیانے مجمع سے بھرے ہوئے تھے، حضرت اسٹیج پر تشریف لائے، کنارے کنارے طلبہ تپائیوں پر اپنی حدیث کی کتابیں لئے بیٹھے تھے، پہلے حدیث مسلسل بالاولیۃ ہوئی، جس کی حضرت نے سامعین کو اجازت دی، شیخ الحدیث مولانا اسلام الحق صاحب نے بخاری شریف کی آخری حدیث پڑھی، اور نئے سال کی بخاری کا افتتاح بھی کیا، اس کے بعد مشکوٰۃ کی جماعت کی باری آئی، تین ۳ مدرسین کو شیخ کی طرف سے ٹوپی اور دستار عنایت ہوئی، اس ملک برطانیہ میں پہلی مرتبہ مسلمانوں نے یہ منظر دیکھا، ۵۲ علماء، قُرّاء و حُفّاظ تیار ہوئے، اس کے بعد اذان وجماعت شروع ہوئی، آج تقریباً سات ہزار کا مجمع تھا، شدت علالت کی وجہ سے ڈاکٹروں کے مشورے سے چند دن اسپتال میں بھی رہنا پڑا، ۱۴ ستمبر تک اسپتال ہی میں رہنا ہوا۔

۱۶ ستمبر ۱۶ ذی قعدہ کو سعودیہ کا سفر تھا، یہ چونکہ رخصتی کا دن تھا، اس لئے مجمع بے انتہا تھا، پورا مدرسہ اور پوری سڑکیں بھری ہوئی تھیں، تقریباً ۶-۷ ہزار کا مجمع تھا، ۱۰ بجکر ۲۵ منٹ پر مانچسٹر ایرپورٹ پہونچے، ۱۲ بجے بخیر و عافیت لندن کے ہیتھرو (HEATHROW) ایرپورٹ پر اترنا ہوا، وہاں سے انٹرنیشنل ایرپورٹ آئے، ۲ بجکر ۵۴ منٹ پر جہاز نے پرواز کی رفقائے سفر نے جہاز میں احرام باندھا، حضرت نے علالت کی وجہ سے جدہ کی نیت شروع ہی سے کر رکھی تھی، ۸ بجکر ۱۸ منٹ پر بخیر و عافیت جدہ پہونچنا ہوا۔

بابِ ہشتم

علالت کا تسلسل، وفات حسرت آیات

طویل علالت اور سفرِ ہندوستان

حضرت شیخ کی علالت کا سلسلہ جیسا کہ اوپر کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے، بہت طویل تھا، اور سالہا سال ممتد رہا، اس میں بار بار ایسے مرحلے آئے کہ اہل تعلق اور معالجین کو زندگی کی طرف سے سخت خطرہ اور تشویش، اور بعض اوقات مایوسی ہونے لگتی تھی، لیکن اللہ تعالیٰ کو ابھی ارشاد و تربیت، اپنے مشائخ اور مربیوں کے علوم و تحقیقات کی اشاعت، ان کی علمی و تصنیفی یادگاروں کی حفاظت اور توسیع، تبلیغی جماعت کی نگرانی اور سرپرستی، اور زیر تربیت افراد کی تکمیل کا جو کام لینا تھا، اس کے لئے بار بار اس فوری خطرہ اور تشویش کو دور فرماتا رہا، اور اہل تعلق کی آس بندھتی رہی۔

علالت و ضعف کی اسی حالت میں ۱۵ محرم ۱۴۰۲ھ (۱۲ نومبر ۱۹۸۱ء) کو حضرت شیخ مدینہ طیبہ سے ہندوستان تشریف لائے، اور ۲۰ روز دہلی قیام رہا، مرض کا اشتداد، اور ضعف کا شدید غلبہ ہوا، اور صحت بہت نازک مرحلہ پر پہونچ گئی، اہل تعلق اور اہل الرائے کا مشورہ اور اصرار ہوا کہ دہلی میں کسی ایسے اسپتال میں داخل کیا جائے،

جہاں پوری ذمہ داری وہمدردی کے ساتھ علاج ہوتا ہو، چنانچہ ہولی فیملی (HOLY FAMILY) میں داخل کرنے کا مشورہ ہوا، وہاں مکمل طبی معائنہ، ضروری ایکسرے، اور ہر طرح کے امتحانات ہوئے۔

معالجین کو کینسر کا شبہ تھا، کئی بار ضعف کی وجہ سے خون چڑھانے کی نوبت آئی، اور متعدد بار امید و بیم کی حالت پیدا ہوئی، ناچیز راقم سطور، مولانا محمد منظورؒ صاحب اور رفقاء کی ایک جماعت کے ساتھ جن میں عزیزان محمد ثانی، مولوی معین اللہ، مولوی طاہر وغیرہ تھے، زیارت وعیادت کے لئے دہلی گیا، وہاں شیخ کے شدید ضعف وعلالت کی شدت کو دیکھ کر شدت سے قلب میں اس بات کا تقاضہ ہوا کہ کسی طرح حضرت شیخ کو مدینہ طیبہ پہونچایا جائے، مبادا کوئی ایسا واقعہ پیش آجائے جس پر ہمیشہ قلق وندامت ہو، اور مخالفین ومعاندین کو شماتت کا موقعہ ملے، اس رائے میں مولانا سید اسعد مدنی صدر جمعیۃ علماء ہند جو برابر حالات کا مطالعہ کر رہے تھے، اور وقتاً فوقتاً حاضر ہوتے رہتے تھے نہ صرف شریک بلکہ اس رائے اور مشورہ میں ہم لوگوں سے کچھ آگے ہی تھے، بالآخر راقم سطور اور مولانا نے بڑی صفائی اور ایک حد تک جرأت وجسارت کے ساتھ منتظمین وتیمارداروں کی خدمت میں اپنی رائے پیش کی، حالات کا تقاضہ تھا، کہ ایک دن کی بھی تاخیر نہ کی جائے لیکن ذمہ داروں اور تیمارداروں نے (جن میں شیخ کے خادم خاص الحاج ابوالحسن پیش پیش تھے) اس سے اتفاق نہیں کیا، اور کہا کہ ابھی تو شیخ کو سہارنپور لے جانا ہے اور وہاں قیام کرانا ہے، جس کی شیخ کو خواہش بھی ہے، اور کئی بار اشارے بھی فرمائے۔

ہم لوگ اس سے زیادہ اصرار نہیں کر سکتے تھے، ان حضرات کے احترام میں توکلاً علی اللہ خاموشی اختیار کی۔

ہوئی فیملی سے شیخ، حافظ کرامت اللہ صاحب کی کوٹھی میں تشریف لائے، جہاں آرام و علاج کی سب سہولتیں تھیں، ۴؍صفر ۱۴۰۲ھ (۲؍دسمبر ۱۹۸۱ء) کو سہارنپور تشریف لے گئے، اسی عرصہ میں ہم لوگوں کی دوبارہ حاضری ہوئی، اور دیکھا تو دہلی سے بہتر حالت پائی، لیکن اطمینان اب بھی نہ تھا۔

مدینہ طیبہ واپسی

آخر اللہ نے ان کی آرزو اور مخلصین کی دعائیں قبول فرمائیں اور شیخ اپنے خدام و رفقائے خاص کے ساتھ ۱۸؍ربیع الاول ۱۴۰۲ھ (۱۶؍جنوری ۱۹۸۲ء) کو براہ کراچی جدّہ کے لئے روانہ ہوئے، اور وہاں سے الحمد للہ بخیریت مدینہ طیبہ پہونچ گئے، علالت اور علاج کا سلسلہ جاری رہا، خدّام کو ہندوستان میں کبھی تشویشناک اطلاعیں اور کبھی امید افزا خبریں ملتی رہیں۔

آخری ملاقات

اس عرصہ میں ۲۹؍ربیع الاول ۱۴۰۲ھ جنوری ۱۹۸۲ء کو رابطہ عالم اسلامی کی المجلس الاعلیٰ للمساجد اور المجمع الفقہی کی شرکت کے لئے میں مولوی معین اللہ صاحب ندوی نائب ناظم ندوۃ العلماء کی معیت میں مکہ معظمہ حاضر ہوا، حضرت شیخ حسنِ اتفاق سے مکہ معظمہ ہی میں بھائی سعدی صاحب کے مکان پر فروکش تھے، اور ہمارا قیام اس سے متصل ہی ڈاکٹر مولوی عبد اللہ عباس ندوی کے مکان پر تھا جس کا صرف چند گز کا فاصلہ ہے، حضرت شیخ ہمیشہ کے معمول کے مطابق بڑی بشاشت و شفقت سے پیش آئے،

ضعف بہت تھا، لیکن دماغ اسی طرح بیدار و حاضر تھا، میرے ساتھ ازراہ شفقت جو معاملہ مدینہ طیبہ کے قیام میں فرماتے تھے اس کا اعادہ فرمایا، بھائی ابوالحسن سے کہا کہ علی میاں کو مدینہ طیبہ میں جو خمیرہ کھلاتے تھے، وہ روزانہ دیا کرو، ٹھنڈے پانی کو بھی باربار پوچھتے، اور ہدایت فرماتے، اس وقت سب سے زیادہ حضرت کے قلب ودماغ پر جو چیز طاری اور حاوی تھی، وہ دارالعلوم دیوبند کا قضیہ تھا، دن میں دو مرتبہ حاضری ہوتی کوئی حاضری ایسی یاد نہیں جس میں دارالعلوم کی کوئی نئی خبر دریافت نہ فرمائی ہو، اور اس کے اختلاف کے بارے میں اپنی دلی تشویش و فکرمندی کا اظہار نہ فرمایا ہو، میں نے عزیز محمد ثانی رحمہ اللہ کا ایک نیازنامہ بھی دیا اور عرض کیا کہ جب موقعہ ہو سن لیا جائے، فرمایا نہیں ابھی سنوں گا، غالباً مولوی طلحہ صاحب نے پڑھ کر سنایا، فرمایا اس کا جواب بھی لکھواؤں گا، اس وقت کیا معلوم تھا کہ صرف دوڈھائی مہینے کے فصل سے خادم و مخدوم، اور مرید و مرشد اللہ کے یہاں پہونچ جائیں گے۔

ایک یادگار تعزیتی مکتوب

فروری کو ہم دونوں کی بمبئی واپسی ہوئی، یہاں ہندوستان پہونچکر عزیز موصوف محمد ثانی مرحوم کا وہ حادثہ جاں گداز پیش آیا، جس نے دل و دماغ کو مجروح، اور اعصاب کو جھنجھوڑ کر رکھدیا، عجیب بات ہے کہ ۱۶ فروری کو دن کے ۱۱-۱۲ بجے یہ حادثہ پیش آیا، اور اسی دن عصر کی نماز سے پیشتر حضرت شیخ کو مدینہ طیبہ میں ٹیلی فون کے ذریعہ اطلاع مل گئی، حضرت نے اس پر جو تعزیتی مکتوب میرے نام تحریر فرمایا، وہ ایک یادگار تاریخی مکتوب ہے

جس سے حضرت کی حاضر دماغی، حافظہ کے صحیح طور پر کام کرنے، اسی کے ساتھ شدّتِ تعلق کا پورا اظہار ہوتا ہے، اور اس میں لطیف طریقہ پر اپنے سفر کے قرب کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے، وہ مکتوب یہاں بجنسہٖ نقل کیا جاتا ہے۔

"باسمہ سبحانہ

المخدوم المکرم حضرت الحاج علی میاں صاحب زاد مجدکم۔

بعد سلام مسنون، کل ۱۶ فروری ۱۹۸۲ء کو ظہر کی نماز کے بعد عزیزی مولوی حبیب اللہ نے حادثۂ جانکاہ کی خبر سنائی کہ ظہر سے پہلے جبکہ میں سو رہا تھا، نور ولی صاحب کا ملازم آیا، اور یہ خبر بتا گیا کہ آج ساڑھے گیارہ بجے دن میں "محمد ثانی حسنی" کا انتقال ہوگیا "انا للہ وانا الیہ راجعون"، "اللھم اجرنا فی مصیبتنا وعوّضنا خیرا منھا للہ ما أخذ ولہ ما أعطی وکل شئ عندہ بمقدار"۔

ان العین تدمع والقلب یحزن	آنکھ نمناک ہوتی ہے اور دل غمگین ہوتا ہے
ولا نقول الا ما یرضی ربنا وانا بفراقک	مگر ہم وہی کہیں گے جو ہمارے رب کو راضی
یا محمد لمحزونون۔	کرے اور ہم اے محمد تمہاری جدائی پر غمزدہ ہیں۔

علی میاں!

حضرت امام شافعیؒ کا وہ شعر یاد آرہا ہے، جو انھوں نے حضرت امام عبدالرحمٰن بن مہدی کو ان کے صاحبزادہ کی تعزیت میں لکھا تھا ؎

انی معزیک لا انی علی ثقۃ   من الحیاۃ ولکن سنۃ الدین

میں تم سے تعزیت دین کی پیروی میں کر رہا ہوں، نہ کہ اس یقین پر کہ مجھے زندگی کا بھروسہ ہے

فما المعزّی بباق بعد میتہ　　ولا المعزّی ولو عاشا إلی حین

کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ وفات پاجانے والے کے بعد جن سے اس کی تعزیت کی جارہی، نہ وہ باقی رہنے والے ہیں، اور نہ تعزیت کرنے والے ہی کو بقا ہے، اگرچہ ایک مدت تک زندہ رہے۔

علی میاں! حادثۂ جانکاہ کی خبر سن کر دل پر کیا گذری بیان نہیں کرسکتا، ادھر آپ کی پیرانہ سالی اور پے در پے حادثات کا تسلسل اور بھی موجبِ رنج وقلق ہے، مگر محض رنج وقلق سے نہ تو جانے والے کو فائدہ، نہ رہنے والے کو سکون، میں نے تو خبر سنتے ہی اپنے دستور کے موافق دوستوں کو ایصال ثواب اور دعائے مغفرت کی تاکید شروع کردی کہ میرے یہاں اصل یہی تعزیت ہے، اور اس کے بہت سے واقعات میری" آپ بیتی" میں بھی گزر چکے ہیں، اللہ تعالےٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے، اجر جزیل عطا فرمائے، اور پسماندگان کو خصوصاً آپ کو صبر جمیل۔

اس وقت رہ رہ کر عزیز مرحوم کی خوبیاں اور باتیں یاد آرہی ہیں، اور آپ کا خیال بھی بار بار آرہا ہے کہ آپ پر کیا گذر رہی ہوگی۔

قربان جایئے نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کہ ہر حرکت وسکون کے اعمال کو ہمارے لئے بیان فرما گئے، اور اللہ تعالےٰ جزائے خیر دے ان صحابہؓ ومحدثین کو جو ان سب چیزوں کو محفوظ فرما گئے، اس وقت بھی حضور اقدس صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک تعزیتی مکتوب جو حضرت معاذؓ بن جبل کو لکھوایا تھا، نقل کرا رہا ہوں، حضرت معاذؓ کے ایک صاحبزادہ کا انتقال ہوگیا، اس پر آپؐ نے یہ مکتوب مبارک لکھوایا:۔

من محمد رسول اللہ إلی معاذ بن　　اللہ کے رسول محمد (علیہ الصلاۃ والسلام)

جبل سلام اللّٰہ علیك، فانّی احمد
اللّٰہ الذی لا الٰہ الّا ھو۔
امابعد! فعظم اللّٰہ لك الأجر
وألھمك الصبر، ورزقنا وایاك
الشکر، ثم ان أنفسنا وأموالنا
وأھالینا وأولادنا من مواھب اللّٰہ
عزوجل الھنیئة وعواریہ
المستودعة، متعك اللّٰہ بہ
فی غبطة وسرور، وقبضہ بأجر
کبیر، الصلوٰة والرحمة والھدی
إن احتسبتہ۔

کی طرف سے معاذ بن جبل کے نام، میں
پہلے اس اللہ کی تم سے حمد بیان کرتا ہوں
جس کے سوا کوئی معبود نہیں (بعد ازاں
دعا کرتا ہوں) اللہ تعالیٰ تم کو اس صدمہ
کا اجر عظیم دے اور تمہارے دل کو صبر عطا
فرمائے، اور ہم کو اور تم کو نعمتوں پر شکر کی
توفیق دے، حقیقت یہ ہے کہ ہماری جانیں
اور ہمارے مال اور ہمارے اہل وعیال
یہ سب اللہ تعالیٰ کے مبارک عطیے ہیں،
اور اس کی سونپی ہوئی امانتیں ہیں،
اللہ تعالیٰ نے جب تک چاہا خوشی اور عیش
کے ساتھ تم کو اس سے نفع اٹھانے اور
جی بہلانے کا موقعہ دیا، اور اب اس امانت
کو اٹھالیا، اس کا بڑا اجر دینے والا ہے،
اللہ کی خاص نوازش اور اس کی رحمت
اور اس کی طرف سے ہدایت کی تم کو بشارت
ہے اگر تم نے ثواب اور رضائے الٰہی کی
نیت سے صبر کیا۔

یامعاذ فاصبر ولا یحبط جزعك أجرك

پس اے معاذ ایسا نہ ہو کہ جزع فزع

فتندم علی ما فاتک	تمہارے اجر کو غارت کر دے اور پھر تمہیں
واعلم ان الجزع لا یرد میتا	ندامت ہو، اور یقین رکھو کہ جزع
ولا یرفع حزنا، فلیذھب أسفک علی	فزع سے کوئی مرنے والا واپس نہیں آتا،
ماھو نازل بک فکان قد۔	اور نہ اس سے دل کا رنج وغم دور ہوتا ہے،
والسلام	اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حکم نازل ہوتا
	ہے، وہ ہو کر رہنے والا ہے، بلکہ یقیناً
	ہو چکا ہے۔

اور یہ حدیث مشہور ہے ہی:۔

ما یزال البلاء بالمؤمن والمؤمنة	مومن مرد و عورت برابر جان و مال اور
فی نفسه وولده وماله حتی یلقی	اولاد میں مصیبت سے دوچار ہوتے رہتے
اللہ تعالیٰ وما علیه خطیئة۔	ہیں، یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اس حال
	میں ملتے ہیں کہ ان پر کوئی گناہ نہیں ہوتا۔

پھر:۔

أشد الناس بلاء الأنبیاء ثم الأمثل	سب سے زیادہ مصیبتوں سے انبیاءؑ کو دوچار
فالأمثل، یبتلی الناس علی قدر دینهم	ہونا پڑتا ہے پھر جو ان کے جتنا قریب
فمن ثخن دینه اشتد بلاؤہ، ومن	ہوتا ہے، لوگوں کی آزمائش ان کے دین کی
ضعف دینه، ضعف بلاؤہ، وان	مناسبت سے ہوتی ہے، جس کا دین مضبوط
الرجل لیصیبه البلاء حتی یمشی	ہوتا ہے اس کی آزمائش بھی سخت ہوتی
فی الأرض ما علیه خطیئة۔	ہے، جس کا دین کمزور ہوتا ہے، اس کی

آزمائش بھی ہلکی ہوتی ہے اور آدمی برابر
مصیبت میں مبتلا رہتا ہے حتی کہ زمین پر
اس طرح چلتا ہے کہ اس پر کوئی گناہ نہیں
رہ جاتا ہے۔

یہ بھی آپ کے اور آپ کے اہل خاندان کے حسب حال ہے:۔

اپنی بیماری اور معذوری میں یہ مختصر خط لکھوا دیا ہے اسی کو عزیز مرحوم کی والدہ، اہلیہ اور بچوں کو بھی پڑھوا دیں اور اپنے دیگر اعزہ کو بھی ہر ایک کو الگ الگ لکھوانا میرے لئے اس حال میں بہت مشکل ہے، اخیر میں اس بدوی کے دو شعروں پر ختم کرتا ہوں، جو اس نے حضرت عباسؓ کی وفات پر عبداللہ بن عباسؓ کو بطور تعزیت سنائے تھے۔

اصبر نکن بک صابرین فانما　　　صبر الرعیة بعد صبر الراس

آپ صبر کیجئے تو ہم بھی آپ کی اتباع میں صبر کریں گے، کیونکہ رعایا اسی وقت صبر کرتی ہے، جب بادشاہ صبر سے کام لے۔

خیر من العباس أجرك بعده　　　واللہ خیر منك للعباس

حضرت عباسؓ کے انتقال کے بعد آپ کا اجر زیادہ باعث خیر ہے، اور حضرت عباسؓ کے مقابلہ میں آپ کے لئے اللہ زیادہ بہتر ہے۔

عزیز حمزہ اس کی والدہ، عزیزانم محمد رابع، محمد واضح، مولانا معین اللہ صاحب مولوی سعید الرحمن صاحب، اور دیگر اعزہ سے سلام مسنون کے بعد مضمون واحد۔

فقط والسلام۔ حضرت شیخ الحدیث صاحب

بقلم حبیب اللہ۔ مدینہ طیبہ۔ ۱۷ فروری ۱۹۸۲ء

علالت کا اشتداد اور زندگی کے آخری ایام

مارچ، اپریل اور وسط مئی تک حضرت شیخ کی علالت وصحت وضعف وقوت کے بارے میں اسی طرح کی مختلف ومتضاد خبریں آتی رہیں، جیسا کہ مہینوں سے معمول تھا، مئی ۸۲ء کی ابتدائی تاریخوں میں راقم سطور عزیز سید سلمان ندوی سلمہ کے ساتھ سری لنکا کے سفر پر روانہ ہوا، وہاں غالباً ۱۴ یا ۱۵ مئی کو واپسی سے ایک شب پہلے خواب دیکھا کہ حضرت شیخ تشریف رکھتے ہیں، مجھے دیکھ کر فرمایا کہ علی میاں! تمہیں معلوم نہیں کہ میں اتنا بیمار ہوں، تم دیکھنے نہیں آئے، میں نے عرض کیا کہ حضرت مجھے اس کی بالکل خبر نہیں ہوئی، مجھے اس عرصہ میں کوئی خط نہیں ملا۔

میں نے عرض کیا کہ اس حادثہ کا ہمارے پورے خاندان پر بڑا اثر ہے، خاص طور پر محمد ثانی کی والدہ پر، اب دیکھا تو حضرت شیخ وہاں پر موجود نہیں تھے، اس پر وہیں ماتھا ٹھنکا، اور آنے والے واقعہ کا دھڑکا پیدا ہو گیا، میں نے دہلی آتے ہی پوچھا کہ حضرت شیخ کا مزاج کیسا ہے؟ کوئی تار یا اطلاع ملی؟ ہمارے میزبان حافظ کرامت صاحب نے کہا کہ ابھی کل ہی بھائی سعدی کا ٹیلی فون آیا کہ حالت اطمینان بخش نہیں ہے، غشی بھی کبھی کبھی طاری رہتی ہے، اور معالجین صحت کی طرف سے مطمئن نہیں ہیں، پھر میری موجودگی میں مکہ کے ٹیلی فون آئے اور معلوم ہوا کہ تشویش قائم ہے، اور صحت میں بہتری پیدا نہیں ہوتی۔

خبر صاعقہ اثر

۱۸ مئی کو ہم لوگ لکھنؤ واپس آگئے، ۲۵ مئی ۱۹۸۲ء ۲ شعبان ۱۴۰۲ھ کو دہلی سے

بذریعہ ٹیلی فون، اور مدینہ طیبہ سے مولوی سعید الرحمٰن ندوی کے تار سے جو اس وقت وہاں موجود تھے، حادثۂ فاجعہ کی اچانک اطلاع ملی۔

أیتھا النفس أجملی جزعــًا　　إنّ الذی تحذرین قد وقعــا

آخری ایام وساعات

اب اس کے بعد کی تفصیلات محب گرامی ڈاکٹر اسماعیل صاحب کے مکتوب سے اخذ کر کے انھیں کے الفاظ میں درج کی جاتی ہیں، وہ حضرت شیخ کے مخلص ومحب خادم اور ہر وقت کے حاضر باش معالج تھے، وہ اپنے اس مکتوب میں جو انھوں نے مخصوص اہل تعلق کو بھیجا ہے، لکھتے ہیں:-

"حضرت اقدس نور اللہ مرقدہ کی علالت کا سلسلہ تو کئی سال سے چل رہا تھا، ۱۲ رمئی چہار شنبہ سے قبل صحت نسبتاً اچھی تھی، کھانا بھی نوش فرماتے تھے، گفتگو بھی ٹھیک طرح سے فرماتے تھے، پوچھنے پر مشورہ بھی حسب سابق دیتے تھے، مولانا عاقل صاحب مسلم شریف کی تقریر کا جو علمی کام کر رہے ہیں، وہ روزانہ کا کام بعد عشاء حضرت کو سناتے، حضرت غور سے سنتے، اور ضروری مشورہ بھی دیتے تھے، گویا صحت اچھی تھی، البتہ ضعف بہت تھا جس کی وجہ سے حرم شریف صرف ایک نماز کے لئے تشریف لے جاتے، شروع میں ظہر کی نماز میں، اور پھر دھوپ میں تیزی ہو جانے کی وجہ سے عشاء کی نماز میں حرم شریف جانے کا معمول تھا۔

چہار شنبہ ۱۲ رمئی کو حضرت کو بخار ۱۰۲ ڈگری تک ہو گیا، علاج وغیرہ سے بخار تو اتر گیا، لیکن ضعف میں بہت اضافہ ہو گیا، اور حرم شریف جانا چھوٹ گیا،

استغراق زیادہ رہنے لگا، ۱۴؍ مئی کو نماز جمعہ حرم شریف کی جماعت کے ساتھ مدرسۂ علوم شرعیہ کے صدر دروازہ میں ادا فرمائی، جہاں تک حرم شریف کی صفوں کا اتصال رہتا ہے، بخار کے بعد سے کھانا تقریباً چھوٹ گیا، (مشروبات کا) پینا کسی نہ کسی درجہ میں جاری رہا، جمعہ ۱۴؍ مئی سے روزانہ صبح وشام گلوکوز وغیرہ کی بوتلیں رگ میں دی جاتی رہیں، جن کا سلسلہ وصال کے دن تک جاری رہا، دیگر علاج انجکشن وغیرہ بھی دیئے جاتے رہے۔

شنبہ ۱۵؍ مئی کو آنکھوں میں اور پیشاب میں یرقان محسوس ہوا، خون کا معائنہ کرایا گیا، جس سے جگر اور گردہ میں مرض معلوم ہوا، اور دونوں اعضاء کے عمل میں خلل کا بھی پتہ چلا، یکشنبہ ۱۶؍ مئی کی شب میں نیم بے ہوشی تھی، دوسرے روز فجر سے مکمل بے ہوشی ہوگئی، اتوار کا سارا دن مکمل بے ہوشی میں گذرا کہ جس کروٹ لٹایا جاتا اسی پر رہتے، نہ آواز دیتے، نہ حرکت، نہ کھانسی وغیرہ، نبض اور بلڈ پریشر دیکھ کر اطمینان ہوتا کہ فوری خطرہ نہیں ہے، علاج وغیرہ مختلف تدبیریں ہوتی رہیں، اتوار کی شام کو بخاری شریف کا ختم کرایا گیا، جو اتوار پیر دو روز میں مکمل ہوا، جس کے بعد صاحبزادہ مولانا طلحہ صاحب نے بہت الحاح کے ساتھ دعا کرائی، مکہ مکرمہ میں شیخ محمد علوی مالکی کے یہاں بھی یٰسین شریف کا ختم ہوا۔

دوشنبہ ۱۷؍ مئی کو بے ہوشی تو تھی، لیکن کل جیسی نہیں تھی، بلکہ ہیجانی کیفیت تھی، صبح تو "اللہ اللہ" فرماتے رہے، ظہر کے بعد سے "یا کریم یا کریم" "یا" "او کریم او کریم" فرماتے رہے، کبھی کبھی "یا حلیم یا کریم" بھی فرماتے رہے، یا کریم کی یہ آوازیں اخیر وقت تک وقتاً فوقتاً دیتے رہے، علاج کے سلسلہ میں یہ ناکارہ دیگر ڈاکٹروں

سے بھی برابر مشورہ کرتا رہا، بالخصوص ڈاکٹر اشرف صاحب، ڈاکٹر ایوب صاحب، ڈاکٹر سلطان صاحب، ڈاکٹر منصور، ڈاکٹر عبدالاحد وغیرہ، خون وغیرہ کے معائنہ کے لئے ڈاکٹر انصرام صاحب بہت تعاون فرماتے رہے، البتہ جگر اور گردہ کا عمل برابر کمزور ہوتا گیا، خون، پیشاب کا معائنہ اور علاج و دیگر تدابیر ہوتی رہیں، غذا تقریبًا بند تھی، رگ میں بوتلوں کے ذریعہ ہی غذا، پانی، اور گلوکوز وغیرہ دیا جاتا رہا، ۲۱ رمئی کو نماز جمعہ حرم شریف کی جماعت کے ساتھ مدرسۂ شرعیہ کے صدر دروازہ میں ادا فرمائی۔

اتوار ۲۳ رمئی کی صبح تک بظاہر طبیعت کچھ ٹھیک رہی، ۲۳ رمئی کو بعد ظہر سوءِ تنفس کی تکلیف ہوئی جس کی فوری تدبیر کرلی گئی، مغرب سے آدھ گھنٹہ قبل جب یہ ناکارہ مطب میں تھا، حضرت کے خادم مولوی نجیب اللہ نے ٹیلی فون پر بتلایا کہ حضرت کی طبیعت خراب ہے، چنانچہ میں فورًا حاضر ہوا تو دیکھا کہ سوءِ تنفس کی تکلیف بہت زیادہ ہے، جس کی وجہ سے حضرت کو بے چینی ہے، سانس لینے میں بہت دقت محسوس ہورہی ہے، بندہ نے معائنہ کرکے ضروری انجکشن لگائے، جس سے کچھ چند منٹ کے بعد سکون مل گیا، اور سانس طبعی حالت پر آگئی، عشاء کے بعد بندہ کے گھر جانے تک طبیعت نسبتًا ٹھیک تھی، ۲۴ رمئی فجر کے وقت بھی طبیعت نسبتًا ٹھیک تھی، اور حضرت گفتگو بھی تھوڑی تھوڑی فرماتے رہے، البتہ تشویش کی بات یہ پیش آئی کہ کل ظہر کے بعد سے پیشاب بالکل نہیں آیا، صبح ۸ بجے دوبارہ سوءِ تنفس کی تکلیف شروع ہوئی، اس کے لئے اور پیشاب کے لئے تدبیریں کی جانے لگیں، جس سے ظہر عصر کے درمیان پیشاب تو آگیا،

تنفس کے لئے انجکشن آکسیجن وغیرہ لگائے گئے، بارہ بجے دوپہر تک بے چینی رہی، کبھی فرماتے بٹھاؤ، کبھی فرماتے لٹاؤ، کبھی فرماتے دوا لاؤ، وقتاً فوقتاً "یا کریم" "او کریم" بھی بلند آواز میں فرماتے رہے یہ ناکارہ چونکہ مسلسل پاس ہی بیٹھا رہا تو کبھی کبھی اس ناکارہ کا ہاتھ پکڑ کر زور سے دباتے، تقریباً گیارہ بجے جبکہ الحاج ابوالحسن نے تکیہ اونچا کیا تو بندہ کی طرف دیکھ کر فرمایا "ڈاکٹر صاحب ہیں" ابوالحسن نے کہا، ہاں یہ ڈاکٹر اسماعیل ہیں، یہ سن کر بندہ کی طرف دیکھ کر مسکرائے یہ آخری گفتگو تھی، جو حضرت نے فرمائی، اس کے بعد "یا کریم" "او کریم" فرماتے رہے، ظہر تک یہ کیفیت رہی، ظہر کے بعد سے مکمل سکون ہوگیا، جو آخری وقت تک رہا، یہ ناکارہ بار بار نبض و بلڈ پریشر وغیرہ دیکھتا رہا، روح پرواز کرنے سے کچھ قبل صاحبزادہ مولانا طلحہ صاحب نے بندہ سے پوچھا کہ کیا یہ آخری وقت ہے؟ بندہ نے اثبات میں سر ہلایا تو انھوں نے بلند آواز سے اللہ اللہ کہنا شروع کردیا، اسی حال میں حضرت نے دو مرتبہ آخری ہچکیاں لیں، جس سے آنکھیں خود بخود بند ہوگئیں، اور روح پرواز کر گئی، اس وقت ٹھیک ۵ بجکر ۴۰ منٹ ہوئے تھے یعنی مغرب سے ڈیڑھ گھنٹہ قبل "انا للہ وانا الیہ راجعون، اللھم اجرنا فی مصیبتنا وعوضنا خیرًا منھا وانا بفراقک یا شیخ لمحزونون" جس کی ساری عمر اتباع سنت میں گذری، اس کو تکوینی طور پر یہ اتباع بھی نصیب ہوگیا کہ دوشنبہ کو عصر مغرب کے درمیان وصال ہوا۔

اس وقت حاضرین کا جو حال تھا، وہ بیان نہیں کیا جاسکتا، وصال کے

وقت پاس موجود ہونے والوں میں صاحبزادہ مولانا محمد طلحہ صاحب، مولانا عاقل صاحب، ان کے صاحبزادہ جعفر، الحاج ابوالحسن، مولوی نجیب اللہ، صوفی اقبال، مولانا یوسف متالا، حکیم عبدالقدوس، مولوی اسماعیل، مولوی نذیر، ڈاکٹر ایوب، حاجی دلدار اسعد، عبدالقدیر، اور ناکارہ تھے، فوراً ہی تجہیز و تکفین کے انتظامات شروع ہوگئے، ڈاکٹر ایوب کو ہسپتال کا ورقہ لینے کے لئے اسی وقت بھیج دیا گیا تھا، صاحبزادہ محمد طلحہ صاحب، مولانا عاقل صاحب و دیگر متعلقین و خدام کا مشورہ ہوا کہ تدفین عشاء کے بعد ہو یا فجر کے بعد؟ کیونکہ بعض مخصوص احباب و اعزہ کے مکہ مکرمہ سے پہونچنے کی اطلاع تھی، چونکہ ان کی وہاں سے روانگی کا وقت معلوم تھا، جس کے پیش نظر ان کا عشاء تک پہونچ جانا گویا یقینی تھا، اس پر یہ طے ہوا کہ عشاء میں ہی نماز جنازہ ہو جانی چاہیئے، اور فجر تک مؤخر نہ کیا جائے، اس کا اعلان بھی کر دیا گیا، لیکن اس کا بھی برابر افسوس رہے گا کہ وہ اعزہ جن کی آمد کا ہمیں شدت سے انتظار تھا، وہ راستہ میں گاڑی خراب ہو جانے کی وجہ سے بر وقت نہ پہونچ سکے، اور چونکہ عشاء کا اعلان ہو چکا تھا، اس لئے عین وقت پر تبدیلی نہیں ہو سکتی تھی، ہر جگہ ٹیلی فون سے اطلاع کر دی گئی، مغرب کے بعد غسل دیا گیا، جو مولانا عاقل صاحب، اور مولانا یوسف متالا صاحب کی ہدایات اور مشوروں سے دیا گیا، غسل کے وقت خدام کا بڑا مجمع موجود تھا، ہر شخص کی خواہش تھی کہ اس مبارک عمل میں شریک ہو، غسل میں شرکت کرنے والوں میں یہ حضرات خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں:۔

٭ مولانا یوسف متالا، الحاج ابوالحسن، مولوی نجیب اللہ، حکیم عبدالقدوس عزیز جعفر، شاہ عطاء المہیمن ابن مولانا شاہ عطاء اللہ بخاری، صوفی اسلم، مولوی صدیق، مولوی احسان، قاضی ابرار، عبدالمجید وغیرہ"۔

ڈاکٹر محمد ایوب جو ورقہ لینے گئے تھے، پورے دو گھنٹے کے بعد آئے اور بتلایا کہ ورقہ حاصل کرنے میں کچھ قانونی رکاوٹ ہو رہی ہے، اور صاحبزادہ مولانا طلحہ صاحب کا جانا ضروری ہے، چنانچہ مولانا طلحہ صاحب کو بھی ان کے ہمراہ بھیجا گیا، قبرستان والوں سے قبر کھودنے کو کہا گیا، تو انھوں نے کہا کہ جب تک ہسپتال کا ورقہ نہ آجائے، ہم قبر نہیں کھود سکتے، اس وقت عشاء میں صرف پون گھنٹہ باقی تھا، دوبارہ مندرجہ بالا حضرات نے مشورہ کیا کہ اب بظاہر عشاء تک قبر تیار ہونا دشوار ہے، لہذا فجر میں جنازہ ہو، اس کے فوراً بعد سید حبیب صاحب تشریف لائے، انھوں نے فرمایا کہ میں خود جاکر قبر کی جگہ بتلا کر آیا ہوں، اور قبر کھودنا شروع ہو گیا ہے، تقریباً بیس۲۰ منٹ بعد اسپتال کا ورقہ بھی آگیا، اور قبر تیار ہو جانے کی اطلاع بھی مل گئی، نیز قبرستان والے مخصوص چارپائی بھی لے آئے، گویا عشاء کی اذان سے پندرہ۱۵ منٹ قبل جنازہ بالکل تیار تھا، لہذا پہلے مشورہ کے مطابق جنازہ باب السلام سے حرم شریف لے جایا گیا، عشاء کے فرضوں کے متصل بعد یہاں کی عام روایت کے مطابق حرم شریف کے امام شیخ عبداللہ زاحم نے نماز جنازہ پڑھائی، اور جنت البقیع کی طرف باب جبرئیل سے نکل کر چلے، ہجوم بے پناہ تھا، ایسا ہجوم کسی اور کے جنازہ میں

شاید ہی دیکھا گیا ہو، قبر شریف حضرت کی منشاء کے مطابق اہل بیت کے احاطہ اور حضرت سہارنپوریؒ کی قبر شریف کے قریب کھودی گئی تھی، صاحبزادہ مولانا طلحہ اور الحاج ابوالحسن قبر شریف کے اندر اترے اور اس کو بند کیا، اس طرح حضرت اقدس کی دیرینہ تمنا پوری ہوئی۔

ایک خاص بات یہ دیکھی کہ وصال سے ایک روز قبل حضرت والا ہر ایک سے فرداً فرداً دریافت فرماتے رہے کہ تم کیا کام کرتے ہو؟ صوفی اقبال صاحب، الحاج ابوالحسن صاحب، اس ناکارہ سے براہ راست دریافت فرمایا، صاحبزادہ مولانا طلحہ دوسرے کمرے میں تھے تو خادم کو بھیجا کہ طلحہ سے پوچھ کر آ کہ تو کیا کام کرے ہے؟ ہر ایک نے کچھ نہ کچھ پڑھنے، ذکر، تلاوت وغیرہ کا جواب دیا، تو سکوت فرمایا، بندہ سے دریافت فرمایا تو بندہ سے قبل ابوالحسن نے جواب دیا کہ یہ تو ابھی مطب جا کر مریضوں کا علاج کریں گے، تو فرمایا "یہ بھی کوئی کام ہے"؟ گویا آخری وقت تک بھی اپنے لوگوں کے متعلق فکر تھا کہ کیا کرتے ہیں۔

تدفین کے بعد حضرت نور اللہ مرقدہ کے ایک مجاز نے دیکھا کہ کوئی کہہ رہا ہے:۔

"فتح لہ ابواب الجنۃ الثمانیۃ" یعنی ان کے لئے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیئے گئے۔

ایک اور صاحب نے دوسرے روز صبح روضۂ اقدس پر صلوٰۃ وسلام پڑھتے ہوئے محسوس کیا، گویا حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ تمہارے شیخ کو اعلیٰ علیین میں جگہ دی گئی ہے، ایسا انسان لاکھوں کروڑوں میں

کوئی کوئی ہوتا ہے"

ایک مرثیہ کے چند اشعار

اس موقعہ پر کاندھلہ کے قادر الکلام و خوش گو شاعر شبیر صاحب جذبی کاندھلوی کے مرثیہ کے چند منتخب اشعار لکھے جاتے ہیں، جو صورت واقعہ کی صحیح تصویر، اور زخمی دلوں کی صحیح ترجمانی اور تعبیر ہیں ؎

اک جنازہ جا رہا ہے دوش عظمت پر سوار	پھول برساتی ہے اس پر رحمت پروردگار
غیرت خورشید عالم ہے کفن کا تار تار	ابر گوہر بار کے اندر ہیں دُر شاہوار
نوحہ خواں ہیں مدرسے اور خانقاہیں سوگوار	آفتاب علم و تقوی چھپ گیا زیر مزار
اللہ اللہ ذوق و شوق آمد ماہ صیام	مصحف حق کی تلاوت روز و شب و صبح و شام
صحن مسجد میں ہزاروں ذاکروں کا اژدہام	وقت افطار و سحر ہر تشنہ لب بادہ بجام
شمع محفل بجھ گئی باقی ہے پروانوں کی خاک	اب نہ ٹپکے گی کبھی محفل میں دیوانوں کی خاک
عمر بھر کرتا رہا وہ خدمت دین رسول	جان و دل میں بھر رہی تھی الفت دین رسول
عشق نے ہو کر فنا پائے مقامات بلند	عشق ہے مجنوں جہاں میں کامیاب و ارجمند
اے خوشا قسمت کہ ہجرت ہو گئی اسکی قبول	تا ابد سوئیگا عاشق زیر دامان رسول
خوابگاہ عشق ہوگی سبز گنبد کے قریب	میٹھی نیند آئے گی اصحاب محمد کے قریب
حشر تک جب بھی مدینہ میں ہوا لہرائے گی	بوئے زلف مصطفیٰ اس کی لحد میں آئے گی
دردمندوں کی دوا ہے عشق محبوب خدا	کاش مل جائے مجھے بھی عشق نور مصطفیٰ
جان و دل کا نور ہو شمع شبستان رسول	رات دن چبھتے رہیں سینہ میں یثرب کے ببول

جذبؔ شاہ کربلا کی یاد میں روتا رہوں — خونِ دل کا سیل ہو اور غرق میں ہوتا رہوں
اے خدا اے دو جہاں اے مالکِ عرش عظیم — اے کریم کارساز اے رب رحمٰن و رحیم
رحم تیرا بے کراں ہے فضل تیرا بے حساب
بخش دے جذبؔی کو بھی کچھ درد و سوز و اضطراب

حلیہ اور پسماندگان

شیخ بڑے حسین وجمیل تھے، حسن وجمال کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے خصوصی وجاہت بھی عطا فرمائی تھی، رنگ سرخ سپید، چہرہ گلاب کی طرح کھلتا ہوا، جسم گداز فربہی مائل، قد میانہ، جب عربی مشلح پہن لیتے، اور عمامہ باندھ لیتے تو ہزاروں میں ممتاز نظر آتے، مجھے یاد ہے کہ میوات کے ایک جلسہ (غالباً مالب کے جلسہ میں) ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم (سابق صدر جمہوریہ ہند) نے ان کو پہلی مرتبہ دیکھا تو مجھ سے فرمایا کہ "شیخ بڑے شاندار آدمی ہیں" آخر میں بیماریوں نے نحافت پیدا کر دی تھی، پھر بھی چہرہ ویسا ہی دمکتا ہوا نظر آتا تھا، اور قلب ودماغ دونوں بیدار۔

حضرت شیخ نے اپنے پسماندگان میں[1] اہلیہ محترمہ ایک صاحبزادہ مولوی محمد طلحہ صاحب اور پانچ صاحبزادیاں چھوڑیں جن کی ضروری تفصیل یہ ہے:۔

اہلیہ محترمہ حضرت مولانا الحاج انعام الحسن صاحب زاد مجدہ، ماہ ذی الحجہ ۱۳۳۸ھ (ستمبر ۱۹۲۰ء) میں ان کی پیدائش ہوئی، حضرت نور اللہ مرقدہ اس وقت حضرت سہارنپوری

---

[1] پسماندگان اور ان صاحبزادگان و دختران کی جن کی حضرت شیخ کی حیات میں وفات ہوگئی تفصیل از تذکرہ مصنف کی درخواست پر حضرت کے نواسے مولانا محمد شاہد صاحب کا تحریر کردہ ہے جو خفیف سی ترمیم کے بعد بعینہٖ شائع کیا جا رہا ہے۔

نور اللہ مرقدہٗ کے ساتھ اپنے پہلے سفر حجاز پر تشریف لے جا چکے تھے، ۳ محرم ۱۳۵۴ھ (۷ اپریل ۱۹۳۵ء) میں آپ کا نکاح ہوا، مولوی محمد زبیر سلمہٗ آپ ہی کے صاحبزادے ہیں۔

اہلیہ محترمہ حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ، ۱۳۴۷ھ میں ان کی ولادت ہوئی، ۱۹ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۵ھ (۲۲ اپریل ۴۶ء) میں موصوفہ کی شادی مولوی سعید الرحمٰن ابن مولانا لطیف الرحمٰن صاحب کاندھلوی سے ہوئی، ۱۹ شوال ۶۶ھ میں مولوی سعید الرحمٰن کا انتقال ہوا، بعد ازاں موصوفہ کا دوسرا نکاح ۱۹ ربیع الثانی ۱۳۶۹ھ (۸ فروری ۵۰ء) چہار شنبہ میں حضرت مولانا محمد یوسف صاحب سے ہوا، کوئی اولاد آپ کے نہیں ہے۔

اہلیہ محترمہ مولانا الحاج حکیم محمد الیاس صاحب (فرزند مولانا حکیم محمد ایوب صاحب) ۹ ذی قعدہ ۱۳۵۲ھ (۱۹ مارچ ۳۴ء) میں آپ کی ولادت ہوئی، ۱۹ ربیع الثانی ۱۳۶۹ھ چہار شنبہ میں آپ کا نکاح بعبارۃ حضرت مدنی مہر فاطمی پر ہوا، یہ مولوی محمد شاہد حافظ محمد راشد، حافظ محمد سہیل اور محمد ساجد سلمہم کی والدہ ہیں۔

مولوی محمد طلحہ صاحب سلمہٗ آپ زوجۂ محترمہ ثانیہ سے دوسرے صاحبزادے ہیں، ۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۰ھ (۲۸ مئی ۱۹۴۱ء) شنبہ کے روز پیدا ہوئے اولاً قرآن پاک حفظ کیا جس کا اختتام ۱۶ رجب ۱۳۷۵ھ میں حضرت مولانا شاہ عبد القادر صاحب رائے پوری کی مجلس مبارک میں ہوا، ۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۶ھ (۵ دسمبر ۵۶ء) میں سہارنپور میں فارسی تعلیم کا آغاز ہوا، یکم شعبان ۱۳۷۶ھ میں فارسی کی تکمیل کے بعد عربی کی ابتدائی تعلیم کے لئے نظام الدین گئے، وہاں مختلف اساتذہ سے تعلیم حاصل کر کے ۱۳۸۱ھ میں واپس سہارنپور آئے اور جامعہ مظاہر علوم میں داخلہ لے کر شرح جامی، ہدایہ اولین، مقامات حریری

وغیرہ پڑھیں، دورۂ حدیث آپ نے ۱۳۸۳ھ میں مدرسہ کاشف العلوم میں پڑھا، بخاری شریف آپ نے حضرت مولانا انعام الحسن صاحبؒ سے اور طحاوی حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ سے ترمذی و مسلم مولانا عبید اللہ صاحبؒ سے ابو داؤد شریف مولانا اظہار الحسن صاحبؒ سے پڑھی ہے۔

دینی تعلیم سے فراغت پاکر حضرت رائے پوری سے بیعت ہوئے اور پھر اپنے والد ماجد مخدوم الکل کی سرپرستی میں رہ کر ذکر و شغل میں مستعدی کے ساتھ مصروف ہوئے، ماہ ربیع الاول ۱۳۹۱ھ میں حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ نے اجازت بیعت مرحمت فرمائی، حضرت نور اللہ مرقدہٗ کی وفات کے بعد شوال ۱۴۰۲ھ ——— میں ان کی جگہ مظاہر علوم کے سرپرست بنائے گئے۔

اہلیہ محترمہ مولانا محمد عاقل (ابن مولانا حکیم محمد ایوب صاحب) یہ حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ کی دوسری اہلیہ محترمہ کے بطن سے پہلی صاحبزادی ہیں ——— ۶ رمضان ۱۳۶۶ھ (۲۵ جولائی ۱۹۴۷ء) میں پیدا ہوئیں، ۸ ربیع الثانی ۱۳۸۱ھ (۱۹ ستمبر ۱۹۶۱ء) میں آپ کا نکاح ہوا، حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کی شرکت کے خیال سے اس نکاح کی مجلس رائے پور میں منعقد ہوئی، حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ نے مہر فاطمی پر نکاح پڑھایا، حافظ محمد جعفر سلمہٗ، حافظ محمد عمیر، محمد عادل، محمد عاصم سلمہم کی آپ اولاد ہیں۔

اہلیہ محترمہ مولانا محمد سلمان صاحب (ابن مولانا مفتی محمد یحییٰ صاحب) ۲۹ صفر ۱۳۷۰ھ میں آپ کی پیدائش ہوئی، ۲ ذی قعدہ ۱۳۸۶ھ (۱۳ فروری ۱۹۶۷ء) میں بعبارۃ حضرت مولانا انعام الحسن صاحب مہر فاطمی پر آپ کا نکاح ہوا، حافظ محمد عثمان حافظ محمد نعمان سلمہما آپ کی اولاد ہیں۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے سب داماد حضرت مولانا محمد یوسف صاحب، حضرت مولانا انعام الحسن صاحب، مولانا حکیم محمد الیاس صاحب، مولانا محمد عاقل صاحب مولانا محمد سلمان صاحب، جیّد عالم، صاحبِ درس وافادہ، اور صاحبِ تصنیف ہیں، مولانا محمد یوسف صاحب، اور مولانا انعام الحسن صاحب کے متعلق تو کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ اول الذکر کی مساعی جمیلہ اور کمالاتِ وہبیہ عالم آشکارا ہیں، اور آپ کے تذکرہ میں ایک پوری ضخیم کتاب "سوانح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی" (تالیف مولوی سیّد محمد ثانی حسنی مرحوم) موجود ہے، اور ثانی الذکر (بارک اللہ فی حیاتہ ومساعیہ) کی ذات جماعت تبلیغ کی امیر اور اس کی عالمی تحریک وجدوجہد کی سرپرست ونگراں ہے۔

مولانا محمد الیاس صاحب مظاہر العلوم کے ممتاز فضلاء میں ہیں، شعبان ۱۳۷۱ھ میں فراغت پائی، بخاری شریف آپ نے حضرت شیخ سے پڑھی، اور ایک علمی ودینی ادارہ کتب خانہ اشاعت العلوم کے نام سے قائم کیا، جس کے ذریعہ بہت سی دینی کتابیں اور حضرت شیخ کی متعدد نادر تصنیفات منظر عام پر آئیں، شیخ کی مشہور ومعروف تصنیفات "لامع الدراری" "اوجز المسالک" اور "الکوکب الدری" وغیرہ کے اولین ایڈیشن آپ کے ہی توسط سے دہلی سے شائع ہوئے۔

آپ کے دوسرے خویش مولانا محمد عاقل صاحب نے ۱۳۸۰ھ میں مظاہر العلوم سے فراغت حاصل کی، بخاری شریف حضرت شیخ سے پڑھی، ذہانت وفطانت اور بلند پایہ علمی استعداد کے مالک ہیں، ۱۳۸۱ھ میں مظاہر العلوم کے استاد منتخب ہوئے، ۱۳۸۷ھ میں دورۂ حدیث کے استاد بن کر پہلی مرتبہ ابوداؤد شریف

پڑھائی، اس وقت سے ابوداؤد کا درس آپ ہی سے متعلق ہے، شیخ کی جانب سے آپ کو اجازت بیعت بھی ہے، آپ شیخ کے تصنیفی وتالیفی سلسلہ میں معاون رہے ہیں، "الکوکب الدری علی جامع الترمذی" پر آپ کا ایک طویل مقدمہ ہے، جو ۱۳۹۴ھ میں شائع ہو چکا ہے۔

مولانا محمد سلمان صاحب نے ۱۳۸۶ھ میں دورۂ حدیث پڑھا، درس بخاری میں شیخ کے یہاں اکثر وبیشتر آپ ہی قراءت کرتے تھے، شوال ۱۳۸۷ھ میں تدریس کا آغاز کیا، ۱۳۹۶ھ میں اساتذۂ حدیث کے سلک میں منسلک ہوئے، مشکوٰۃ شریف کا درس آپ ہی سے متعلق ہے، شیخ کی عربی تصنیفات وتالیفات کی تکمیل وترتیب میں مولانا محمد عاقل صاحب اور مولانا محمد سلمان صاحب رفیق وشریک رہے، رمضان میں شیخ کی مجلس اعتکاف میں قرآن مجید سنانے کی ذمہ داری آپ نے بڑی مستعدی اور خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دی۔

حضرت شیخ کے سب نواسے بھی جو سن بلوغ کو پہونچ چکے ہیں، اور تکمیل علوم کر چکے ہیں، ماشاء اللہ عالم وفاضل اور علمی ودینی خدمت میں مشغول ومنہمک ہیں، ان میں آپ کے نواسے اور مولانا حکیم محمد الیاس صاحب کے صاحبزادہ مولانا محمد شاہد صاحب مظاہری ممتاز ہیں، وہ جید عالم، رواں قلم مصنف اور علمی وتحقیقی ذوق رکھنے والے نوجوان فاضل ہیں، "مکتوبات علمیہ" اور "علمائے مظاہر علوم اور ان کی علمی وتصنیفی خدمات" اور "تاریخ مظاہر العلوم" (جلد دوم) وغیرہ ان کے تصنیفی ذوق، اور قلم کی روانی کے شاہد ہیں، حضرت شیخ کی ان پر خاص شفقت تھی، اور انھیں کی توجہ، اور محنت سے شیخ کے کئی قلمی مسودات، اور خطوط کے مجموعے منظر عام پر آئے۔

آپ کے دوسرے نواسے مولوی محمد زبیر صاحب ابن مولانا انعام الحسن صاحب بھی مظاہر العلوم کے فاضل ہیں، تکمیل کے بعد حضرت شیخ کے زیر ہدایت و تربیت ذکر و شغل میں مصروف ہوئے، اور شیخ نے ان کو مدینہ منورہ میں اجازت بھی مرحمت فرمائی، وہ اپنے والد ماجد کے زیر سایہ مرکز تبلیغ نظام الدین میں دعوت و تبلیغ اور وہاں کے مدرسہ کاشف العلوم میں درس و تدریس میں مصروف ہیں، بارك الله فی حیاته۔

دوسرے خورد سال نواسے حفظ قرآن کی سعادت سے بہرہ ور، اور تحصیل و تکمیل علم میں مشغول ہیں، جن میں حافظ محمد جعفر سلمہ، خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جو حضرت شیخ کے آخری سفر حجاز میں ہم رکاب اور مدینہ منورہ کے آخری قیام میں حاضر باش رہے، بارك الله فی حیاتهم۔

حضرتؒ کی حیات میں آپ کی جو اولاد ذخیرۂ آخرت بنی وہ یہ ہے۔

صاحبزادی زکیہ مرحومہ۔ یہ ۴ شعبان ۱۳۳۷ھ (۵ مئی ۱۹۱۹ء) شب دوشنبہ میں تولد ہوئیں، یہ حضرت نور اللہ مرقدہٗ کی سب سے پہلی صاحبزادی تھیں، ۳ محرم الحرام ۱۳۵۴ھ (۷ اپریل ۱۹۳۵ء) میں مظاہر علوم کے سالانہ جلسہ کے موقعہ پر ان کا نکاح حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کے ساتھ ہوا، ۱۲ ربیع الاول ۱۳۵۵ھ (۳ جون ۳۹ء) کو بعد عصر رخصتی ہوئی، طویل عرصہ تک تپ دق میں مبتلا رہ کر ۲۹ شوال ۶۶ھ (۱۵ ستمبر ۱۹۴۷ء) بروز دوشنبہ مغرب کی نماز پڑھتے ہوئے سجدہ کی حالت میں انتقال ہوا مولانا محمد ہارون صاحب مرحوم آپ ہی کے بطن سے تھے۔

محمد موسیٰ۔ رمضان المبارک ۴۳ھ میں ان کی ولادت ہوئی تقریباً سات آٹھ ماہ

حیات رہ کر ۹ ربیع الثانی ۴۴ھ میں انتقال ہوا۔

صاحبزادی شاکرہ مرحومہ۔ یہ حضرت کی تیسری صاحبزادی تھیں، ماہ صفر ۴۵ھ میں پیدا ہوئیں، اپنے ایک خاندانی عزیز مولوی احمد حسن کاندھلوی سے ۱۹ جمادی الاول ۶۵ھ (۲۲ اپریل ۴۶ء) یوم دوشنبہ میں نکاح ہوا، حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ نے مہر فاطمی پر نکاح پڑھایا، ۱۴ رجب ۶۹ھ (یکم مئی ۱۹۵۰ء) دوشنبہ میں وفات ہوئی، حادثۂ انتقال کی کیفیت حضرت شیخ اس طرح تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"اتفاق سے مولانا یوسف صاحب سہارنپور آئے ہوئے تھے، میں بھی ان کے ساتھ گھر میں گیا تو مرحومہ نے یٰس شریف پڑھنے کی فرمائش کی، مولانا یوسف صاحب نے پڑھی اور جب "سَلَامٌ قَوْلًا مِّن رَّبٍّ رَّحِيمٍ" پر پہنچے تو نہ معلوم مولانا یوسف صاحب مرحوم پر ایک جذبہ اور جوش آیا اور اس آیت شریفہ کو تین دفعہ پڑھا، تیسری کے درمیان میں میری مرحومہ بچی کی روح پرواز کر گئی"۔

محمد ہارون۔ رجب ۴۹ھ میں ان کی ولادت ہوئی، مختصر سی عمر میں انتقال ہو گیا تھا۔

خالدہ مرحومہ۔ ۲۰ ذی الحجہ ۱۳۵۰ھ میں تولد ہوئیں، بچپن میں ہی انتقال ہو گیا۔

محمد یحییٰ۔ ۶ جمادی الثانی ۵۶ھ میں پیدا ہوئے اور کچھ عرصہ بعد وفات پائی۔

صفیہ۔ یہ پہلی زوجۂ مرحومہ سے آخری اولاد ہے، ان کی ولادت ذی الحجہ ۵۵ھ میں ہوئی، ایک سال بعد ۲۱ محرم ۵۶ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

عبد الحی۔ یہ دوسری اہلیہ محترمہ سے پہلے صاحبزادے ہیں، ۱۸ ربیع الثانی ۱۳۵۸ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے، تقریباً ایک ماہ حیات رہ کر ۲ جمادی الاولیٰ میں وفات ہوئی،

حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ اپنے مشاغل عالیہ کی وجہ سے نہ خبر ولادت پر دہلی پہنچ سکے، اور نہ خبر وفات پر۔

حضرت کی ایک ہی ہمشیرہ تھیں جن کا نام عائشہ خاتون تھا، ان کی شادی ۹ صفر ۱۳۳۷ھ (۱۴ نومبر ۱۹۱۸ء) میں جناب ماموں شعیب صاحب سے ہوئی تھی، ۱۶ ذی الحجہ ۱۳۶۱ھ (۲۵ دسمبر ۱۹۴۲ء) میں کاندھلہ میں ان کا انتقال ہوا، عمر تقریباً چالیس سال ہوئی، ان سے ایک لڑکی یادگار ہیں، جو مولانا مفتی محمد یحییٰ صاحب کی اہلیہ محترمہ (یعنی والدہ مولوی محمد سلمان و والدہ مولوی محمد خالد سلمہما) ہیں۔

مولوی محمد طلحہ صاحب

صاحبزادہ عزیز گرامی قدر مولوی محمد طلحہ شیخ کی زندگی ہی میں حافظ و عالم، ذاکر، شاغل، اور صاحب اجازت ہوگئے، ان پر شروع سے حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ کی خاص نگاہ شفقت تھی، اور بعض اوقات حضرت نے ان کی خاطر اپنے سفر کا پروگرام ملتوی فرما دیا، اور فرمایا کہ "طلحہ نے مجھے روک لیا" ویسے بھی تمام معاصر بزرگوں اور شیخ کے یہاں آنے جانے والے صلحاء، علماء کی ان پر نظر خاص رہی، اللہ تعالیٰ نے ان کو انتظامی صلاحیت، توازن و اعتدال تواضع اور خدمت کا جذبہ اور اصابت رائے کا جوہر عطا فرمایا، جو ان کی پدری میراث بھی ہے، حضرت شیخ کے سہارنپور میں رمضان گذارنے کے آخر میں وہی بڑے محرک تھے، شیخ سے تعلق رکھنے والوں اور جن سے شیخ کو تعلق تھا، کے مراتب وہ دوسروں سے زیادہ پہچانتے ہیں، اور اسی کے مطابق ان سے معاملہ کرتے ہیں، شیخ نے ان کی خصوصی تربیت فرمائی، اور امکانی حد تک ان کے اندر صاحبزادگی اور مخدومیت کی بو

نہیں پیدا ہونے دی، اسی لئے ان کے دوروں اور شیخ کے اہل تعلق میں جانے کو ہمیشہ ناپسند
کرتے رہے اور وہ خود بھی اس سے محترز رہے، شیخ کے آخری زمانۂ قیام مدینہ میں اللہ تعالٰی
نے مع والدہ صاحبہ کے ان کو حضرت شیخ کے پاس پہونچا دیا، اور ان کو خدمت کا پورا موقعہ
دیا، شیخ کی وفات پر انھوں نے اسی صبر و تحمل اور وقار و سکینت کا مظاہرہ کیا، اور
دوسروں کے لئے باعث تقویت و تسلی بنے، جیسے خود حضرت شیخ اپنی زندگی میں تعزیت
کرنے والوں کے لئے بن جاتے تھے" أطال الله حياته ونفع به المسلمين"۔

باب نہم

خداداد کمالات، یگانہ مزاجی و طبعی خصوصیات

چند اہم خصوصیات و کمالات

کسی ایسی ہستی کی خصوصیات اور کمالات کو لکھنا جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا اجتبائی معاملہ ہوا اور جس کو مدارج عالیہ سے نوازا گیا ہو، نہ صرف دشوار، بلکہ قریب قریب ناممکن ہے کہ روحانی کمالات، باطنی کیفیات، اور عبد و معبود کے معاملات کا صحیح علم خدا کے سوا کسی کو نہیں ہوتا۔ ع

کراً ما کاتبین را ہم خبر نیست

لیکن جو نمایاں پہلو کوتاہ نظروں اور کم نگاہوں کو بھی نظر آجاتے ہیں، ان کے ذکر کرنے میں کوئی حرج نہیں، نہایت اختصار کے ساتھ یہ سطریں قلم بند کی جارہی ہیں۔

علوئے استعداد، و علوئے ہمت

شیخ کی سب سے زیادہ نمایاں صفت، اور اقران و معاصرین میں ان کا امتیاز، وہ عالی جوہر، بلند استعداد، اور بلند ہمت ہے، جو ان کے حصہ میں آئی ، ان کی اس علوئے استعداد کی شہادت بڑے بڑے اہل نظر نے دی ہے، اور اس کے بغیر یہ ترقیات اور کمالات

جن سے اللہ تعالیٰ نے ان کو بہرہ مند کیا ہے، ممکن نہیں، حضرت مولانا عبد القادر صاحب رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ نے کئی بار حضرت شیخؒ اور مولانا محمد یوسف صاحبؒ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ "ہماری جہاں انتہا ہوتی ہے، وہاں سے تم لوگوں کی ابتدا ہوتی ہے" کبھی کبھی فرماتے تھے کہ "ان چچا بھتیجہ (مولانا محمد الیاس صاحب اور شیخ الحدیث) کی بات ہی الگ ہے" ایک مرتبہ فرمایا کہ "حضرت گنگوہی کی نسبت شیخ الحدیث کی طرف منتقل ہوئی" مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ شیخ کے ساتھ اپنے ایک خورد اور فرزند کا سا معاملہ جتنا فرماتے اس سے زیادہ ایک بزرگ اور بلند مرتبت شیخ کا سا معاملہ فرماتے، اس کا کچھ اندازہ اس خط سے ہوگا جو خوش قسمتی سے راقم سطور کے پاس محفوظ ہے، اور خلاف معمول مولانا ہی کے قلم سے لکھا ہوا ہے:-

"السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، اپنے ساتھ آپ کا حسن ظن خوش قسمتی اور عند اللہ بڑی امیدوں کا باعث جانتا ہوں، اللہ تعالیٰ شانہٗ خوش رکھیں، اور اپنے ساتھ صافی وصادق، یکسوئی وطمانیت کے ساتھ نسبت محمدیہ مرضیہ روزی فرمائیں، اللھم آمین۔

دل خواہاں تھا کہ رمضان مبارک میں تمہارے قرب سے حلاوت اندوز ہوتا، مگر تمہیں اپنی دل جمعی جس طرح اصول ہو اس کی پابندی مناسب ہے، تم جیسے عالی ہمت کے لئے اہل وعیال کا روڑا ہو جانا تو قلب قبول نہیں کرتا، مگر انشاء اللہ مناسب وہی ہوگا جس طرف طبیعت مائل ہو، اسباب ظاہری کچھ ہی ہوں۔

رمضان مبارک میں بندہ بھی دعوات کا خواہاں ہے، بھولیں نہیں، بندہ کے لئے تمہاری ذات انشاء اللہ سرمایہ دارین ہے، تو دعا دل وجان سے نکلنی ضروری ہے مگر افسوس خدا جانے دل وجان کس غاشیہ میں ہیں کچھ پتہ نہیں، اللھم ارحم، اللھم ارحم

گھر میں سب کو دعوات۔

عزیزی حکیم ایوب کو سلام کے بعد فرمادیں کہ ہمت رکھیں غفلت نہ کریں آپ اپنا اورد و مشغلہ رمضانیہ تحریر فرمائیں، فقط والسلام۔ بندہ محمد الیاس عفی عنہ۔"

۱۴ر فروری ۲۹ء (ڈاک خانہ کی مہر کی تاریخ)

بلند ہمتی و عالی حوصلگی وہ مرکزی نقطہ ہے جس کے گرد شیخ کی زندگی کا سارا محور گھومتا ہے، ان کے خمیر میں علوئے ہمت، اور فراخیٔ حوصلہ کا جوہر تھا، علم و تصنیف کا میدان ہو یا عبادت و قرب الٰہی کا، خدمت و مہمان داری کا ہو، یا زہد و توکل کا، ہر جگہ ان کی بلند ہمتی کے جوہر عیاں تھے، مال و دولت کو انھوں نے کبھی قابل توجہ اور قابل التفات نہیں سمجھا، بیش قرار تنخواہوں، اور زریں موقعوں کے ٹھکرا دینے کے متعدد واقعات گزر چکے ہیں، جھنجھانہ کی ایک بڑی آبائی جائداد سے جو تھوڑی سی کوشش سے حاصل ہو سکتی تھی، یہ کہہ کر صرف نظر کر لیا، اور ہمیشہ کے لئے اس کا خیال بھی دل سے نکال دیا کہ میرے پاس اس کے حصول کی کوشش کے لئے نہ وقت ہے، نہ موقعہ، اس عالی ہمتی کا کرشمہ ہے کہ اپنے خاص عزیزوں کی ضروریات کی تکمیل کے لئے بے تکلف قرض لے لیتے تھے، مولانا محمد یوسف صاحب کے اس حج کے موقعہ پر جو حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی وفات کے بعد مع اہل و عیال و اعزہ ہونے والا تھا، چالیس ہزار کی رقم قرض لے کر مہیا فرمادی[1]، اس کا نتیجہ ہے کہ کبھی کبھی ساٹھ ہزار

---

[1] حضرت شیخ کا یہ معاملہ صرف مولانا محمد یوسف صاحب جیسے قریب ترین عزیز و محبوب بھائی کے ساتھ ہی نہ تھا، ان کی عالی حوصلگی اور بلند نظری دوسرے نیازمندوں کے ساتھ بھی تھی، میرے بیرونی اسفار خاص طور پر حجاز کے سفر کے بارے میں بعض اوقات دقتیں پیش آئیں ایک مرتبہ ایسے ہی قصہ پیش آیا تو حضرت شیخ نے مجھے حجاز سے لکھا کہ:

"میں پیش کش تو کرہی دوں کہ آپ کے ارادہ کے لئے کسی امیر الامراء، یا ملک الملوک کی دعوتوں کی

(باقی صـ ۱۹۶ پر)

تک قرض کی مقدار پہونچ گئی لیکن اللہ تعالیٰ برابر اس بار کو ہلکا کرتا رہتا ہے اور غیب سے
سامان پیدا فرماتا رہتا ہے۔

اس علوئے ہمت وایثار کا ایک حیرت انگیز واقعہ جو اس زمانہ کے لحاظ سے
ناقابلِ قیاس اور بہت سے لوگوں کے لئے ناقابلِ یقین ہوگا، یہ ہے ایک ایسے بزرگ عالم
کے انتقال پر جن کے ساتھ مل کر شیخ نے بہت عرصہ کام کیا تھا، اور جن سے کچھ تلمذ کا رشتہ
بھی تھا، جب ان کے ترکہ کی تقسیم اور قرض کے تصفیہ کے لئے ان کے ورثا اور اہل تعلق جمع
ہوئے تو ورثا نے قرض کی ادائیگی کا ذمہ لینے سے جو غالباً پانچ ہزار کی مقدار میں تھا،
صاف معذرت کردی، شیخ نے بے تکلف اس قرض کو اپنے ذمہ لے لیا، اور ادا فرمایا۔

مہمانوں کی کثرت، مصارف کی زیادتی، آنے جانے والوں کے ہجوم، افکار وترددات
میں روز افزوں ترقی، پے درپے جانکاہ حادثات، اور جان سے زیادہ عزیزوں اور
بزرگوں کی وفات کے داغ، خاص طور پر شفیق چچا مولانا محمد الیاس صاحب
اور محبوب وباعث فخر بھائی وداماد مولانا محمد یوسف صاحب کی اچانک رحلت،
وہ صدمے ہیں جن کا برداشت کرے جانا، اور اس سب کے باوجود زندگی کے معمولات،
طبیعت کی شگفتگی، اور مہمانوں کے حقوق کی ادائیگی میں فرق نہ آنے دینا، غیر معمولی استعداد
اور ہمت خداداد کے بغیر ممکن نہیں۔

شیخ کا زہد وتوکل بھی اسی علوئے ہمت کا ایک کرشمہ تھا، انھوں نے اسباب دنیا کی

(باقی ص۱۹۵ کا) شرط نہ ہو تو ایک دو مہینے کے لئے ایک فقیر دعوت پیش کرتا ہے، اگر قبول ہوجائے تو
رسمی نہیں، اور یہ آپ کو خوب معلوم ہوگا، انشاء اللہ رسوم اور ظاہر داری سے
کم ازکم میں اپنے آپ کو بالاتر سمجھتا ہوں۔" (مکتوب، مئی ۱۹۷۳ء، ربیع الثانی ۱۳۹۳ھ)

فراہمی کی طرف کبھی از خود توجہ نہیں فرمائی، کرایہ کے اس مکان میں رہنا شروع کیا جس کے متعلق مشہور تھا کہ یہاں کا مکین زندہ نہیں رہتا، چنانچہ پے درپے دُو تین[۳] موتیں ہوئیں، پہلے والد صاحب، پھر والدہ، پھر چھوٹے بھائی نے قضا کی، لیکن شیخ نے اس مکان سے جنبش نہ کی کبھی اس کو خریدنے کا خیال نہ تھا، لیکن اسباب غیب سے ایسے پیدا ہوتے چلے گئے کہ مکان خریدنا پڑا، گھر نیم خام، نیم پختہ تھا، باہر مردانہ میں بیٹھنے کے لئے، اور زنانخانہ میں رہنے کے لئے بہت کم گنجائش تھی، بہت سے مخلصین نے توسیع کی طرف متوجہ کیا، اور مشورہ دیا کہ مکان میں اضافہ اور مرمت کرادی جائے، عمر کی بے ثباتی کا حوالہ دے کر ہمیشہ معذرت کی، باہر کے جس کمرے میں قیام تھا، اس کی چھت کہنہ اور شکستہ تھی، عرصہ تک ایک ستون کے ذریعہ اس کو روکا گیا، بالآخر ان کے منتظم کار مولوی نصیرالدین صاحب نے ان کے رائے پور کے قیام سے ایک مرتبہ فائدہ اٹھایا، حضرت رائے پوری کو لکھدیا کہ میں مکان میں کام لگا رہا ہوں آپ شیخ کو ایک ہفتہ کے لئے مزید روک لیجئے، حضرت نے بہانوں سے روک لیا، اور کمرہ کو پختہ کرادیا گیا، ایک پختہ چھجہ بھی بارش سے حفاظت اور آراستگی کے لئے بنا دیا گیا، شیخ واپس آئے تو اس چھجّہ کی تعمیر پر بہت ناراض ہوئے اور اس کو بدفضول اور اسراف قرار دے کر خود توڑ ڈالا، اور اس کی جگہ وہی پرانا ٹین کا سائبان لگا دیا گیا، جب مہمانوں کی کسی طرح سے گنجائش نہ رہی، تو اس کمرہ کے بالمقابل خدّام نے ایک مسقف حصہ بنا دیا جس میں عام طور پر دوپہر کا کھانا ہوتا تھا۔

اپنے لباس اور اسباب خانہ داری کے بارے میں، اور تمام ذاتی معاملات میں اسی قناعت، زہد و توکل، بے اعتنائی اور وارستہ مزاجی سے کام لیتے تھے، اور تلاش کرنے والے کو کہیں کوئی سامان تجمل یا اہتمام نظر نہیں آتا تھا۔

جامعیت

اللہ تعالیٰ نے شیخ کے ذات و مزاج کو عجیب و غریب جامعیت عطا فرمائی تھی جس نے بارہا پنبۂ و آتش، و شیشۂ و آہن کو جمع کر کے دکھایا، طبعی یکسوئی' اور فطری خلوت پسندی کے ساتھ مختلف النوع مہمانوں کے حقوق ضیافت کی ادائیگی اور ان کا اکرام و اہتمام، علم و عمل کے تقاضوں کو باہم جمع کرنا نہ صرف مختلف المذاق بلکہ متقابل مسلکوں' اور مختلف تحریکات اور مشاغل کے حاملین سے بیک وقت عقیدت و محبت' اعتراف و اقرار، حمایت و دفاع کا تعلق رکھنا، اور ان سب کا بیک وقت معتمد علیہ ہونا ایک ایسی خصوصیت ہے جس میں بہت کم لوگ شیخ کے شریک و سہیم ہوں گے' کانگریس اور لیگ کے شدید اختلاف' اور تھانہ بھون اور دیوبند کے بُعد کے دور میں بھی وہ دونوں جگہ وقیع محترم اور محبوب رہے' اور ان کی ذات ان تمام تنازعات اور کشاکشوں سے الگ تھلگ رہی، حضرت رائے پوری اور ان کے خدام کی جماعتِ احرار اور اس کے سرگروہ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم، اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی مرحوم اسی طرح ان کے گھر کو اپنا گھر اور ان کی ذات کو اپنا خیرخواہ، دعاگو اور مخلص سمجھتے رہے جیسا کہ مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھیؒ اور حضرت تھانویؒ کے خلفاء و مریدین۔

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ کے ساتھ ان کو جو خصوصی تعلق و محبت' اور اسی کے ساتھ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے ساتھ ان کی جو عقیدت و عظمت اس پورے دور اختلاف میں رہی' وہ کسی جاننے والے سے پوشیدہ نہیں' ان کی تصنیف "الاعتدال فی مراتب الرجال" ان کے اس ذوق' اس جامعیت' اور

اس توسط واعتدال کا آئینہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے ان کو نوازا تھا، اور جس نے بارہا ان دینی گروہوں میں جو سب کے سب ایک ہی مرکز وایک ہی مسلک سے وابستہ تھے، وصل واتحاد کا بہت کام انجام دیا ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ مختلف مذاق کے لوگ اور مختلف مشائخ سے تعلق رکھنے والے اپنی علمی و عملی مشکلات کی الجھنوں کے موقعوں پر شیخ کی طرف رجوع کرتے، اور ان کو اطمینان بخش اور فیصلہ کن جواب ملتا۔

سوز و گداز و محبت اور خود انکاری و تواضع

شیخ کے علم، تصنیفی انہماک، وقار و سکینت اور ضبط و تحمل کے فانوس میں عشق و محبت کا ایک ایسا شعلہ تھا، جو جاننے والوں کی نگاہوں سے مستور نہیں، ان کا خمیر عشق و محبت کے اس جوہر کے ساتھ گوندھا گیا تھا، اور وہ شاید ان کے خمیر کے تمام اجزاء و عناصر سے زیادہ مقدار میں تھا، ان کا حال وہ تھا، جو سوداؔ نے اپنے شعر میں بیان کیا ہے ؎

آدم کا جسم جب کہ عناصر سے مل بنا
کچھ آگ بچ رہی تھی سو عاشق کا دل بنا

عشق و محبت کے اس جوہر کا اندازہ اس وقت ہوتا، اور اس کے شرارے اسی وقت نظر آتے، جب عشق الٰہی، ذات رسالت پناہی، اور واصلان بارگاہِ الٰہی کا تذکرہ ہوتا، راقم سطور نے اپنے پہلے سفر حجاز کے موقعہ پر مدینہ طیبہ سے ایک خط لکھا، جس میں مدینہ کے راستہ کی کیفیات، اور بعض نعتیہ اشعار تھے، جب یہ خط پہونچا تو شیخ کی عجب کیفیت تھی، جو لوگ پاس موجود تھے، ان کا بیان ہے کہ ایک عزیز خادم[1] سے جو خوش الحان بھی تھے، ان اشعار کو ترنم

---

[1] مولوی عبد المنان صاحب دہلوی مرحوم مراد ہیں۔

کے ساتھ پڑھنے کی فرمائش ہوئی، گرمی کا زمانہ تھا، رمضان کے ایام تھے، اعتکاف کا موقعہ تھا، اس وقت کچھ لوگ شیخ کا بدن دبا رہے تھے، دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ جس وقت ان صاحب نے یہ اشعار پڑھے، اس وقت شیخ فرطِ شوق، اور شدتِ جوش میں بالشت بالشت بھر اچھل جاتے، جو لوگ بدن دبا رہے تھے، ان کو محسوس ہو رہا تھا کہ شیخ کے جسم میں ایک بجلی سی پیدا ہو گئی ہے، اور وہ اپنی کیفیت کو کسی طرح چھپا نہیں سکتے، راقم سطور نے خود بارہا دیکھا کہ وہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے حالات اپنے ایک مسودہ سے[1] حضرت رائے پوری کو سنا رہا ہے، شیخ پاس کی چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے، ان پر گریہ کا اتنا غلبہ ہوا کہ چارپائی ہلنے لگی، مولانا محمد یوسف صاحب کی معیت میں حج ہوا، اسی سے واپسی کے موقعہ پر اس طرح بلک بلک کر رونے لگے جیسے بچہ اپنی ماں کی گود سے علیحدہ کیا جائے تو وہ بے قرار ہو کر روتا اور بلکتا ہے[2]۔

اس سرزمین مقدس اور دیارِ حبیب سے ان کی روح اور قلب کو جو تعلق اور وابستگی ہے، اور اس کے چھوٹنے پر ان کے دل پر جو کچھ گذر رہی تھی، اس کا کچھ اندازہ ان سطور سے ہوگا جو ان کے ایک مخلص خادم نے ان سطور کے راقم کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھی تھیں:۔

> "طائف سے واپسی پر عمرہ کر کے (جعرانہ سے احرام باندھا تھا) دوسرے روز جدہ روانگی ہو گئی، حدودِ حرم کے ختم پر جو کنواں ہے، وہاں مغرب کا وقت ہوا، نماز کے بعد سوار ہونے کے وقت حضرت پر گریہ طاری ہوا، پھر جدہ پہونچکر محمد علی خاں صاحب کے مکان پر رات قیام تھا، ساری رات عجب بے چینی میں گذری، حضرت کی خدمت میں صرف محترمی ابوالحسن صاحب اور بندہ موجود تھے، اور باقی خدام و حضرات

---

[1] تاریخ دعوت و عزیمت جلد ۳ [2] روایت صوفی محمد اقبال ہوشیارپوری۔

حضرت جی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ دوسرے کمروں میں تھے، حضرت بار بار اٹھ کر بیٹھتے اور ہم لوگ بھی آہٹ پاکر اٹھ جاتے، اور کسی وقت سوئے بنے رہتے، اور دیکھتے رہتے، بندہ کو ۲۲ سال سے کئی دفعہ کافی کافی عرصہ کے لئے حضرت کی خدمت میں رہنا ہوا، سفر حضر، عزیزوں و بزرگوں کی اموات، رمضان المبارک کی راتیں، حج کا سفر، سفر عرفات وغیرہ، مختلف اوقات و حالات میں حاضری نصیب ہوئی، مگر ایسی حالت پہلے کبھی نہ دیکھی تھی، کبھی کھڑکی سے منہ نکال کر گلی میں راستوں کو دیکھ رہے ہیں، اور فرما رہے ہیں، ابوالحسن آج اور عرب کی زمین دیکھ لے، کل کو جانا ہی ہے، دوسرے روز ہوائی اڈہ پر انتظار میں ویٹنگ روم میں بیٹھنا ہوا، موسم حج اور اپنے ساتھ پاکستان جانے والوں کا کثیر مجمع، اور جدّہ میں رخصت کرنے والوں کے ہجوم کی وجہ سے کافی وقت بیٹھنا ہوا، بندہ نے حضرت کو روتے ہوئے پہلے بھی بہت کثرت سے دیکھا ہے، اکثر اوقات تو ایسا کہ اجنبی کو تو ظاہر نہ ہوتا تھا، لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا تھا کہ حضرتؒ رو رہے ہیں، اور بعض وقت دیکھنے والوں کو محسوس ہو جاتا تھا کہ نماز، تلاوت وغیرہ میں حضرت رو رہے ہیں، لیکن آنسوؤں کی کثرت کا دستور نہ تھا، اور یہ قانون تھا کہ ایسی حالت میں جب کوئی ملنے والا آگیا، یا کوئی دوسرا موضوع سامنے آیا، جس میں کسی سے ہنسی مذاق، اور خندہ پیشانی کی ضرورت ہوتی، یا کسی کو ڈانٹ ڈپٹ کی ضرورت ہوتی، تو ظاہری طور پر حضرت کی وہ حالت فوراً ختم ہو جاتی، اور آنے والے کو کچھ محسوس نہ ہوتا، وقت کے حق کے مطابق حالت ہو جاتی۔

اس رخصتی والے دن کی حالت بالکل نرالی تھی، حضرت تشریف فرما تھے،

اردگرد کافی مجمع تھا، لیکن حضرت ایسے بیٹھے ہوئے تھے، جیسا کہ بالکل اکیلے ہوں،
کوئی بات، کلام، توجہ نہ تھی، بے تحاشہ رو رہے تھے، آنسو آنکھوں سے مسلسل بہہ رہے
تھے، کرتا تربتر ہو رہا تھا، چہرہ مبارک سرخ اور آنکھوں کے پانی سے ایسا ڈھل رہا
تھا، جیسا کہ کوئی نل کے نیچے بیٹھا ہو، بس آواز تو نہیں تھی، حضرت ہاتھ ڈھیلے کئے
بیٹھے تھے، لوگ چپ چاپ مصافحہ کرتے جاتے تھے، ایک دہشت سی تھی، اسی حالت
میں رخصتی ہوئی، چونکہ اس قسم کی حالت ہمیشہ مخفی رکھنے کی عادت تھی، اس لئے
اگر خود نہ دیکھا ہوتا تو مجھے بھی یقین نہ آتا، بیان کو مبالغہ سمجھتا، اور اب اس لکھنے کو
ناکافی سمجھ رہا ہوں۔"[1]

اسی محبت اور اخلاص نے ان کے درس، ان کی تصنیفات، اور ان کے ساتھ بیعت وارادت کے تعلق میں وہ تاثیر اور کیفیت پیدا کر دی تھی، جو اہلِ عشق کے ساتھ مخصوص ہے۔

ان کمالات کے ساتھ جن سے اللہ تعالےٰ نے ان کو نوازا تھا، اور اس محبوبیت واختصاص کے باوجود، جو ان کو اکابر وشیوخ کے حلقہ میں ہمیشہ سے حاصل رہا تھا، وہ اپنے کو کس نظر سے دیکھتے تھے، اور دعاءِ نبوی "اللهم اجعلني في عيني صغيرًا وفي أعين الناس كبيرًا" کا ان کی زندگی میں کس قدر ظہور ہوا تھا، اس کا کچھ اندازہ مندرجہ ذیل اقتباسات سے ہوگا، جو ان گرامی ناموں سے ماخوذ ہیں، جو اس عاجز کے نام حجاز بھیجے گئے تھے:-

"بعد سلام مسنون، رائے بریلی والا پرچہ پہونچا، روانگی سے قبل ملاقات کو تو بندہ کا بھی دل چاہتا ہے، مگر وقت تنگ رہ گیا، یہاں تشریف لانا ایسے تنگ وقت میں

---

[1] مکتوب صوفی محمد اقبال صاحب بنام ابوالحسن علی۔

دشوار ہوگا، اور مجھے بھی مولوی یوسف صاحب آج کل میں بلا رہے ہیں اس وقت
جاکر فوراً دوبارہ جانا مشکل ہے، میں نے ان کو کل لکھا تو ہے کہ بجائے اس وقت
کے اگر اس وقت بلائیں تو زیادہ اچھا ہے، آپ نے یہ نہیں لکھا کہ دہلی سے روانگی
کس وقت ہے، یا روانگی براہ سہارنپور ہے دہلی سے دریافت بھی کیا ہے مگر
وہاں سے جواب کا آنا بھی کارے دارد، بہرحال اگر ملاقات نہ ہوسکے تو اولاً اپنی
تمام تقصیرات اور بے عنوانیوں کی معافی چاہتا ہوں، ثانیاً ؎

جاتے ہو تو جاؤ، پر اتنا تو سن جاؤ
یاد جو آجائیں، تو مرنے[1] کی دعا کرنا

بارگاہِ رسالت پر پہونچکر اگر یاد آجائے تو یہ الفاظ بھی عرض کر دینا، ایک
روسیاہ ہندی ــ نے بھی سلام عرض کیا تھا، اگر ایک دو طواف بھی اس ناکارہ
کی طرف سے کر دیں، تو آپ جیسے کریم جفاکش حضرات سے امید ہے کہ بار نہ ہوگا
یہی چیزیں اس ناکارہ، اور نااہل کے لئے اعلیٰ تبرکات ہیں، کسی تبرک کے
لانے کا ہرگز ہرگز ارادہ نہ کریں، اس کا نعم البدل میں نے تعلقات کی قوت کے
زور میں خود ہی تجویز کر دیا کہ مجھے کھجور، زمزم وغیرہ تبرکات کی بہ نسبت دعا
اور طواف کی مسرت بھی زیادہ ہوگی، اور احتیاج بھی زیادہ ہے۔

فقط والسلام زکریا مظاہر العلوم
۲۳ رجب ۱۳۹۶ھ

---

[1] کس پر؟ یہ کیا بتاؤں؟

"روضۂ اطہر پر دست بستہ صلوٰۃ وسلام،

بعد سلام مسنون، گرامی نامہ مورخہ ۱۳ر رمضان ۲۰ر ماہ مبارک کو پہونچا،
ہر چند کہ ماہ مبارک میں خط لکھنے کا وقت ارادہ سے کبھی نہیں ملتا، لیکن آپ کے
انتظار نے مجبور کیا کہ چند سطور تو لکھ ہی دوں۔

گرامی نامہ نے گرمی کے رمضان میں ایک شعلہ سا بدن میں پیدا کر دیا، اس کے سوا
کیا عرض کروں "هنیئاً لأرباب النعیم نعیمهم" آپ نے راستہ کی کیفیت اور
مناظر تحریر فرما کر سابقہ حالات اور پرانے واقعات یاد دلادئے، آپنے یہ تحریر
نہیں فرمایا کہ مدینہ طیبہ کا قیام کب تک ہے؟ تاکہ عید کے بعد کے عرائض کے
متعلق رائے قائم کر سکوں، ماہ مبارک اب قریب الختم ہے، اس میں دوسرا
عریضہ بظاہر نہ جا سکے گا، اس کے بعد تقریباً ایک عشرہ مسلسل مختلف اسفار ارائے پور
وغیرہ میں صرف ہوگا۔ روضۂ اطہر پر دست بستہ صلوٰۃ وسلام کی درخواست، جملہ
حضرات کی خدمت میں مکرر عرض ہے۔

زکریا (نظام الدین)
۲۲ر رمضان ۹۶ھ"

"بعد سلام مسنون، خیال بلکہ یقین تھا کہ دہلی میں الوداعی زیارت ضرور ہوگی،
اور اپنی بدحالی کو پیش کر کے کچھ مانگنے کی درخواست کرونگا، اپنے دہلی کے اس سفر
میں اہم مقصد آپ کی زیارت ہی تھی، مگر نظام سفر ایسا گڑبڑ ہوا کہ مجھے خود ہی
مولانا مولوی محمد منظور صاحب نعمانی کی معرفت یہ کہلانا پڑا کہ آپ سیدھے ہی
تشریف لے جائیں، مگر یہ ضرور ہے کہ نہ ملنے کا قلق ضرور رہا، اور رہے گا، اب
اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ ان حروف کے ذریعہ اپنی بدحالی کو پیش کروں،

آپ خود ہی اندازہ کرلیں گے کہ اس سے زیادہ محروم القسمت کون ہوگا، جس کو حضرت اقدس اور آپ جیسا بہترین رفیقِ سفر ملے، اور کرایہ کا اس کو اشکال نہ ہو، بظاہر کوئی مانع نہ ہو، پھر بھی وہ محروم رہے، تو اس کے سوا کیا ہوسکتا ہے کہ اس کی روسیاہی اس قابل نہیں کہ اس پاک دیار میں حاضری کی اجازت دی جاسکے، اب آپ سے انتہائی لجاجت سے درخواست ہے کہ ملتزم پر اور مواجہہ پر آپ اس ناپاک کے لئے جو کچھ کرسکتے ہوں کردیجئے، اللہ جل شانہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے، اور یہاں کے مسلمانوں کے لئے کیا کہنا ہے، یہ تو آپ کا دل مجھ سے بھی زیادہ جانتا ہوگا......

فقط والسلام
زکریا مظاہر العلوم
۱۴ ذی قعدہ ۶۹ھ

اس تعلق، باطنی کیفیت، اور عشق روحانی کا کچھ اندازہ کرنے کے لئے یہاں ان کے چند مکتوبات کا اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں، جو انھوں نے ازراہ شفقت وکرم راقم سطور کو حجاز کے دوران قیام میں (۱۳۶۹ھ ۱۹۵۰ء) دو حج کے موقعہ پر تحریر فرمائے ہیں:-

"ہمارا نام لے کر آہ بھی ایک کھینچو قاصد
جو وہ پوچھیں تو کہدینا یہ پیغام زبانی ہے

بعد سلام مسنون کراچی سے دو گرامی نامے پہنچے اول مفصل لفافہ، اور پھر مختصر کارڈ مگر وہ جواب کا وقت نہ تھا، آپ نے اس ناپاک کی معیت ورفاقت کی آرزو لکھی، مگر یہ نجس العین اس پاک خطہ کے قابل کہاں، دو مرتبہ حاضری ہوئی، مگر ایک طاہر ومطہر ہستی تھی جس کے پیچھے قطمیر[1] بھی

---

[1] اصحاب کہف کے ساتھ جو کتا لگ لیا تھا، اس کا نام بعض کتابوں میں قطمیر لکھا گیا ہے۔

لگ لیا، بلکہ حکماً لگا لیا گیا، اب کوئی پاک ہستی ایسا سمندر نظر نہیں آتا جس میں ہر قسم کی غلاظت مغلوب ہو جائے، فیا حسرتا آپ نہ معلوم کس مغالطے میں ہیں، اپنی حالت یہ ہے:۔

كان ظنّي بأن الشيب يرشدني　　إذا أتى فإذا غيّي به كثرا

بلکہ (اب حقیقت یہ ہے)

وكنت امرأ من جند ابليس فارتقى　　بي الدهر حتى صار ابليس من جندي

فلو مات قبلي كنت احسن بعده　　طرائق فسق ليس يحسنها بعدي

اس تعلق اور محبت کے واسطہ سے جو آپ کو اللہ رب العزت کی ستاری کی وجہ سے اس ناپاک سے محض مغالطہ کی وجہ سے رہا ہے، درخواست ہے کہ مبارک مہینہ میں مبارک راتوں میں، مبارک جگہ میں اگر دعا سے دستگیری فرمادیں، تو وہ پاک ذات، وہ مقلب القلوب، قادر مطلق جو عُلیج[1] کو عمر بنا دے اس کے لئے کیا مشکل ہے کہ ایک ناپاک کو پاک بنا دے، اور بدکار کو نیکوکار بنا دے ؎

چشمۂ فیض سے گر ایک اشارہ ہو جائے　　لطف ہو آپ کا اور کام ہمارا ہو جائے

عمر ختم ہوتی جا رہی ہے، ظاہری طور پر وقت قریب ہی آتا جا رہا ہے، اور حالت یہ ہے ؎

آئی تھی کچھ لین کو، اور بھول چلی کچھ اور　　کیا دکھاؤں گی اپنے پیا کو میں خالی دونوں ہاتھ

دیتے ہیں موئے سفید افسوس پیغام اجل　　نفس سنتا ہی نہیں ہر چند کہتا ہوں سنبھل

[1] شاید یہ حضرت عمر کا جاہلیت میں نام یا عرف تھا۔

اپنی حالت کو کہاں تک روؤں، اور اس منافقانہ تحریر سے آپ کے مبارک اوقات کو کہاں تک ضائع کروں یہ سطریں اس امید پر لکھی ہیں کہ آپ کے دل پر کچھ چوٹ لگے تو آپ اس پاک دربار میں کچھ عرض کر سکیں جس کی پاک جوتیوں کے ذرّے "لو اقسم علی اللہ لأبرّہ" کے مصادیق ہیں، بہت ادب سے صلوٰۃ و سلام کے بعد عرض کر دیں کہ اس ناپاک کا سلام اس پاک دربار کے ہرگز لائق نہیں، لیکن تم رحمۃ للعالمین ہو اس ناپاک کے لئے تمہاری نظر رأفت کے سوا کوئی ٹھکانا نہیں ہے ؎

نہ آخر رحمۃ للعالمینی ز محروماں چرا فارغ نشینی

یہ بھی عرض کر دیں کہ کچھ عرض کرنے کا منہ نہیں، اس لئے کیا عرض کروں..

فقط والسلام۔ زکریا۔ مظاہر علوم

۲۲ شعبان ۶۶ھ"

"ایک خصوصی درخواست آپ سے یہ بھی ہے کہ ملتزم پر ایک مرتبہ یہ بھی اس ناپاک کے لئے مانگ دیجئے ؎

من نگویم کہ طاعتم بپذیر
قلم عفو بر گناہم کش

کیا بعید ہے کہ گناہوں سے پاک صاف لوگوں کی زبان کسی ناپاک کی معافی کا ذریعہ بن جائے، اس میں کوئی تصنع نہیں کہ اپنی ساری گندگی کے باوجود جس چیز پر بڑا فخر اور اس کی بڑی ڈھارس ہے، وہ صرف یہ ہے کہ بچپن سے اس وقت پیری تک اللہ کا بہت بڑا کرم یہ رہا کہ ہر دور کے اکابر اہل اللہ کی

خصوصی شفقتیں انتہا سے زیادہ رہیں، اس پر جتنا بھی ناز ہو کم ہے، لیکن ساری خوشی ایک دم سناٹے سے بدل جاتی ہے، جب قیامت کے حکم "وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ" کا اعلان دل میں گذر جاتا ہے، کاش آپ سب مخلصوں، حسن ظن رکھنے والوں کے زور اس سال اس ناپاک کے اعمالنامۂ سیاہ کو بھی دھو ڈالیں، تو آپ سب کا کس قدر احسان اس ناپاک پر ہو، ورنہ جب کل کو میری ناپاک حالت آپ کے سامنے ہو گی تو آپ کو اپنے اس تعلق پر بھی افسوس ہو گا جو آپ نے اپنے اس مفصل گرامی نامہ میں تحریر فرمایا جو بمبئی سے لکھا.........

فقط والسلام
زکریا مظاہر علوم
۲۶ ذی قعدہ ۶۹ھ"

دینی حمیت اور مسلک صحیح کی حفاظت کا اہتمام

اللہ تعالیٰ نے کچھ تو فطری طور پر اور کچھ خاندانی اثرات سے شیخ کی طبیعت میں دین کی حمیت اور اپنے اسلاف اور علمائے حق کے (جو مجددی اور ولی اللہی سلسلہ سے مسلسل طور پر وابستہ رہے ہیں) مسلک سے وابستگی اور اس کے بارے میں غیرت و ذکاوت حس شروع سے ودیعت فرمائی تھی، جب بھی ہندوستان میں دین کے بقا و وجود، اور مسلمانوں کی جداگانہ ملّی و اسلامی شخصیت کے لئے کوئی خطرہ پیش آیا، تو ان کی طبیعت بے چین اور ان کا دل دردمند ہوا، اور انھوں نے اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے خود سعی، اور اہل اثر کو متوجہ کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔

انگریزی دور میں جب پہلی مرتبہ گورنمنٹ کی طرف سے جبریہ تعلیم کا قانون بنا تو شیخ نے اس سے سخت خطرہ محسوس کیا، انھوں نے اس کے خلاف ایک رسالہ "قرآن عظیم اور جبریہ تعلیم" تحریر فرمایا، یہ قانون اول اول دہلی میں نافذ ہوا تھا، رسالہ ۱۳ محرم ۱۳۵۰ھ (یکم جون ۱۹۳۱ء) کو لکھا گیا، اس میں اپنے نام کے ساتھ "مجروح القلب" لکھ کر دستخط کئے، جس سے ان کے جذبۂ دل کا اظہار ہوتا ہے۔

آزادیٔ ہند کے بعد (۱۹۴۸-۴۹ء) کے سنین میں پھر حکومت کی طرف سے جبریہ تعلیم کا قانون دوبارہ سامنے آیا تو شیخ نے پھر اس کا پورا نوٹس لیا، اور اس کے دوررس اثرات کا اندازہ کر لیا، اپنے ایک مکتوب میں جو اس عاجز کے نام ۳ رجمادی الثانیہ (۶ اپریل ۱۹۴۹ء) کو لکھا گیا ہے، تحریر فرماتے ہیں:-

"روز افزوں احوال سے یہ فکر سوار رہتا ہے کہ کوئی شخص اگر مسلمان رہنا بھی چاہے گا، تو شاید نہ رہ سکے، اور اس کا کوئی حل نہیں ملتا، آج کل مجھ پر جو چیز زیادہ مسلط ہے، وہ مکاتب کا مسئلہ ہے، ہر جگہ سے جبریہ تعلیم کے سلسلہ میں مکاتب کے بچوں پر لوگوں کا زور ہے، اور اس سلسلہ میں اگر کسی سے کچھ کہا جائے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کس سے کہا جائے؟ اور کیا کہا جائے؟ جن سے امیدیں وابستہ ہو سکتی تھیں ان سے جب اس کا ذکر کیا جاتا ہے تو وہ بہترین لچھے دار، اور زوردار تقریر سے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ مکاتب کا یہ سلسلہ محض اضاعت اوقات ہے، بچوں کا وقت ضائع ہوتا ہے، قومی تعلیم بالخصوص ہندی پڑھنے کی دینی ضرورت اس درجہ بتائی جاتی ہے، جس درجہ کی سرسید کے خیال میں انگریزی کی بھی نہیں آئی ہوگی۔

"واللہ المستعان"

اسی طرح وہ اس مسلک توحید واتباع سنت، ورد بدعات کے شدت سے حامی ومحافظ تھے، جو ان کو وراثتاً وتعلیماً وتربیتاً اپنے اسلاف واساتذہ ومشائخ سے ملا تھا، ہندوستان کی آزادی وتقسیم ملک کے بعد کچھ سیاسی وانتظامی مصالح کی بناء پر بعض ایسے علماء کی طرف سے جو ہندوستان کے حالات کے پیش نظر مسلمانوں کے ایک جگہ مجتمع ہونے، اور اس ملک میں رہنے کے فیصلہ کو ہر مسئلہ پر مقدم رکھتے تھے، مصلحتاً بعض ایسے اجتماعات کی نہ صرف اجازت دی گئی، بلکہ ان میں وہ خود شریک بھی ہوئے، اس سلسلہ میں بعض حضرات نے بزرگان دین کے ان عرسوں کو دوبارہ قائم کرنے کو مفید سمجھا جن میں مسلمان بڑی تعداد میں شریک ہوتے تھے، اور ایک دوسرے سے ملتے تھے، تقسیم کے بعد وہ بند ہوگئے تھے، یا بہت پھیکے پڑ گئے تھے، شیخ کو جب اس طرح کی اطلاعات ملی تو ان کے دل کو بڑی چوٹ لگی، اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"اللہ کی شان، انقلابات زمانہ، اور اپنے اعمال بد کے ثمرات، دیوبندی جماعت جو عرس کے بند کرنے کی ہمیشہ ساعی رہی، اب وہ عرسوں کو فروغ دینے والے بن گئے، جس شخص کے بڑے نظام الدین کے عرس کے زمانہ میں بستی بھی چھوڑ دیا کرتے تھے، اُن کا ناخلف یہ سوچتا ہے کہ اس موقعہ پر جایا جائے، تاکہ پاکستان سے آنے والے احباب سے جن کو عرس کے عنوان سے اجازت مل جاتی ہے، ملاقات ہو جائے۔"

۴۹ء میں ایک مرتبہ شیخ کی نظر اخبار "الجمعیۃ" کے ایک اشتہار پر پڑی، جس میں "شیخ الہند جنتری" کا اعلان تھا، اخبار کے ایک شمارہ میں اس پر ایک تبصرہ کے دوران لکھا گیا کہ اس کی بڑی قدر وقیمت اس بات سے ہے کہ اس میں شیخ الاسلام مولانا مدنی ؒ کی تصویر ہے، اور اس سے کتاب کی ساری قیمت وصول ہو جاتی ہے، شیخ سے رہا نہیں گیا،

اور انھوں نے اس کی پروا نہیں کی کہ یہ اخبار علمائے دیوبند کا پرچہ ہے' اور جمعیۃ العلماء کی قیادت ان کے محبوب ترین اور معزز ترین بزرگوں اور دوستوں کے ہاتھ میں ہے' اس تبصرہ کو دیکھتے ہی ناچیز کے نام ایک مکتوب تحریر کیا جس میں فرماتے ہیں:۔

"ایک ضروری امر کی طرف آپ کی اور مولانا منظور صاحب کی توجہ مبذول کراتا ہوں "شیخ الہند جنتری" کے نام سے کوئی جنتری طبع ہوئی ہے' جس کو میں نے اب تک دیکھا نہیں' لیکن اس کا اشتہار جمعیت کے پرچوں میں' اور جمعیت نمبر میں طبع ہوا ہے' اگر اب تک نہ دیکھی ہو تو جمعیت نمبر میں اس کا اشتہار ملاحظہ فرماویں' اس کے متعلق اخبار "الجمعیۃ" ۱۹ اپریل ص۳ پر تبصرہ شائع ہوا ہے' اس میں حضرت مدنی زاد مجدہم کی تصویر کی مدح سرائی کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ جنتری کی پوری قیمت صرف اس ایک تصویر سے وصول ہو جاتی ہے' یہ مشائخ وعلماء کے آرگن کے لئے نہایت نامناسب ہے' یہ حضرات تصویر کشی کی تقبیح نہ کریں تو کم از کم مدح سرائی تو نہ کریں' اس کے متعلق اگر آپ حضرات کے نزدیک نامناسب نہ ہو تو "الفرقان" اور "تعمیر" دونوں میں تنقید ضروری ہے"!

(۲۷ جمادی الآخرۃ ۶۹ھ)

اسی طرح ایک مرتبہ شیخ نے ایک قابل احترام دیوبندی عالم اور بزرگ کے متعلق سنا کہ وہ ۱۲ ربیع الاول کے ایک میلادی جلسہ میں شرکت فرمانے والے ہیں' شیخ نے اس پر اس ناچیز کو لکھا:۔

"ابھی چند روز ہوئے اخبار میں ۱۲ ربیع الاول کے میلادی جلسہ میں ..... کی شرکت کا وعدہ پڑھا' جب سے سوچ میں ہوں کہ جس چیز پر اکابر نے ایسے ایسے

خم ٹھونکے وہ ایسی بن گئی کہ اخبار جمعیۃ تو گویا اس کے پروپیگنڈہ کے لئے
وقف ہو گیا"۔ (مکتوب ۱۱ ربیع الاول ۷۴ھ)

اس جذبہ کا نتیجہ تھا کہ شیخ نے بڑے اہتمام و تاکید سے مجھے حضرت مولانا شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ کے رسالہ "تقویۃ الایمان" کے (جو اس جماعت کے مسلک کا پورا ترجمان ہے، اور اس میں توحید خالص کی ایسی کھلی طاقتور دعوت دی گئی ہے جس کی نظیر ملنی مشکل ہے) عربی ترجمہ کا حکم دیا ۱۳۹۳ھ کے ذی الحجہ (دسمبر ۱۹۷۳ء) میں جب راقم سطور مدینہ طیبہ میں حاضر تھا، مجھ سے ارشاد ہوا کہ میں اس کتاب کو عربی میں منتقل کروں، میں نے وعدہ کر لیا، لیکن شیخ کو اطمینان نہیں ہوا، عزیزی سید محمد واضح ندوی کے ذریعہ (جو میرے رفیق سفر تھے) مجھے پیغام دیا کہ میں مدینہ طیبہ سے رخصت ہونے سے پہلے اس کام کو مسجد نبویؐ میں شروع کر جاؤں، چنانچہ عین رخصت کے دن ۲۹ یا ۳۰ ذی الحجہ کو زوال سے پہلے باب جبرئیل و باب الرحمۃ کے درمیان بیٹھ کر حجاج کے ہجوم، اور ذکر و تسبیح و درود کے شور کے درمیان میں نے اس کے مقدمہ کا ابتدائی حصہ لکھا، اور اسی وقت واضح سلمہ نے اس کو شیخ کو جن کی نشست باب عمر کے قریب ہوتی تھی، جا کر سنا دیا، شیخ نے بڑی دعائیں دیں، اور تحسین فرمائی، ۱۳۹۴ھ کی آخری تاریخوں میں ترجمہ مکمل ہو گیا، جابجا ضروری و مفید حواشی لکھے تھے، اور ایک مفصل مقدمہ اور ترجمۂ مصنفؒ لکھی[1]، طباعت کے بعد شیخ نے اس کو بڑی تعداد میں خرید کر احباب و خدام اور اہل علم میں تقسیم کیا۔

---

[1] یہ عربی ایڈیشن جو "رسالۃ التوحید" کے نام سے ندوۃ العلماء کے پریس سے شائع ہوا، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نصاب میں داخل ہے، اور ضرورت ہے کہ اس مسلک کی دوسری درسگاہوں اور مدارس عربیہ میں بھی اس کو داخل نصاب کیا جائے۔

اس دینی حمیت اور شرعی حمایت کا نتیجہ تھا کہ مدینہ طیبہ میں ایک ایسے مسئلہ پر جس میں "عموم بلویٰ" تھا قلم اٹھایا، اور داڑھی کے وجوب پر ایک رسالہ لکھا جس کا عربی میں بھی ترجمہ ہوا، اور اہل عرب میں اس کی وسیع پیمانہ پر اشاعت ہوئی، جن میں اس بارے میں بڑا تساہل شروع ہوگیا تھا۔

یہی جذبہ تھا جس نے ان کو جماعت اسلامی کے فکر، اور بانیٔ جماعت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی تحریروں کے احتساب اور ان پر تنقید کرنے پر مجبور کیا جب ان کے علم اور ذاتی تجربہ میں یہ بات آئی کہ ان کے اسلاف و مشائخ نے اپنی پیہم کوششوں سے اس برصغیر میں خدا طلبی کا جو عام ذوق، محبت الٰہی و عشق رسول کی چنگاری، اور اصلاح و تربیت نفس کا جو جذبہ پیدا کر دیا تھا جس کا عمومی اور طاقتور ذریعہ "تصوف" تھا، نیز اپنے درس و تلقین عمل اور تصنیفات سے کسی ایک مسلک فقہی سے وابستگی کی ضرورت کا جو احساس پیدا کر دیا تھا، اور ہر شخص کے مجتہد بن جانے کے خطرہ کا بہت حد تک سدباب ہوگیا تھا (جس کا اس انتشار پذیر معاشرہ میں پورا امکان تھا) اور ائمۂ مجتہدین کے ساتھ بالخصوص، اور سلف کے ساتھ بالعموم حسن ظن، اعتماد و احترام قائم کر دیا تھا، ان تمام کوششوں پر ان تحریروں سے اثر پڑ رہا ہے، اور دین کی اصل بنیاد و حقیقت تعلق باللہ و عبودیت، فکر آخرت اور ایمان و احتساب پر دین کا سیاسی و تنظیمی تصور غالب آ رہا ہے، تو وہ بے چین ہوگئے، اور ان کے قلم سے اپنے ایک قدیم رفیق اور دوست[1] کے نام وہ طویل مکتوب نکلا جو ان کی غیر موجودگی میں

---

[1] اس سے مراد مولانا زکریا قدوسی گنگوہی مرحوم ہیں، جو مدرسہ مظاہر العلوم کے قدیم فاضل اور استاد و مدرس تھے، یہ مکتوب ۱۳۹۵ھ میں لکھا گیا، اور شیخ کے نجی مکتوب ہونے کی بنا پر اس کی اشاعت ہوا

(باقی ص ۲۱۴ پر)

مستقل رسالہ کی شکل میں "فتنۂ مودودیت" کے نام سے شائع ہوا، دوبارہ ان کی تجویز سے "جماعت اسلامی ایک لمحۂ فکریہ" کے نام سے اس کی اشاعت ہوئی[1]۔

اسی دینی حمیت کا نتیجہ تھا کہ جب مصر کے صدر اور قائد جمال عبدالناصر کے اقدامات سے اور قومیت عربیہ اور اشتراکیت کی کھلی ہوئی دعوت سے نہ صرف مصر بلکہ پورے مشرق وسطیٰ میں دینی فکر و دعوت اور ذات نبویؐ اور اسلام کے پیغام سے عربوں کی وابستگی خطرہ میں پڑ گئی تھی لیکن جمال عبدالناصر[2] کے چند جرأت مندانہ اقدامات کی بنا پر جن میں اس کو کامیابی ہوئی تھی، اور مغربی طاقتوں کو للکارنے کی وجہ سے ہندوستان میں علماء کا ایک بڑا گروہ اور بعض ایسی جماعتیں بھی (جن کی بنیاد اسلام کی حمیت و حمایت پر پڑی تھی) جمال عبدالناصر کی مداح اور مؤید بن گئیں، اس وقت حضرت شیخ کی مجالس میں جمال عبدالناصر کے بارے میں کھلے طریقہ پر ناپسندیدگی کا اظہار، اور اس کے متعلق سخت الفاظ استعمال ہوتے تھے، یہاں تک کہ رمضان مبارک کے مشغول اوقات میں، اور عشاء کے بعد کی ایک بھری مجلس میں حضرت شیخ نے

(باقی ص۲۱۳ کا) احتیاط فرمائی، شیخ کے قیام مدینہ کے دوران ان کے بعض عزیزوں نے مکتوب کی اہمیت و ضرورت اور وقت کا ایک اہم مسئلہ سمجھ کر ۱۹۷۵ء میں اس کو رسالہ کی شکل میں شائع کر دیا۔

[1] اس نئے نام سے اس کا دوسرا ایڈیشن پہلی مرتبہ کراچی سے شائع ہوا

[2] جمال عبدالناصر کی بے تدبیری اور لاف زنی ہی کے نتیجہ میں مسلمانوں کو مدت مدید کے بعد مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) شہر قدس، شہر الخلیل (مدفن سیدنا ابراہیم) اور پورے ضفۂ غربیہ بلکہ صحرائے سینا سے بھی ہاتھ دھونا پڑا، افسوس ہے کہ وہ صورت حال ابھی تک قائم ہے اور بیروت کے تازہ واقعہ اور فلسطینیوں کی وہاں سے بے دخلی کے رسوا کن حادثہ نے زخم پر اور بھی نمک پاشی کا کام کیا ہے ؎

چوں از قوم یکے بے دانشی کرد　　نہ کہ را منزلت ماند نہ مہ را

محمد میاں مرحوم کا ایک سخت تنقیدی مضمون جو ندوہ کے اردو رسالہ "تعمیر حیات" میں شائع ہوا تھا، بلند آواز سے پڑھوایا، اور حاضرین کو سنوایا، جو شاید بعض حاضرین مجلس کو گراں بھی گذرا، لیکن شیخ نے پروا نہیں کی۔

ذکر و روحانیت اور وقت کے مسلّم مشائخ اور اہل اللہ کی طرف توجہ دہانی

حضرت شیخ باوجود اپنے بلند روحانی مقام، اور مرجع خلائق ہونے کے اپنے اہل تعلق کو اپنے وقت کے مستند و مسلّم مشائخ، بالخصوص شیخ وقت حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری کی طرف اصرار و تاکید سے متوجہ فرماتے رہتے تھے، اور اس سے ان کی للّٰہیت، بے نفسی اور خلوص کا پورا اظہار ہوتا ہے، میرے نام ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"رائے پور کے متعلق میں بھی اصرار سے عرض کروں گا کہ مشاغل کی مزاحمت کے باوجود کبھی کبھی گنجائش نکال لیا کریں، چچا جان[1] تو تشریف لے ہی گئے، مولانا کا وجود بھی چراغ سحری ہے، مشاغل تو آدمی کے ساتھ لگے ہی رہتے ہیں، اس سے کب خلاصی ہو سکتی ہے[2]"۔

ایک دوسرے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"رائے پور کے جناب کے سفر کی حقیقی اہمیت بندہ کے نزدیک بہت ہے، اس کو بار بار کیا عرض کروں، بندہ تو بہت ہی ضروری خیال کرتا ہے کہ اہل حضرات وہیں جائیں، جب بھی موقعہ مل سکے چند روز یکسوئی کے ساتھ ضرور تشریف لائیں[3]"۔

اس بار بار کے تاکید کی وجہ یہ تھی کہ شیخ تمام دینی، و علمی و اصلاحی کاموں، اور

---

[1] حضرت مولانا محمد الیاسؒ [2] مکتوب ۱۴ر جمادی الثانیہ ۶۴ھ [3] مکتوب ۷ر محرم ۶۵ھ

خود دعوت و تبلیغ کے لئے اخلاص و للہیت، حیات قلبی، اور حرارت باطنی کو ضروری سمجھتے تھے، جو ان کے نزدیک بمنزلۂ اسٹیم کے تھی، جس کے بغیر دین کی کوئی گاڑی چلتی نہیں، اپنے ایک مکتوب (مورخہ ۲۶ ر ذی قعدہ ۶۴ھ) میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"انجن میں آگ کی ضرورت ہوتی ہے اور للّٰہی آگ انھیں درباروں سے ملتی ہے"۔

ایک دوسرے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"میرا یقین ہے کہ فتن کا علاج اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے، اور اسی جذبہ کے تحت ملکوں ملکوں پھر رہا ہوں کہ خانقاہیں دنیا سے ختم ہی ہو گئیں[1]"۔

ان کے نزدیک کم از کم درجہ یہ تھا کہ ان حضرات اہل اللہ سے دل میں کدورت نہ رکھی جائے، یہ مضمون ان کی تحریروں میں بار بار آیا ہے، اور اس سوءِ ظن، کدورت، اور اعتراض پر بار بار نکیر فرمائی ہے، اپنے مشہور رسالہ "الاعتدال فی مراتب الرجال" میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"میں اپنے سے تعلق رکھنے والوں کو خاص طور سے متوجہ کرتا ہوں، اور کرتا رہتا ہوں کہ وہ اللہ والوں سے ذرا بھی دل میں کدورت نہ رکھیں، ورنہ مجھ سے تعلق نہ رکھیں"۔

شیخ کا یہ مشورہ صرف اپنے خوردوں، اور نیازمندوں ہی کے لئے نہیں تھا، خود بھی بڑے اہتمام سے رائے پور حاضر ہوتے، اور کئی کئی دن، اور کئی کئی وقت رہتے، جس زمانہ میں حضرت کا بہٹ ہاؤس (سہارنپور) میں طویل قیام تھا، شیخ کا بلا تخلف روزانہ کا معمول تھا کہ عصر کی نماز پڑھ کر فوراً بہٹ ہاؤس تشریف لے جاتے، اس اندیشہ سے کہ کچھ تاخیر نہ ہو جائے،

---

[1] مکتوب ۵ رمئی ۱۹۸۱ء

شام کی چائے جو عمر بھر کے معمولات میں شامل تھی، مستقلاً چھوڑ دی تھی، حضرت کو جب اس کا علم ہوا، تو بہت ہاؤس میں اس کا انتظام فرمانے کی تاکید کی، لیکن شیخ نے اصرار سے منع فرمادیا، اخیر زمانۂ قیام میں رائے پور میں باوجود اس کے کہ سفر خاص حالات وکیفیات کی بناء پر شیخ کے لئے مجاہدۂ عظیم تھا، ہر ہفتہ کا معمول تھا کہ جمعہ کی شام کو تشریف لے جاتے، اور پیر کی صبح تشریف لاتے۔[1]

یہی حال حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ کی تشریف آوری کے موقعہ پر تھا کہ اطلاع ملنے پر رات کو جاگ کر اسٹیشن پر تشریف لے جاتے، اور وہ اہتمام واحترام فرماتے جو مشائخ کے ساتھ ہوا کرتا ہے، مولانا کے قیام دیوبند کے زمانہ میں بھی وقتاً فوقتاً وہاں تشریف لے جاتے، اور ملاقات کرتے۔

دینی کوششوں اور علمی کاموں کی قدردانی وہمت افزائی اور علمی ذوق

حضرت شیخ کو اللہ تعالیٰ نے ایسی وسیع القلبی، وسیع النظری، اور دین سے نسبت رکھنے والے کاموں کی قدردانی کا جذبہ عطا فرمایا تھا کہ وہ ہر اس کام کی ہمت افزائی، اور اگر ممکن ہو تو اس میں تعاون کے لئے آمادہ رہتے تھے، جس میں ان کو دین کا فائدہ یا علم کی ترقی نظر آئی، تبلیغی جماعت، مرکزی مدارس (مظاہر علوم، دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء) کا تو کیا ذکر، کہیں بھی کوئی صحیح دینی اصلاحی، علمی کوشش، ان کے علم میں آجاتی تو اس کی پوری داد دیتے، اور ہمت افزائی فرماتے۔

میرے سفر امریکہ کی تقریروں کا مجموعہ "نئی دنیا امریکہ میں صاف صاف باتیں" شیخ نے

---

[1] "سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری" ص ۳۱۳

پڑھوا کر سُنا تو فوراً مجھے خط لکھا کہ :-

"آپ کی امریکہ کی تقریریں بہت پسند آئیں، بڑے غور سے سنا مگر یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ اہلِ امریکہ کے ان سے متاثر ہونے کی کیا صورت ہے آپنے لاؤڈ اسپیکر پر تقریر کردی، اور نیاز مندوں نے چند نسخے چھاپ دیئے، میری تو رائے ہے کہ جتنی زیادہ سے زیادہ اس کی انگریزی، عربی میں طباعت کی صورت ہو سکے بہتر ہے، اس کی اشاعت کی بہت زیادہ ضرورت ہے، اگر آپ کے ذہن میں اس کی کوئی صورت ہو تو ضرور لکھیں، میرا تو یہ خیال ہے کہ اہلِ خیر کو متوجہ کر کے ایک لاکھ کے قریب نسخے انگریزی، عربی، اردو کے خوب تقسیم کئے جائیں، اگر لکھنؤ میں اردو میں چھپے تو ایک ہزار میرے ہیں، جو پڑت ہو وہ بھیج دوں گا، اور میرے ایک ہزار طباعت کے بعد حاجی یعقوب کے پاس بھیج دیں[1]"

حضرت شیخ کو دار العلوم ندوۃ العلماء میں تربیت مدرسین کے انتظام کی ایک اطلاع ملی، اس پر تحریر فرمایا:-

"تربیت مدرسین کی خبر سے بہت ہی مسرت ہوئی، اللہ تعالیٰ مبارک فرمائے، اگر یہ مبارک مجمع موجود ہو تو سلام مسنون[2]"

اکتوبر، نومبر ۱۹۷۵ء میں جب دار العلوم ندوۃ العلماء کے قیام پر پچاسی سال گذر جانے کی تقریب میں ایک عالمی اجلاس ہوا جس میں عرب ملک کے فضلاء و اعیان کو

---

[1] خط پر تاریخ نہیں ہے، بہر حال سفر امریکہ کے بعد کا خط ہے، جو مئی ۱۹۷۷ء میں ہوا تھا، اور واپسی اگست میں ہوئی، دوسرے مکتوب میں جو ۲۱ مئی ۱۹۷۸ء کا لکھا ہوا ہے، مطلوبہ نسخوں کی تعداد دو ہزار کردی گئی۔ [2] مکتوب ۱۲ ذی الحجہ ۱۳۸۹ھ

خاص طور پر دعوت دی گئی،[1] شیخ نے نہ صرف اس کی کامیابی کے لئے دعائیں کیں، بلکہ اس کو بالکل اوڑھ لیا، جب تک وہ اجلاس کامیابی اور خیر خوبی کے ساتھ ختم نہیں ہو گیا، شیخ کا پورا دل اس میں لگا رہا، ہر آنے جانے والے سے وہاں کے حالات و خیریت دریافت کرتے تھے، لوگوں نے بیان کیا کہ سونے کی حالت میں بھی شیخ کو اس کے متعلق ہدایات دیتے ہوئے سنا گیا، ختم ہونے کے بعد مجھے مبارک باد کا خط لکھا، جس میں آئندہ کے لئے بھی ہدایات تھیں، بعض خدام سے فرمایا کہ تم جانتے ہو کہ یہ اجلاس کس نے کرایا؟ یہ میں نے کرایا؟

یہی نہیں بلکہ کوئی مفید علمی کام ہوتا تو اس کی ہمت افزائی اور تائید فرماتے، اور اس میں امکانی تعاون کے لئے تیار رہتے، میرے والد ماجد مولانا حکیم سید عبد الحی صاحبؒ کی شہرۂ آفاق کتاب "نزہۃ الخواطر" کی سات جلدیں دائرۃ المعارف حیدر آباد نے شائع کی تھیں آٹھویں جلد میں تاریخ وفات، تصنیفات وغیرہ کے سلسلہ میں جا بجا بیاض تھے، جو مصنف کی وفات ہو جانے کی وجہ سے باقی رہ گئے تھے، اور ان کا پُر کرنا اور کتاب کا مکمل کرنا ان کے فرض شناس اور سعادت مند اخلاف کے ذمہ تھا، لیکن یہ کام بڑا دشوار تھا، صرف ان شخصیتوں کی تعداد کئی سو تھی، جن کی وفات مصنف کے بعد ہوئی تھی، ناچیز راقم سطور نے فاضل گرامی ڈاکٹر عبد المعید خاں ناظم دائرۃ المعارف کے اصرار سے اس کام کا بیڑہ اٹھایا، اور اس سلسلہ میں اہل علم سے رابطہ قائم کیا، اخبارات میں اعلان کیا اور خطوط لکھے لیکن بہت کم جوابات آئے، اور بہت کم لوگوں نے تعاون اور مدد کی، اس سلسلہ میں حضرت شیخ سے بھی مراسلت کی جن کے یہاں وفیات لکھنے کا بڑا اہتمام تھا، اور خود ان کی تاریخ کبیر میں اس کا بڑا مواد تھا، میرے عریضہ کے

---

[1] اس کے مفصل حالات کے لئے ملاحظہ ہو "روداد چمن" از سید محمد الحسنی مرحوم، شائع کردہ مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء۔

جواب میں ان کا جو مکتوب آیا، اس کا ایک اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے :۔

"میرا خود دل چاہتا ہے کہ "نزہۃ" کی تکمیل میں جو بھی خدمت ہو سکتی ہے، وہ موجب سعادت ہے، میں تو آپ سے درخواست کرتا کہ جن کی وفیات کی تلاش ہے، ایک فہرست مجھے بھی بھیج دیں، مگر آنکھوں نے اس کے ساتھ ہی ٹانگوں نے ایسا معذور بنا دیا کہ نہ اپنے کتب خانہ کی کتابیں تلاش کی جاتی ہیں، اور نہ مدرسہ جا سکتا ہوں .... نزہۃ کی طباعت کا تو بہت ہی اشتیاق ہو رہا ہے، اللہ کرے کہ میری زندگی میں طبع ہو جائے، اور خدا کرے کہ کوئی سنانے والا بھی مل جائے تو ضرور سنوں گا، "ارکان اربعہ[1]" کو بھی ضرور بھیجیں، اللہ کرے کوئی سنانے والا مل جائے[2]"

ایک دوسرے مکتوب میں جو اس سے پہلے کا لکھا ہوا ہے، اور جس میں اس کے بعض حصوں کی رسید ہے، تحریر فرماتے ہیں :۔

"نزہۃ الخواطر" کے سلسلہ میں جناب کی توجہ کا خصوصی شکریہ پیش کرتا ہوں، حق تعالیٰ شانہ اس کو جلد از جلد ہم لوگوں تک پہونچائے کہ میں تو انھیں چیزوں کا بیمار ہوں"

شیخ کا مفید اصلاحی و دینی کتابوں کے ساتھ یہی معاملہ تھا، کہ ساری معذوریوں کے باوجود وہ ان کے سننے کے لئے وقت نکال لیتے تھے، اس ناچیز کے نام ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں :۔

---

[1] راقم سطور کی عربی کتاب "الأرکان الأربعۃ" کا اردو ترجمہ برادر زادہ عزیز مولوی محمد الحسنی مرحوم کے قلم سے ہے۔ [2] مورخہ ۱۲ ذی الحجہ ۸۸ھ، از سہارنپور۔

"آپ کی کتاب "تاریخ دعوت و عزیمت" ایسی حالت میں پہونچی کہ میں لکھ نہ سکتا تھا، بیٹھنا مشکل، سننا مشکل، لیکن مجھے آپ کی ہر کتاب کا اہتمام ہوتا ہے، اس لئے اس نے مجھے ایسا پکڑا کہ چھ سات روز میں پوری سن لی، اللہ تعالےٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے، امت کو اس سے فائدہ پہونچائے، بالخصوص سلاسل کی تفصیل آپ نے لکھی، اس سے بہت مسرت ہوئی، اللہ تعالےٰ آپ کو تا دیر زندہ سلامت رکھے[1]"

اسی طرح جب عزیزی سید سلمان حسینی ندوی نے اپنا تحقیقی مقالہ جو جرح و تعدیل کے الفاظ کی تحقیق میں تھا، اور جامعۃ الامام محمد بن سعود، ریاض میں پیش کیا گیا تھا، شیخ کی خدمت میں پیش کیا، تو مجھے تحریر فرمایا:۔

"عزیز سلمان کی کتاب میں نے سرہانے رکھ رکھی ہے، اور جب بھی وقت ملتا ہے ایک دو ورق سنتا ہوں، اور ارادہ ہے کہ مکمل سنوں گا، میری طرف سے عزیز موصوف کو ضرور مبارک باد فرما دیں[2]"

محترمی سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ایم اے ناظم دارالمصنفین کی کتاب "بزم صوفیہ" کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:۔

"سید صاحب کی کتاب "بزم صوفیہ" کے تعارف سے دل خوش ہوا، اللہ تعالےٰ ان کی کتاب کو مقبول فرمائے، اور لوگوں کو زائد سے زائد متمتع فرمائے، میں نے فرمائش کی ہے کہ میرے پاس ایک نسخہ وی، پی سے بھیج دیں[3]"

دوسرے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

---

[1] مکتوب مورخہ ۲۲ ذی قعدہ ۱۴۰۰ھ [2] مکتوب مورخہ ۵ مئی ۱۹۸۱ء [3] مکتوب مورخہ ۲۸ ذی قعدہ ۱۴۰۰ھ

"بزم صوفیہ" کتاب پہونچ گئی، اور باوجود بیماری کے بہت دقت سے سنی[1]"

اصابت رائے، دوربینی و دور اندیشی

شیخ کے حلقۂ تعارف، بلکہ مسلک دیوبند سے تعلق رکھنے والے، اور مدارس و معاصر مشائخ کے پورے حلقہ میں حضرت شیخ کی اصابت رائے، دوربینی و دور اندیشی مسلّم تھی، اور بڑے نازک اور اہم معاملات میں ان کی رائے کو قول فیصل سمجھا جاتا تھا، راقم سطور کو بھی بارہا اپنے اور دارالعلوم کے اہم اور نازک معاملات میں شیخ کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت پیش آئی، اوران کی اصابت رائے اور معاملہ فہمی کا تجربہ ہوا۔

اس اصابت رائے کا نمونہ یہ تھا کہ مولانا محمد یوسف صاحبؒ کے انتقال پر باوجود ایک حلقہ کی خواہش و تقاضہ، اور جذباتی تعلق کے اپنے لخت جگر عزیز مولوی ہارون کو اپنے والد و دادا کا جانشین بنانے کے بجائے (جن سے اہلِ میوات کو جذباتی تعلق تھا) زمانہ کی نزاکتوں، اور وقت کے فتنوں کے پیش نظر مولانا انعام الحسن صاحب کو جانشین بنایا، جو مولانا محمد یوسف صاحب کے شروع سے شریک کار، دست راست اور مشیر و معاون تھے، اور جو اپنے فہم، تجربہ، علم و عمر کی وجہ سے جماعت اور کام کی صحیح رہنمائی کرسکتے تھے، شیخ کے اس انتخاب اور فیصلہ پر ایک حلقہ نے احتجاج بھی کیا، اور بعض عمائد دہلی نے شیخ کی اس رائے کو تبدیل کرنے کی کوشش کی، لیکن شیخ اس پر مضبوطی سے قائم رہے، اور بعد کے تجربوں نے اور دعوت کی موجودہ ترقی، مقبولیت اور عالمگیر وسعت نے ثابت کردیا کہ یہ فیصلہ و انتخاب صحیح اور حق بجانب تھا۔

---

[1] مکتوب مورخہ ۲۷؍ ذی الحجہ ۱۴۰۰ھ

اس کے علاوہ مختلف موقعوں پر ان کی اصابت رائے، حقیقت رس نگاہ اور دوربینی نے جماعت کی بہت سے نازک مرحلوں پر رہنمائی کی اور اس کو فتنوں اور انتشار سے بچالیا۔

رہا مدرسۂ مظاہر العلوم کا معاملہ تو ان کی باریک بینی، حقیقت پسندی اور معاملہ فہمی نے ہمیشہ مدرسہ کے ذمہ داروں اور نظماء و اہل اہتمام کی مدد کی اور اس کو بعض غیر ضروری آزمائشوں میں پڑنے اور خطرات و مشکلات سے بچالیا، جو غلط و مستعجلانہ فیصلہ سے پیدا ہو سکتے تھے، اس کی تفصیل اور اس کے شواہد و واقعات "آپ بیتی" کے صفحات میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

اکرام ضیف

اکرام ضیف اگرچہ تمام بزرگوں اور مشائخ کا شعار رہا ہے، اور ان کے دستر خوان کی عمومیت و وسعت اپنے اپنے زمانہ میں ضرب المثل رہی ہے، خود شیخ کے دور میں بھی متعدد خانقاہوں، اور دینی مرکزوں میں مہمانوں کا جم غفیر رہتا تھا، لیکن شیخ نے حدیث مشہور "من کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فلیکرم ضیفہ"[1] پر جس اہتمام، وقیقہ رسی اور سرگرمی سے عمل کیا اس کی نظیر ملنی مشکل ہے، انھوں نے میزبانی و مہمانداری کو دین کا ایک اہم شعبہ، اور اخلاق و نفسیات کا ایک فن بنا دیا۔

حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی بھوپالی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دن فرمایا کہ "دو چیزیں بڑی عبادت تھیں، ایک نکاح ایک کھانا اب دونوں میں سے

---

[1] صحیح بخاری، ترجمہ "تم میں سے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے مہمان کا اکرام کرے"۔

دین وشریعت کے احکام اور ایمان واحتساب کی روح نکل گئی، کھانے کی یہ اہمیت وعظمت اور اس کا عمل وعبادت ہونے کا تصور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کے یہاں دیکھا میں ایک دن دوپہر کے کھانے میں شریک تھا، ایک صاحب آئے ہوئے تھے، جن سے ان کے سلسلہ ومشائخ کے تعلقات تھے، انھوں نے کھانے میں کسی مقدمہ یا عدالتی قصہ کا ذکر چھیڑا، فرمایا ابھی کھانا کھائیے پھر سنیں گے۔[1]

شیخ کے یہاں مہمانوں کی کثرت، کھانوں کے تنوع وافراط ہی پر اکتفا نہیں تھا، بلکہ انھوں نے اکرام ضیف کا ایک تقاضہ یہ بھی سمجھا تھا کہ عزیز مہمانوں کے مرغوبات کا بھی علم ہو، اور ان کے مہیا کرنے کا خاص اہتمام کیا جائے، بیسیوں عزیز ومعزز مہمانوں کو اس کا تجربہ ہوا ہوگا، راقم اپنا تجربہ لکھتا ہے کہ جب سے شیخ کے یہاں میری آمد ورفت شروع ہوئی، اور شیخ کو ان چیزوں کا علم ہوا جو مجھے مرغوب تھیں، اور میں بالعموم اپنے مستقر پر ان کا عادی تھا، ان کا میری آمد سے پہلے اہتمام شروع ہو جاتا تھا، ممکن نہ تھا کہ دسترخوان ان سے خالی ہو، اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ ایک مرتبہ میں نے غلطی سے یہ لکھدیا کہ میرا آج کل مرض نقرس، کی وجہ سے گوشت سے پرہیز ہے، شیخ نے یہ خط پڑھ کر باورچی ابا زصاحب سے جن کا نظام الدین میں ہوٹل ہے، اور وہ اتفاق سے آئے ہوئے تھے، دریافت کیا کہ ترکاری سے کتنے کھانے تیار ہو سکتے ہیں؟ انھوں نے دو چار بتائے، شیخ کو اس پر اطمینان نہیں ہوا، گھر کی بچیوں سے دریافت کیا، انھوں نے آٹھ دس بتا دیئے، شیخ بہت خوش ہوئے، اور سب کو تیار کرنے کا حکم دیا، اس سے بڑھ کر یہ کہ گوشت سے (جس کے بغیر وہ کھانا نہیں کھا سکتے تھے) جب تک میرا قیام رہا دست کش رہے، اور سبزی پر اکتفا کرتے رہے،

---

[1] "صحبتے با اہل دل" (مجموعہ ملفوظات حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی) آٹھویں مجلس ۲۳ جنوری ۱۹۶۸ء

یہ تو خدام کے ساتھ تعلق کی ایک مثال تھی، مشائخ اور بزرگوں کے ساتھ جو اہتمام ہوتا ہوگا، اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

مہمانوں کی تعداد کبھی سیکڑوں تک اور رمضان میں ہزاروں تک پہونچ جاتی لیکن اس سے کوئی بدنظمی، اضطراب وانتشار پیدا نہ ہوتا، اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے مولانا نصیر الدین صاحب کی شکل میں ایک مخلص معاون عطا فرمادیا تھا، جوان سب کے کھانے کا انتظام کرتا، کھانا مدرسہ کے باورچی خانہ سے پک کر آتا اور مخصوص مہمانوں کے لئے کچھ کھانے گھر سے بھی پک کر آتے، شیخ دسترخوان کی پوری نگرانی فرماتے، مہمانوں کو علی حسب مراتب "انزلوا القوم منازلهم" پر عمل کرتے ہوئے، ترتیب سے بٹھاتے، ان کے مرغوبات کو ان کے سامنے رکھتے، اگرچہ دسترخوان پر اول سے آخر تک بیٹھے رہتے، ایک جماعت (جس کو شیخ کی اصطلاح میں پیڑھی کہا جاتا تھا) فارغ ہوتی، دوسری جماعت آتی، شیخ اپنی پوری دلچسپی و مستعدی کا اظہار فرماتے، لیکن غور سے دیکھنے والے تاڑ لیتے کہ شیخ نے بہت کم تناول فرمایا ہے۔

اس دسترخوان کے آداب میں یہ بھی تھا کہ جس کے سامنے جو چیز رکھی جائے، یا جس کو چائے کی پیالی پیش کی جائے، وہ دوسرے کی طرف نہ بڑھائے، اس لئے کہ اس سے بعض اوقات انتظام کرنے والوں کو غلط فہمی ہوتی ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ فلاں شخص فارغ ہوگیا، حالانکہ اس نے دوسرے کی تواضع کردی، اور خود محروم رہا، اس موقعہ پر حضرت شیخ فرماتے کہ یہاں کا انتظام یہاں والوں کے ہاتھ میں ہے، آپ کو اگر انتظام کرنا ہے تو اپنے گھر جاکر کیجئے گا، تجربہ سے اس میں بڑی مصلحت معلوم ہوئی، بعض وقت حضرت شیخ کی اس روک ٹوک سے بعض رئیسانہ مزاج والوں کو گرانی بھی ہوئی، لیکن شیخ مفاد عامہ میں اس کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔

مدارس دینیہ سے گہرا تعلق

شیخ کی ساری تعلیم وتربیت، ذہنی واخلاقی نشو ونما، اور اکتساب علم وکمال سب (ایک عربی دینی) مدرسے کے اندر یا مدرسہ کے ماحول، یا مدرسہ سے تعلق رکھنے والوں اور اس کو اپنے قلب وجگر اور اہل وعیال سے زیادہ عزیز رکھنے والوں کے آغوش میں ہوا تھا، پھر انھوں نے ایک مثالی مدرسہ (مظاہر العلوم) کا وہ زریں دور دیکھا تھا جب منتظمین واساتذۂ مدرسہ اخلاص وللّٰہیت، ایثار وقربانی، اور زہد و ورع کا پیکر، اور طلبہ طلب صادق، انقطاع ویکسوئی اور طلب علم میں انہماک وجانفشانی اور اپنے اساتذہ سے محبت وعقیدت، اور اطاعت وانقیاد کا نمونہ ہوتے تھے، اس لئے مدرسہ ان کی فکر وتوجہ کا مرکز، ان کے تخیلات وتوقعات کا مسکن، اور ان کی روح کا نشیمن بن گیا تھا، اور وہ اس کو علوم دینیہ کے بقا، مسلمانوں کی صحیح دینی رہنمائی، ان کو فسادِ عقیدہ اور فسادِ عمل سے بچانے کا واحد ذریعہ سمجھتے تھے، حقیقت میں انھوں نے "آپ بیتی" کا سلسلہ مدارس کے اسی دور کی یاد تازہ کرنے، اور انھیں خصائص کو دوبارہ پیدا کرنے کے خیال سے مرتب فرمایا، اور یہی مضمون ہے، جو اس کے زیادہ تر صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

اسی لئے ان کو تمام مدارس دینیہ سے جو صحیح مسلک پر قائم تھے، بہت گہرا قلبی تعلق تھا، وہ ان میں کسی انتشار واختلاف کو برداشت نہیں کر سکتے تھے، اور شاید کبائر کے بعد جس چیز سے شیخ کو سب سے زیادہ نفرت تھی، اور اس پر غصہ آتا تھا وہ کسی عربی مدرسہ میں طلبہ کی اسٹرائک تھی[1]۔

[1] شیخ کا اس پر مستقل رسالہ "رسالہ اسٹرائک" ہے۔

لیکن بمصداق ایک عربی شعر کے ؎

ما کل ما یتمنّیٰ المرء مدرکہ

تجری الریاح بما لا تشتہی السُفُن

زمانہ کے فساد اور ماحول کی انتشار انگیزی کا اثر ان قدیم مدارس پر بھی پڑا، اور وہاں بھی احتجاجوں، اور اسٹرائکوں کا دور شروع ہو گیا، ۱۳۸۰ھ (۱۹۶۰ء) میں دار العلوم دیوبند میں اسٹرائک ہوئی، اور عرصہ تک انتشار و ہنگامہ رہا، شیخ نے ان حالات سے متاثر ہو کر مجلس شوریٰ سے استعفاء دے دیا، اور آخر تک اس پر قائم رہے، لیکن افسوس ہے کہ ۱۳۸۲ھ میں خود مظاہر العلوم میں اسٹرائک ہوئی، شیخ کے دل پر اس سے بڑی چوٹ لگی، وہ اس موقعہ پر اکثر یہ شعر پڑھتے اور دوستوں اور عزیزوں کو خطوط میں لکھتے ؎

وہ محروم تمنا کیوں نہ سوئے آسماں دیکھے

کہ جو منزل بہ منزل اپنی محنت رائیگاں دیکھے

مدرسہ مظاہر العلوم ہی میں نہیں، شیخ کو اسٹرائک سے خواہ وہ کسی دینی مدرسہ میں ہو، سخت کراہیت و نفرت تھی، اور وہ ان طلبہ کو جو اسٹرائک میں قائدانہ حصہ لیں، کسی رعایت، حسن ظن و اعتماد، اور کسی دینی اعزاز کا اہل نہیں سمجھتے تھے، چنانچہ وسط مئی ۱۹۷۵ء ۱۳۹۵ھ جب دار العلوم ندوۃ العلماء میں اسٹرائک کی ان کو خبر ملی، تو ان کو اس سے بھی صدمہ ہوا، اور وہ کبھی ان طلبہ سے منشرح نہیں ہوئے، جن کے متعلق ان کو کسی ذریعہ سے معلوم ہو گیا کہ انھوں نے اس اسٹرائک میں حصہ لیا تھا۔

مسلسلات کے موقعہ پر بھی بعض وقت لکھ کر لگا دیا گیا، یا اعلان کیا گیا کہ جن لوگوں نے

کسی مدرسہ میں اسٹرائک میں حصہ لیا ہے، وہ اس سے مستثنیٰ ہیں، اجازت دینے میں بھی ہمیشہ اس کا لحاظ رکھا گیا کہ جس نے کبھی اسٹرائک میں تھوڑا بہت حصہ لیا ہے، اس کو ہرگز یہ شرف نہ عطا کیا جائے، بلکہ ان کو اپنے حلقۂ ارادت میں بھی لینے سے ـــ انکار تھا، ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ میں ایسے سورماؤں سے بیعت کا تعلق بالکل نہیں رکھنا چاہتا۔[1]

افسوس ہے کہ حضرت شیخ کے دل پر زندگی کے آخری دور میں دارالعلوم دیوبند کے اختلاف وانتشار کا داغ لگا، پچھلے صفحات میں گذر چکا ہے کہ حجاز کے قیام میں بھی آپ کو اس مسئلہ سے کتنا تعلق خاطر تھا، اپنے ایک مکتوب میں جو اس قضیہ کے اپنے آخری حدود سے پہلے کا لکھا ہوا ہے، تحریر فرماتے ہیں:۔

"دیوبند وسہارنپور کا ہر وقت فکر ہے کہ میرے بڑوں کے دو باغ ہیں، کتنے صلاح وفلاح سے اکابر نے لگایا تھا، اور ہم ناخلفوں نے اس کو کس طرح برباد کرنا شروع کر دیا" فإلی اللہ المشتکی" بڑوں کی نصیحت تھی کہ جب تک اخلاص رہے گا یہ پھلے گا اور پھولے گا، اور جب اخلاص نہیں رہے گا برباد ہو جائے گا، اس کا منظر اب سامنے آرہا ہے۔[2]"

اس کے بعد ۲۴ رمضان ۱۴۰۰ھ کے خط میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"آپ سے ملنے کو، اور دیوبند کے متعلق گفتگو کو بہت جی چاہ رہا ہے، جب ادھر سے کوئی آتا ہے تو بغیر پوچھے مجھ سے نہیں رہا جاتا، اور سن کر طبیعت مکدر رہی ہوتی ہے، کاش یہ حضرات حضرت نانوتویؒ، حضرت گنگوہیؒ وغیرہم کی سوانح عمریاں ہی دیکھ لیتے تو اچھا تھا، میرا تو جی چاہتا ہے کہ یہ لوگ

[1] رسالہ اسٹرائک ص۱ [2] مکتوب مورخہ ۱۶ رمضان ۱۴۰۰ھ

ان حضرات کی سوانح کے علاوہ کچھ اور نہ پڑھیں"۔

حجاز کے آخری قیام میں ہندوستان سے کوئی آتا، یا کوئی ایسا آدمی جس کا ان مدارس سے کچھ بھی رابطہ تھا ملتا تو سب سے پہلے دیوبند ہی کے متعلق سوال ہوتا، افسوس ہے کہ حضرت شیخ کی زندگی میں یہ معاملہ پورے طور پر روبراہ نہ ہوا، ورنہ ان کو بڑی مسرت ہوتی، امید ہے کہ ان کی دعائیں، اور ان کا سوزِ دل رنگ لائے گا، اور ان کو اس دنیا میں نہیں تو اس عالم میں دار العلوم کے اپنے بانیوں کے مقاصد اور اپنے مخلص کارکنوں کے عزائم اور خواہشات کے مطابق دین کی خدمت، اور علوم شرعیہ کی اشاعت کا کام پورے انہماک، یکسوئی، اور تعاون کے ساتھ انجام دینے کی خبر سے مسرت ہوگی۔

اپنے اسلاف و مشائخ کے ساتھ وفا شعاری اور خدام و احباب کے ساتھ محبت و شکر گذاری کا تعلق

حضرت شیخ کے حالات و کمالات میں ایک نمایاں وصف اپنے سلسلہ کے مشائخ اور مربیوں و محسنوں کے ساتھ وفا شعاری، ان کی علمی یادگاروں کی نہ صرف حفاظت، بلکہ زیادہ سے زیادہ اشاعت، علمی دنیا میں ان کے تعارف، اور ان کے علمی و دینی فیوض کے دائرہ کو وسیع کرنے کا وہ بے پایاں جذبہ تھا جس کی نظیر اس زمانہ میں ملنی مشکل ہے، وہ ان کے ایک ایک حرف کو آنکھوں سے لگانے اور دنیا میں دور دور پہونچانے کے لئے ساعی رہتے تھے۔

اسی جذبہ کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے حضرت گنگوہیؒ کی بخاری کی تقریرات کو جن کو حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ نے قلم بند کیا تھا "لامع الدراری" کے نام سے بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع کیا، اس پر خود اپنے حواشی کا اضافہ کیا، اور ایک فاضلانہ محققانہ مقدمہ لکھا، اور ممالک عربیہ میں

اس کے تعارف کی غرض سے اس ناچیز سے بھی کتاب کا عربی میں تعارف اور مقدمہ لکھوایا۔

اسی طرح حضرت گنگوہی کی ترمذی پر تقریرات و تحقیقات کو جو "لامع الدراری" کی طرح مولانا محمد یحییٰ صاحب کی قلم بند کی ہوئی تھی "الکوکب الدری علی جامع الترمذی" کے نام سے طبع اور شائع کروایا، اس پر بھی مقدمہ لکھنے کا مجھے امر ہوا۔

جہاں تک حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کی معرکۃ الآراء کتاب "بذل المجہود" کا تعلق ہے، اس کی طباعت و اشاعت کا تو حضرت شیخ پر ایسا غلبہ تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی طباعت کی تکمیل کے بغیر ان کو چین ہی نہ آئے گا، جو لوگ اس کام میں ذرا بھی حامی و شریک رہتے ان کو حضرت شیخ کی خاص دعائیں اور خوشنودی و التفات حاصل ہوتا، یہ سب اپنے اسلاف و اساتذہ و مشائخ کے وفادارانہ و عاشقانہ تعلق کا کرشمہ تھا، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ خود شیخ کی مقبولیت و ترقی میں بھی اس کو خاص دخل تھا۔

اپنے بزرگوں کے ان آثار علمیہ کی حفاظت و اشاعت کے علاوہ ان کے حالات و سوانح کی تدوین اور اشاعت کی طرف بھی پوری توجہ اور اس سے پوری دلچسپی اور دل بستگی تھی، اس سلسلہ میں عزیز سعید مولوی محمد ثانی مظاہری ندوی کو حکم ہوا کہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کی سوانح نئے طرز تصنیف اور نئے مواد کے ساتھ مرتب کریں، اللہ نے عزیز موصوف کو اس کی توفیق دی، انھوں نے "حیات خلیل" کے نام سے ۱۳۹۶ھ (۱۹۷۶ء) میں اس کی تکمیل کی، مؤلف موصوف اس کو جستہ جستہ حضرت شیخ کی خدمت میں بھیجتے رہے، حضرت شیخ ان کے نام تحریر فرماتے ہیں:۔

"بعد سلام مسنون، تمہاری تالیف "حیات خلیل" کا مسودہ مدینہ پاک میں پہونچکر موجب مسرت ہوا تھا، میں اس کو سن سن کر وہاں سے ہی واپس کرتا رہا، اللہ تعالیٰ

تمہاری اس محنت کو قبول فرما کر دارین کی ترقیات کا ذریعہ بنائے، ماشاء اللہ تم نے بڑی محنت و کاوش سے حالات تحقیق کے بعد جمع کئے[1]۔"

حضرت شیخ ہی کے ایماء پر عزیزی سید عبد اللہ حسنی (ابن محمد الحسنی مرحوم) نے عربی میں اس کی تلخیص اور تعریب کی اور ۱۳۹۵ھ ۱۹۷۶ء کو یہ عربی رسالہ بھی شائع ہوا۔

حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ اور حضرت مولانا عبد القادر صاحب رائے پوریؒ کی سوانح حیات کی ترتیب میں بھی حضرت شیخ کا ایماء، مشورہ اور رہنمائی اول سے آخر تک شامل رہی، اور اس میں بھی اسی وفاشعاری کا جذبہ کام کر رہا تھا، جو ان کے خمیر وضمیر میں ودیعت تھا، پھر حضرت شیخ کے حکم و ایماء ہی پر عزیز محمد ثانی سلمہٗ نے مولانا محمد یوسف صاحب کی ضخیم یادگار سوانح، پھر ان کے جواں سال و جواں مرگ فرزند مولوی محمد ہارون کی مختصر سوانح تصنیف کی، اور حضرت شیخ کی خاص دعائیں، اور خوشنودی کا پروانہ حاصل کیا۔

یہ بات صرف اپنے مربّی و محسنوں کے ساتھ مخصوص نہ تھی، جو شخص بھی شیخ کے کسی کام میں ذرا بھی اعانت کر دیتا، اس سے کچھ بھی سہولت حاصل ہوتی، تو اس کے ساتھ تشکّر و امتنان کا ایسا برتاؤ کرتے کہ وہ خود شرمندہ ہوتا، ۸۹ھ کے سفر حجاز میں خدام کے لئے ویزہ ملنے میں راقم سطور نے اپنے تعلقات کی بناء پر کچھ خدمت کی سعادت حاصل کی تھی، اور ان خدام کی وجہ سے حضرت شیخ کو قدرتاً سہولت و راحت حاصل ہوئی تھی، اس پر حضرت شیخ نے اس ناچیز کے نام حجاز سے جو خط لکھا، اس کو پڑھ کر اب بھی راقم پانی پانی ہو جاتا ہے، فرماتے ہیں:۔

---

[1] مکتوب مورخہ ۲۱ رجب ۱۳۹۶ھ از سہارنپور "حیات خلیل" مدہ

"اس میں نہ ذرا مبالغہ ہے اور نہ ذرا تصنّع کہ اس مرتبہ حاضری کے بعد سے کثرت سے صلوٰۃ وسلام پیش کرنے کے ساتھ ساتھ رفع مراتب و درجات عالیہ کے لئے بہت ہی اہتمام سے اور بہت ہی کثرت سے دعائیں کرتا رہا، لکھتے ہوئے تو شرم آتی ہے لیکن اس مرتبہ کی حاضری کا سہرا صرف جناب کے سر ہے، اس لئے اگر اس حاضری میں اعمال حسنہ ہو بھی گئے ہوں تو انشاء اللہ اس کے ثواب میں آپ کی شرکت بغیر کہے ہے، احسان کے بدلے میں دعائیں ہی کر سکتا تھا، اور "من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ" کی بناء پر آپ کی خدمت میں عرض بھی کر دیا۔[1]"

یہی حال کم وبیش سب کے ساتھ تھا، جہاں تک دعاؤں کا تعلق ہے، ایک مرتبہ فرمایا کہ اس مرتبہ حجاز جا کر حرم شریف میں بچپن کے پرانے پرانے لوگ یاد آئے، کاندھلہ میں ایک فقیر مانگنے آتا تھا (یا یہ فرمایا کہ ایک شخص راستہ میں بیٹھا رہتا تھا) وہ بھی یاد آگیا، تو میں نے اس کے لئے بھی دعا کی، شیخ کی انھیں شفقتوں اور نوازشوں کو دیکھ کر اس پرانے جملے کی تصدیق ہوتی تھی "اولئك قوم لا یشقی بهم جليسهم" (یہ وہ حضرات ہیں جن کے پاس بیٹھنے والا بھی محروم نہیں رہتا۔)

شفقت و تعلق

شیخ کی طبیعت میں (صحیح النسبت مشائخ اور تابعین رسول کی سنت کے مطابق) اہل تعلق کے ساتھ ایسی شفقت و محبت ودیعت ہوئی تھی، جو بعض اوقات ماں کی شفقت کی یاد تازہ کر دیتی تھی، اور ایک نکتہ شناس مہمان[2] نے چند دن اس شفقت کا

---

[1] مکتوب مورخہ ۷ رمضان ۸۹ھ

[2] اس سے مراد صوفی عبدالرب صاحب (ایم اے) مرحوم ہیں۔

تماشہ دیکھ کر، اور مزہ چکھ کر گھر جا کر ایسے ہی خط لکھا تھا جس سے اس شفقت کا اظہار ہوتا تھا، اس شفقت و تعلق کا تجربہ بیسیوں خدام و اہل تعلق کو ہوا ہوگا "یحسب کل جلیس أنہ أکرم علیہ من صاحبہ" راقم سطور (معذرت و شرمندگی کے ساتھ) اپنے چند واقعات بیان کرتا ہے، جن سے اس شفقت کا کچھ اندازہ ہوگا۔

جب راقم کو نزول الماء، (موتیا بند) اور ایک آنکھ کے آپریشن کی ناکامی کی وجہ سے ضعف بصارت کا عارضہ لاحق ہوا تو فرمایا کہ "میں تم کو حکم دیتا ہوں کہ تم خواہ حجاز کا ہو، خواہ یورپ و امریکہ، خواہ اندرون ملک کا کوئی سفر تنہا نہ کروگے، اپنے داعیوں کو بے تکلف لکھ دیا کرو کہ میرے ساتھ دو رفیق ضروری ہیں، اگر وہ دو کا انتظام نہ کر سکیں تو ایک کی بہر حال شرط ہے، اگر ان کو غرض ہوگی، تو سو بار بلائیں گے، نہیں تو "شما بخیر ما بسلامت" خبردار اس میں تخلف نہ ہو" ایک مرتبہ راقم نے حیدرآباد کا تنہا ہوائی سفر کیا، وہاں ایک جلسہ میں سیرت پر تقریر کرنی تھی، اور صرف دو دن ٹھہرنا تھا، ساتھیوں نے دہلی کے ہوائی اڈہ پہونچا دیا، حیدرآباد کے دوستوں نے وہاں اتار لیا، پھر سوار کرا دیا، شیخ نے سنا تو مجھ سے جواب طلب کیا، اور فرمایا کہ میری ممانعت کے باوجود یہ سفر تنہا کیوں کیا گیا؟ بعض مرتبہ مدینہ طیبہ سے مکہ معظمہ ساتھ حاضری ہوئی، رات کا وقت تھا، بھائی سعدی کے مکان پر پہونچ کر مجھے حکماً لٹا دیا کہ آنکھ میں تکلیف رہتی ہے، اور تاکید کر دی کہ شور نہ ہو، خود بدولت عمرہ کے لئے چلے گئے، اور فرمایا کہ تم عمرہ کل دن میں کرنا، مدینہ طیبہ کے قیام کے زمانہ میں مجلس ذکر میں جب صبح کو حاضر ہوتا، تو روزانہ کا معمول تھا کہ عین ذکر کی حالت میں ایک چمچہ تلے ہوئے انڈے کا، اور ایک خمیرہ کا میرے منہ سے لگا دیا جاتا، اسی زمانہ میں اگر میرا ریاض کا کوئی سفر پیش آتا، تو خدام کو ارشاد ہوتا کہ جتنے دن علی میاں کا

ریاض رہنا ہو اتنے دن کی خوراک ساتھ کر دو، عرصہ گذر جانے کے بعد جب مکۂ معظمہ و مدینہ طیبہ حاضری ہوتی تو حضرت کو اپنا یہ معمول یاد رہتا، اور خمیرہ کے متعلق ہدایت ہوتی، مدینہ طیبہ کے قیام میں اگر میرے پاس رابطہ یا جامعہ کی موٹر نہ ہوتی تو شیخ کو برابر فکر رہتی کہ میں پانچوں وقت نمازوں کے بعد اپنی قیام گاہ پر کیسے جاتا ہوں، پھر جب حضرت کو اطلاع ملتی کہ اس کا انتظام ہو گیا ہے، جب اطمینان ہوتا، میری دوسری آنکھ کے آپریشن کی حضرت کو مجھ سے زیادہ فکر معلوم ہوتی تھی، اور حضرت ہی کے حکم پر امریکہ میں آپریشن کرانے کا فیصلہ کیا، پھر جب میں نے ٹیلکس کے ذریعہ نیویارک سے اطلاع دی کہ یکم جولائی ۱۹۷۷ء کو فلاڈلفیا (امریکہ) میں آپریشن ہونے والا ہے تو حضرت نے[1] اسی وقت حاضرالوقت خدام کو حرم شریف روانہ کر دیا کہ دعا کا اہتمام کریں، اور خود بھی دعا کی طرف متوجہ ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے آپریشن کامیاب کر دیا، اس طرح کے واقعات خدام کو بکثرت پیش آئے ہوں گے، میں نے اپنے چند واقعات لکھے ہیں کہ ان سے اس شفقت بے پایاں کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

انقطاع و تبتّل اور یکسوئی کا فطری رجحان اور جذبہ

یوں تو حضرت شیخ نے جیسا کہ صفحات بالا سے معلوم ہوا ہوگا، ساری عمر تدریس و افادہ، مجمعوں اور واردین صادرین کے ہجوم میں گذاری، اور آخر میں جنوبی افریقہ اور انگلستان کے ایسے سفر کئے، جن میں لوگوں نے پروانہ وار ہجوم کیا، اور مور وملخ کی طرح امنڈ آئے، اور حضرت شیخ نے اپنی قوتِ عزیمت، عالی ہمتی، اور جفاکشی سے نہ صرف

---

[1] یہ عشاء کے وقت کی بات تھی، وقت کے فرق کی وجہ سے وہ وقت امریکہ میں صبح کا تھا اور اسی وقت آپریشن ہونے والا تھا۔

ان کو نباہا، بلکہ سرگرمی کے ساتھ افادہ وارشاد میں مصروف رہے، اور ان لوگوں کو یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ ان کو ہجوم سے وحشت، اور جمعیت سے عدم مناسبت ہے۔

لیکن اولاً تو فطری طور پر، ثانیاً اس تربیت کے اثر سے جس میں مولانا محمد یحییٰ صاحب کی احتیاطوں کو خاص دخل ہے، شروع ہی سے شیخ کی طبیعت میں یکسوئی وگوشہ گیری مرغوب اور پسند تھی، اور یہ ان کے اندر کا تقاضہ تھا، پھر طریق ولایت سے مناسبت نے اس میں اور شدت وقوت پیدا کردی، یہاں پر ان کے بعض مکاتیب اور کتابوں کے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں، جن سے اس فطری جذبہ کا کچھ اندازہ ہوسکتا ہے۔

"مجھے مجمع سے وحشت ہے، کسی مجمع میں مجھے جانا میرے لئے انتہائی مجاہدہ ہے، حتیٰ کہ اپنے کمرہ میں اگر تنہا ہوں، اور کمرہ کی زنجیر کھلی ہوئی ہو، تو اس کی بہ نسبت مجھے اس میں زیادہ لطف اور سکون ہوتا ہے کہ اندر کی زنجیر لگی ہو......... جلسہ جلوس کی خصوصیت نہیں ہے، مجھے تقریبات میں بھی شرکت سے وحشت ہوتی ہے ؎

قفس دانیم و بس، راہِ چمن از ما چہ می پرسی
کہ پیش از بال و پر برداشتند از آشیاں ما را[1]"

"اپنی جوانی کا زمانہ بہت یاد آتا ہے، جب میں تھا اور میرا کمرہ، نہ کوئی آدم نہ آدم زاد، اب اپنی معذوریوں نے دو تین سال تو مجھے خود محتاج بنادیا، کہ بغیر کسی کی مدد کے اٹھ کر پیشاب کرنا بھی مشکل ہے، اور اس پر ہر وقت کا ہجوم وحشت میں اضافہ کا سبب بنتا ہے ؎

باغ میں لگتا نہیں جنگل میں گھبراتا ہے دل
کس جگہ لے جاکے بٹھیں ایسے دیوانہ کو ہم

---

[1] الاعتدال ص ۳۲

اگر آپ تفریحی فقرہ نہ سمجھیں تو واقعی مشورہ پوچھتا ہوں کوئی ایسی جگہ بتاؤ، جہاں دو[2] تین[3] دوستوں کے سوا، اور جو اللہ جل شانہ قوت عطا فرمائیں تو ان کو بھی دفع کوئی میرے پاس نہ آئے" لاحول ولا قوۃ الا باللہ"[1]

"میری حالت آج کل عجیب گذر رہی ہے ؎

گفتگو آئینِ درویشی نبود

ورنہ با تو ماجرا ہا داشتیم

اس قدر یکسوئی کی طرف چل رہی ہے کہ اس پر حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کا مقولہ یاد آتا ہے، جو تقریباً چالیس سال ہوئے میر صاحب[2] اور راؤ یعقوب علی خاں سے کہا تھا کہ اس سے فضول باتیں کرتے رہا کرو، اور اگر یہ ڈانٹے تو پرواہ نہ کیجیو ورنہ ڈھونڈھتے ہی پھروگے کہاں تھے"[3]

"طبیعت کے متعلق میری خود سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کیا ہو رہا ہے، کوئی جگہ اب امنگ کی باقی نہیں رہی، اور امراض نے بالخصوص ٹانگوں نے تو ایسا معذور بنا دیا کہ مجمع کے بغیر ایک منٹ کو گذر نہیں، اس لئے کہیں یکسوئی سے جا کر بیٹھنے کا آسرا بھی نہیں رہا، .... بڑے سب چل دیئے، کوئی جگہ ایسی بھی نہیں رہی ؎

دل چاہتا ہے در پہ کسی کے پڑا رہوں — سر زیرِ بارِ منت درباں کئے ہوئے

رہیئے اب ایسی جگہ جا کر جہاں کوئی نہ ہو — ہم نفس کوئی نہ ہو اور ہم زبان کوئی نہ ہو

پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار — اور جو مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

---

[1] مکتوب مورخہ ۲۴/۱۲/ ۸۸ھ، بنام مؤلف [2] میر آل علی صاحب سہارنپوری مرحوم

[3] مکتوب از مدینہ منورہ بنام مؤلف

پر بھی عمل نہیں ہو سکتا۔"[1]

"اب تو بہت دن سے بیعت کو واقعی دل نہیں چاہتا، اللہ کا شکر ہے کہ سلسلہ کے بقا کے لئے بہت سے احباب جو مجھ سے ہر طرح سے افضل ہیں، پیدا ہو گئے ہیں، اب تو بسا اوقات یہ شعر بھی زبان پر آجاتا ہے ؎

احمد تو عاشقی بمشیخت ترا چہ کار
دیوانہ باش سلسلہ شُد شُد نہ شُد نہ شُد

سلسلہ باقی رہنے کے لئے تو اسباب پیدا ہو چکے ہیں، اب تو میرے لئے کوئی گوشۂ عافیت ہی تجویز فرمائیں۔"[2]

شعری و ادبی ذوق

حضرت شیخ کے متعلق (جنھوں نے ایک خالص ثقہ و متین علمی و دینی ماحول میں پرورش پائی تھی، اور جن کا شعار و دثار درس و تدریس حدیث کا مشغلہ تھا) مشکل سے باور کیا جا سکتا ہے کہ ان کا شعری و ادبی ذوق نہایت پاکیزہ اور لطیف تھا، اور ان کو بلا مبالغہ سیکڑوں عربی، فارسی، اردو کے اشعار یاد تھے، اور وہ اپنے خطوط، رسائل و تصنیفات میں ان کا نہایت برمحل استعمال فرماتے تھے، خود بیان فرمایا کہ "ایک مرتبہ (آغاز جوانی میں) ایک دوسرے قصبہ میں شب کو جانا ہوا، جہاں کچھ بے تکلف دوست جمع تھے، وہاں عشاء کے بعد بیت بازی شروع ہوئی (جو اس زمانہ کے مہذب و زندہ دل نوجوانوں اور قصبات کے شرفاء کا محبوب و مفید مشغلہ تھا)

---

[1] بنام ابوالحسن علی ۲۰ رجب ۷۵ھ   [2] ۲۴ فروری ۱۹۷۴ء بنام ابوالحسن علی۔

اس میں ایسا انہماک ہوا کہ کچھ پتہ نہ چلا کہ رات کتنی گئی، اچانک اذان کی آواز آئی تو خیال ہوا کہ کسی نے بے وقت اذان کہدی، ابھی تو بیٹھے ہی تھے، معلوم ہوا کہ صبح صادق ہوگئی اور یہ فجر کی اذان تھی"۔

یہاں پر صرف ان خطوط سے جو مصنف کے نام لکھے گئے ہیں، اور "آپ بیتی" سے اردو کے چند اشعار منتخب کر کے لکھے جاتے ہیں، جن سے شیخ کے اعلیٰ شعری وادبی ذوق کا کچھ اندازہ ہوگا، اور معلوم ہوگا کہ شیخ کا ذہنی و علمی نشو و نما اور مذاق اس ماحول سے بالکل مختلف تھا، جس کے متعلق کبھی کسی دل سوختہ شاعر نے کہا تھا کہ۔ ع

شعر من بمدرسہ کے برد؟

ان ابیات کو حذف کر دیا گیا ہے، جو کسی تقریب سے اس کتاب میں آگئے ہیں ؎

وہ لکھیں گے تجھے خط کا جواب اے داغ کیا کہنا یہ تو نے خواب دیکھا یا کہ مضمون خیالی ہے

پھر وہی کنج قفس اور وہی صیاد کا گھر چار دن اور ہوا باغ کی کھالے بلبل

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں واں ایک خامشی مرے سب کے جواب میں

میں گو رہا رہینِ ستمہائے روزگار لیکن تمہاری یاد سے غافل نہیں رہا

رفتہ رفتہ راہ و رسم دوستی کم ہو تو خوب ترک کرنا خط کتابت یک قلم اچھا نہیں

آعندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

نہ خنجر اٹھے گا نہ شمشیر ان سے یہ بازو میرے آزمائے ہوئے ہیں

شب وصال میں خوفِ سحر ابھی سے ہے صبح ہے دور میرا رنگ فق ابھی سے ہے

ان خط کی آرزو ہے ان کی آمد کا خیال کس قدر پھیلا ہوا ہے کاروبار انتظار

مدت سے لگ رہی تھی لبِ بام ٹک ٹکی تھک تھک کے گر گئی نگہِ انتظار آج

رہ گئی بات کٹ گئی شبِ ہجر — تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی

وصل کی بنتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں — آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں

التفات یار تھا اک خواب آغاز وفا — سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں

مریضِ عشق پر رحمت خدا کی — مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط — بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق — وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں — محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے — جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا — جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

دکّان مے فروش پہ سالک پڑا رہا — اچھا گذر گیا رمضان بادہ خوار کا

کیا کہوں جرأت کہ کچھ کھاتا نہیں — کچھ تو کھایا ہے، جو کچھ کھاتا نہیں

وہی قاتل وہی خنجر وہی ہے منصف — اقربا میرے کریں خون کا دعویٰ کس پر

گر گئے میری نظروں سے خوبان عالم — پسند آگئی تیری صورت کچھ ایسی

دیر و حرم میں روشنی شمس و قمر سے ہو تو کیا — مجھ کو تو تم پسند ہو اپنی نظر کو کیا کروں

دید لیلیٰ کے لئے دیدۂ مجنوں ہے ضرور — میری آنکھوں سے کوئی دیکھے تماشا ان کا

تمنا درد دل کی ہے تو کر خدمت فقیروں کی — نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

سرخ رو ہوتا ہے انساں ٹھوکریں کھانے کے بعد — رنگ لاتی ہے حنا پتھر سے پس جانے کے بعد

گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی — اے ابر کرم بحر سخا کچھ تو ادھر بھی

---

[1] مندرجۂ بالا اشعار ان خطوط سے اخذ کیے گئے ہیں، جو مصنف سوانح (ابو الحسن علی) کے نام ہیں

تو وہ داتا ہے کہ دینے کے لئے ۔۔۔ در تری رحمت کے ہیں ہر دم کھلے

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال ۔۔۔ کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ ۔۔۔ اِک آگ سی ہے دل میں برابر لگی ہوئی

وصل ہو یا فراق ہو غالبؔ ۔۔۔ جاگنا ساری رات مشکل ہے[1]

کسی کی شب وصل سوتے کٹے ہے ۔۔۔ کسی کی شبِ ہجر روتے کٹے ہے

ہماری بھی شب کیسی شب ہے الٰہی ۔۔۔ نہ روتے کٹے ہے نہ سوتے کٹے ہے

مت آئیو وہ وعدہ فراموش تو اب بھی ۔۔۔ جس طرح کٹا روز گزر جائے گی شب بھی[2]

---

[1] مقتبس از "آپ بیتی" (۱-۷)
[2] بار بار سنے ہوئے اشعار

بابِ دہم[1]

تصنیفات و رسائل پر ایک تبصرہ

تصنیفی ذوق، اور اہم علمی و تحقیقی تصنیفات

درس و تدریس کے انہماک، ذکر و نوافل کی یکسوئی، مہمانوں کی کثرت اور واردین وصادرین کے ہجوم کے باوجود شیخ کی طبیعت میں شروع ہی سے تصنیفی ذوق اور تحریری کام میں انہماک و دلچسپی تھا، اور جب پہلی دفعہ مشکوٰۃ پڑھا رہے تھے (جو شوال ۱۳۴۱ھ میں شروع ہوئی تھی) تو ۲۲ ربیع الاول کی شب میں ۱۲ بجے حجۃ الوداع پر لکھنا شروع کیا، اور ایک دن ڈیڑھ رات میں شنبہ کی صبح کو پورا کر لیا، خواب میں ایک اشارہ کی بناء پر ۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۰ھ بروز چہار شنبہ "جزء العمرات" کی تالیف شروع ہوئی اور ۱۵ رجب ۱۳۹۰ھ یوم جمعہ کو ختم ہو گئی۔[1]

واضح رہے کہ یہ رسالہ حجۃ الوداع جو ایک دن ڈیڑھ رات میں لکھا گیا ہے، علمی، معنوی اور اپنے مواد و معلومات کے لحاظ سے "بقامت کہتر و بقیمت بہتر" کا مصداق ہے اور اس کے اندر اس موضوع پر اتنا محدثانہ و محققانہ مواد آگیا ہے، جس کو دیکھ کر (اگر کسی کو بتلایا نہ جائے) یہ خیال بھی نہیں گذر سکتا کہ یہ ایک دن ڈیڑھ رات میں

---

[1] آپ بیتی م۲ ص ۱۳۰-۱۳۱

پورا ہوا ہے، یہ بھی ملحوظ رہے کہ اس وقت شیخ کی عمر ۲۷ سال کی تھی، اس میں حواشی کا اضافہ تو بعد میں کیا گیا ہے، لیکن متن اسی وقت تیار ہو گیا تھا، ۱۳۹۰ھ میں جب انھوں نے علی گڑھ میں آنکھ کا آپریشن کرایا، اور کسی نئی تصنیف کا موقعہ نہ رہا، تو ان کو یہ پرانی کتاب یاد آئی اور انھوں نے اس میں کہیں کہیں رجال کی تفصیل اور قابل توضیح چیز کی توضیح فرمائی، اور جہاں طویل عبارتوں کا حوالہ دیا گیا تھا، ان کو نقل کروا دیا، جن مقامات کے نام آئے تھے، ان کا تعین اور تشریح فرمائی، اور اس میں اپنے بعض خورد سال نیازمندوں سے بھی مدد لینے میں تأمل نہیں کیا، جو اہل علم اور تحقیق کا شیوہ ہے، اس موقعہ پر عمرات نبوی کی بحث، ان کی تعداد اور تحدید کی تحقیق، اور ان سے فقہی احکام کا استخراج بھی فرمایا، اس طرح یہ رسالہ اس موضوع پر کافی و شافی بن گیا، اور اس کو اس موضوع پر ایک چھوٹا سا دائرۃ المعارف کہا جا سکتا ہے۔[1]

اسی طرح "خصائل نبوی شرح شمائل ترمذی" جیسی مہتم بالشان اور بابرکت کتاب اس طرح تالیف ہوئی کہ دہلی کے دو یا تین دن کے قیام میں جب "بذل المجہود" کے پروفوں کے دیکھنے سے فرصت ملتی، اس کی تالیف میں مشغول ہو جاتے، ۴۳ھ میں اس کی تالیف شروع ہوئی، اور جمادی الثانیہ ۴۴ھ شب جمعہ میں پوری ہوئی۔[2]

ان دونوں کتابوں کے برخلاف جو بہت مختصر عرصہ اور کسی بڑے کام کے درمیان کی فرصتوں اور وقفوں کے درمیان لکھی گئیں، شیخ کی وہ تصنیفات بھی ہیں، جن کو انھوں نے طویل عرصہ کے انہماک مطالعہ اور تحقیق سے مرتب فرمایا، ان میں سب سے مہتم بالشان کتاب

---

[1] یہ رسالہ خوبصورت عربی ٹائپ میں چھپا، ابتداء میں شیخ کے حکم سے راقم سطور کا بسیط مقدمہ بھی ہے، بعض عربی رسائل میں اس پر بہت اچھا تبصرہ نکلا۔ [2] آپ بیتی ۲ ص ۱۳۱

اوران کا علمی وتصنیفی کارنامہ "اوجز المسالک شرح مؤطا الامام مالکؒ" ہے، جو چھ[۶] ضخیم جلدوں میں ہے، اس کتاب کی بسم اللہ انھوں نے ربیع الاول کی پہلی تاریخ ۱۳۴۵ھ کو اقدامِ عالیہ میں بیٹھ کر لکھی، اور تیس[۳۰] سال سے زائد اس کی تالیف میں لگ گئے[۱]، میں نے علامۂ حجاز مفتی مالکیہ سید علوی مالکی سے جو نہ صرف حجاز کے بلکہ اپنے دور کے نہایت متبحر اور وسیع النظر عالم تھے[۲]، اوجز کی تعریف سنی، وہ اس پر تعجب کا اظہار کرتے تھے کہ خود مالکیہ کے اقوال ومسائل کا اتنا گہرا علم، اور اتنی صحیح نقل موجب حیرت ہے، وہ فرماتے تھے کہ:۔

"اگر شیخ زکریا مقدمہ میں اپنے کو حنفی نہ لکھتے تو میں کسی کے کہنے سے بھی ان کو حنفی نہ مانتا، میں ان کو مالکی بتاتا، اس لئے کہ اوجز المسالک میں مالکیہ کے جزئیات اتنی کثرت سے ہیں کہ ہمیں اپنی کتابوں میں تلاش میں دیر لگتی ہے۔"

مالکی علماء وقضاۃ نے اس کتاب کی بڑی قدر دانی کی، امارات خلیج کے رئیس القضاۃ (جو مذہب مالکی کے بڑے عالم ہیں) شیخ احمد عبد العزیز بن مبارک نے بھی اس کی طباعت واشاعت سے بڑی دلچسپی لی۔

اوجز کے شروع میں نوے[۹۰] صفحے کا ایک مبسوط مقدمہ ہے، جس میں فن حدیث کے تعارف وتاریخ اور تدوین حدیث پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے، پھر کتاب اور صاحب کتاب امام مالک کا مفصل تعارف اور ان دونوں کی خصوصیات وامتیازات کا مفصل تذکرہ ہے، نیز اس کے شروح اور عہد بعہد خدمات، اس کے ساتھ امت کے اعتناء کا ذکر ہے، پھر اپنے مشائخ اور سلسلۂ ولی اللّٰہی کے اسانید کی تفصیل، پھر اس سب کے بعد امام ابوحنیفہؒ کا تذکرہ اور ان کی محدثانہ حیثیت ودرجہ، اور ان کے اصول ومسلک کا تذکرہ ہے،

---

[۱] آپ بیتی ۲/ ۱۳۶ [۲] وسعت علم اور استحضار میں ان کو علامہ انور شاہ کشمیری سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔

پھر متفرق فوائد و قواعد اور ہدایات و توجیہات ہیں۔

"لامع الدراری" (جو اصلاً حضرت گنگوہیؒ کی تقریرات بخاری، اور مولانا محمد یحییٰ صاحب کے حواشی کا مجموعہ ہے) شیخ کے اضافوں اور تشریحات کی وجہ سے حدیث کے طالب علموں، اور مدرسین کے لئے معلومات کا ایک بیش بہا خزانہ بن گیا ہے، اس سے بہت سی ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں، جن کی قدر اہلِ درس ہی کر سکتے ہیں، کتاب کے شروع میں بڑی تختی ۱۷×۲۷/۴ پر ایک سو باون ۱۵۲ صفحے کا فاضلانہ مقدمہ ہے، جس میں نہ صرف امام بخاری اور ان کی نادر روزگار الجامع الصحیح کے مختلف گوشوں، مباحث و مسائل پر مبسوط کلام ہے، اور اس میں وہ معلومات، فوائد و نکات جمع کر دیئے گئے ہیں، جو اصول و رجال، اور تذکروں کے ہزاروں صفحات میں منتشر ہیں، بلکہ مراتبِ کتبِ حدیث، ابوابِ حدیث، تقریرو اجتہاد، اور احناف کے دفاع کے سلسلہ کی وہ تحقیقات بھی جمع کر دی گئی ہیں، جن سے یہ مقدمہ طالبین علم حدیث، بالخصوص حنفی المسلک علماء کے لئے ایک اچھی بیاض (علمی کشکول بن گیا ہے) اس میں شیخ کی بعض ذاتی تحقیقات، ان کے طویل درس حدیث کے وسیع مطالعہ کا نچوڑ بھی آگیا ہے، پہلی جلد اس بڑی تختی پر مع مقدمہ کے پانچ سو بارہ ۵۱۲ صفحات پر تمام ہوئی ہے، دوسری جلد بھی اسی سائز پر اتنے ہی صفحات پر تمام ہوئی ہے، اور کتاب الجہاد تک پہونچی ہے۔

اسی طرح ان کا رسالہ "الابواب والتراجم للبخاری" ان کے تحقیقی ذوق، اپنے مشائخ حدیث سے محبت، اور ان کے علوم کی حفاظت کا نمونہ ہے، یہ رسالہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کے رسائل و تحقیقات کا مجموعہ ہونے کے علاوہ، ابواب و تراجم کے سلسلہ میں ان اصول و

قواعد پر حاوی ہے، جو حافظ ابن حجر، قسطلانی، حافظ عینی کے شروح میں آئے ہیں، پھر ان میں ان اصول و قواعد کا اضافہ کیا ہے، جو ان کے ذوق و تحقیق اور طویل اشتغال وغور و تامل کا نتیجہ ہیں، اس طرح ان اصول و قواعد کلیہ کی تعداد ستر تک پہونچ گئی ہے، ہمارے علم میں اتنا احتواء کسی کتاب میں نہیں کیا گیا "والغیب عند اللہ" جو لوگ جانتے ہیں کہ بخاری کے ابواب و تراجم میں کتنے لطائف و نکات اور دقائق شامل ہیں، اور اساتذہ و مدرسین کو اس سلسلہ میں کیا ہفت خواں سر کرنا پڑتا ہے، وہ اس کتاب کی افادیت و اہمیت کو سمجھ سکتے ہیں۔

یہ چار کتابیں جو سب فن حدیث اور اس کے امہات کتب سے تعلق رکھتی ہیں، شیخ کو اپنے عہد کا (کم از کم علوم حدیث میں) عظیم مصنف بنانے اور اس کے محققین میں شامل کرنے کے لئے کافی ہیں[1]۔

اسی طرح حضرت گنگوہیؒ کی ترمذی کی تقریرات پر (جو شیخ کے والد ماجد مولانا محمد یحییٰ صاحب نے قلم بند و مرتب کی تھیں) ان مزید فوائد کا اضافہ کیا، جو دوسری شروح حدیث میں پائے جاتے تھے، اور کتاب پر مفید حواشی چڑھائے، جن میں بہت سی نادر علمی تحقیقات و تنقیحات آگئی ہیں، اور جو طویل عرصہ تک درس حدیث، اور اشتغال بکتب الحدیث سے ان کے ذہن میں آئے۔

شیخ کا یہ تصنیفی ذوق اور حدیث کی خدمت و اشاعت کا جذبہ ان پر اتنا غالب تھا، کہ بعض اوقات وہ اس کے مقابلہ میں حالات سے بالکل آنکھیں بند کر لیتے؛

---

[1] چاروں کتابوں پر راقم کے قلم سے عربی میں مفصل مقدمے ہیں، ان میں ان کتابوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے، یہاں اختصار سے کام لیا گیا ہے۔

اور بڑی سے بڑی ضرورت کو پس پشت ڈال دیتے' ناچیز کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

"۴۷ء میں میں نظام الدین میں محبوس تھا، اور جو حالات تھے' آپ کو یاد ہوں گے' ان حالات میں واپسی کا بالکل ارادہ نہیں تھا، مولوی نصیر الدین نے میرے ساتھ ایک ہوشیاری برتی، مجھے یہ لکھا کہ ایک کاتب مل گیا ہے' اوجز جلد چہارم کی کتابت شروع کرا دی ہے' اس کی طباعت پہلے سے شروع تھی' مگر تقسیم کے ہنگامہ میں کاپیاں بھی ضائع ہو گئی تھیں' اور کاغذ جو بڑی مقدار میں خریدا ہوا تھا، عنتر بود ہو گیا تھا، اس خط کے پہونچتے ہی میں نے عزیزم مولوی یوسف مرحوم سے اپنی واپسی کا خیال ظاہر کیا، مجھے اس مرحوم کا یہ فقرہ اتنا چبھ رہا ہے کہ "بھائی جی ہمیں اس حال میں چھوڑ کر جاویں گے؟" اور میرا یہ روکھا جواب کہ اب حالات قابل اطمینان ہو چلے ہیں' اب ٹھہرنا اوجز کی وجہ سے بہت مشکل ہے' یہ لمبی کہانی ہے' مگر جب خیال آجاتا ہے' بہت ہی طبیعت کو بے چین کر دیتا ہے' سہارنپور پہونچ کر معلوم ہوا کہ صرف منیجر صاحب کی ہوشیاری تھی' کاتب وغیرہ کوئی نہیں تھا۔"[1]

تاریخی اور تحقیقی ذوق

حدیث و علوم حدیث شیخ کا اصل ذوق، موضوع، اور محنت و تحقیق کا میدان تھا، اور اس کو وہ تقرب الی اللہ و تقرب الی الرسول کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھتے تھے'

---

[1] مکتوب مورخہ یکم شوال ۔ از مدینہ منورہ ۔

اور اس کو انھوں نے اپنا شعار و دثار بنا لیا تھا، یہاں تک کہ "شیخ الحدیث" کا لقب ان کے نام کا قائم مقام، اور اس سے زیادہ مشہور ہو گیا تھا، اور ان کو یہ کہنے کا حق تھا۔

ما آنچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
الّا حدیث دوست کہ تکرار می کنیم

لیکن اسی کے ساتھ ان کو تاریخی اور تحقیقی ذوق بھی تھا، جو اس وقت قدیم مدارس عربیہ و دینیہ میں کسی کو خال خال ہوتا تھا، اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ اپنے روزنامچہ میں اور اس کتاب میں جس کو تاریخ کبیر کے نام سے موسوم کرتے تھے، اہم واقعات، سنین وفات، اور حوادث قلم بند کرتے رہتے تھے، جن سے بعض مرتبہ ایسی معلومات حاصل ہو جاتی تھیں، جن کا دستیاب ہونا مشکل تھا۔

اس تاریخی ذوق، اور اپنے مادر علمی مدرسہ مظاہر علوم سے محبت و تعلق کا نتیجہ تھا کہ ۱۳۳۵ھ میں انھوں نے تاریخ مظاہر لکھی[1]، اس میں مدرسہ مظاہر علوم کے قیام و ترقی، بانیوں اور ذمہ داروں کے اصول و طریق کار، اساتذہ و مدرسین کے اخلاص و انہماک، انتظامی اور تدریسی تغیرات، اور کتب درسیہ وغیرہ کی ایسی تفصیلات و جزئیات آ گئی ہیں، جو کم مدارس کے متعلق محفوظ ہوئی ہوں گی، کتاب کی ضخامت ۱۶۲ صفحات ہیں، شیخ کا مدرسہ سے ایسا تعلق، اور اس کے حالات سے اتنی واقفیت و شیفتگی رہی ہے کہ اس کے متعلق یہ مصرعہ لکھنا صحیح ہوگا کہ ع

داستان فصلِ گل خوش می سراید عندلیب

ان کے اس تاریخی ذوق و تحقیق کی آئینہ دار چند کتابیں اور ہیں، ایک

---

[1] یہ کتاب عرصہ کے بعد ۱۳۹۲ھ میں طبع ہوئی۔

تاریخ مشائخ چشت[1] جو ۱۳۳۵ھ کی تالیف ہے، اس کتاب میں سلسلۂ عالیہ چشتیہ کے مشائخ کبار اور شیخ فریدالدین شکر گنج کے بعد اسی سلسلہ کی خاص شاخ (جس سے شیخ اور ان کے مشائخ کا تعلق رہا ہے) سلسلۂ صابریہ کے شیوخ کا تذکرہ ہے، جو خواجہ علاءالدین علی احمد صابر کلیری سے لے کر مولانا خلیل احمد صاحب پر منتہی ہوتا ہے، جن لوگوں کی سلاسل اور ان کے شیوخ کے تذکروں پر نظر ہے، وہ جانتے ہیں کہ ان کی سوانح اور حالات کی کڑیوں کے جمع کرنے میں تذکرہ نگاروں کو کیسی دقت پیش آتی ہے، شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے بعد ان کے قلم کو وسیع میدان ملا، اور انھوں نے تفصیل سے اپنے قریبی مشائخ کے حالات لکھے[2]۔

دوسری کتاب جس میں ان کا تاریخی ذوق نمایاں طور پر نظر آتا ہے، وہ ان کا غیر مطبوعہ رسالہ "المؤلفات والمؤلفین" ہے، جس میں معروف کتب حدیث و فقہ، اور معروف مؤلفین کے حالات، اور وہ حالات جن جن کتابوں میں ملتے ہیں، ان کے حوالے درج کئے گئے ہیں، اس کی ابتداء یکم جمادی الثانیہ ۴۷ھ کو ہوئی، اور اس کا سلسلہ ۸۸ھ تک اس وقت تک چلتا رہا جب تک آنکھیں کام دیتی رہیں، اس طرز کی تیسری تصنیف "الوقائع والدہور" ہے، جس میں عہد نبویؐ، خلافت راشدہ، اموی دور کے حالات درج کئے گئے ہیں، اس کی عہد کے لحاظ سے تین جلدیں ہیں، اس کی ابتداء ۲۵ محرم ۴۲ھ میں ہوئی تھی، اس کا سلسلہ بھی ۸۸ھ تک جاری رہا، ان تاریخی تصنیفات سے شیخ کے تاریخی ذوق کا اظہار ہوتا ہے، جو ان کے ماحول اور مشاغل کے لحاظ سے ایک امتیازی چیز ہے۔

---

[1] ضخامت تین سو انسٹھ (۳۵۹) صفحات، شائع کردہ کتب خانہ اشاعت العلوم محلہ مفتی سہارنپور سنہ طباعت ۱۳۹۳ھ (۱۹۷۳ء) [2] کتاب کے آخر میں کتاب کے ناشر مولوی محمد شاہد صاحب مظاہری نے خود حضرت شیخ کے حالات کا تکملہ شامل کیا ہے۔

حجاز کے زمانۂ قیام میں جب وہ چند در چند معذوریوں، اور کثیر عوارض میں مبتلا تھے، انھوں نے فضائل زبان عربی پر ایک رسالہ لکھوانا شروع کر دیا، اس کی ابتداء ۲۵ صفر ۱۳۹۶ھ قبیل ظہر مسجد نبوی میں ہوئی،[1] اس رسالہ کی تصنیف میں ان کو ایسا انہماک ہوا اور وہ ذہن و دماغ پر ایسا مستولی ہو گیا کہ انھوں نے مدینہ طیبہ سے اس ناچیز کے نام ایک خط لکھا جس سے اس کا پورا اندازہ ہو سکتا ہے:۔

"ان کے خط کی آرزو ہے ان کی آمد کا خیال کس قدر پھیلا ہوا ہے کاروبار انتظار

"ایک نہایت اہم ضروری مضمون پانچ چھ خطوں میں لکھوا چکا ہوں، وہ یہ کہ مجھے عربی زبان کی فضیلت پر ایک رسالہ لکھنے کا خیال چار ماہ سے ہو رہا ہے، یہ تو یاد نہیں کہ اس کا پس منظر بھی آپ کو لکھوا چکا ہوں، یا نہیں، مگر اس مضمون کی کوئی کتاب یہاں نہیں ملتی جس میں روایات حدیث ہوں، تقریباً دو ماہ ہوئے، جب آپ کی آمد کی پہلی خبر سنی تھی، اس وقت میں نے دمادم دو تین خط لکھوائے تھے، اس مضمون کے کہ آپ کے یہاں کچھ رسائل ندوہ میں یا آپ کے پاس ہوں تو اپنے ہمراہ لیتے آویں، اور ہمراہ ہی واپس لیتے جائیں، نیز عزیزان رابع و واضح کو بھی یہ پیام آپ کے خط میں لکھوایا تھا کہ کسی آیت کی تفسیر میں دُرِ منثور یا کسی اور تفسیر میں روایات ہوں، تو وہ تلاش کر کے اس کے حوالے بھیج دیں، تو میں دوستوں سے اس کتاب کو تلاش کرواؤں۔"[2]

---

[1] کتاب کے مقدمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا محرک ایک خواب تھا، جس میں اشارۂ نبوی شامل تھا۔

[2] ۱۳ فروری ۱۹۷۶ء۔

فضائل وحکایات کے رسائل

یوں تو شیخ کی کل مطبوعہ وغیر مطبوعہ تالیفات کی تعداد سو سے زیادہ ہے[1]، لیکن ان تصنیفات میں حکایات صحابہ اور کتب فضائل کو تبلیغی جماعتوں کے نصاب میں شامل ہونے اور افادۂ عام کی وجہ سے جو مقبولیت وشہرت حاصل ہوئی، اور ان سے امت کے ایک بڑے طبقہ کو جو فائدہ پہونچا اس کی نظیر کم از کم اردو کی دینی ودعوتی کتابوں میں ملنی مشکل ہوگی، بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے، کہ ان کے مطبوعہ نسخوں کی تعداد لاکھوں سے متجاوز ہے، پھر ان سے جو دینی وعملی نفع پہونچا اس کے بارے میں ایک ممتاز معاصر عالم کا یہ کہنا مبالغہ آمیز نہیں معلوم ہوتا کہ "ان کے ذریعہ ہزاروں بندگان خدا ولایت کے درجہ تک پہونچ گئے"۔

ان کتابوں میں "حکایات صحابہؓ" کو خاص مقام حاصل ہے، جو اپنی تاثیر وافادیت میں خاص امتیاز رکھتی ہے، یہ کتاب حضرت مولانا عبد القادر صاحب رائے پوری کی فرمائش پر لکھی گئی، وہ عرصہ سے شیخ سے اس کا تقاضہ فرما رہے تھے کہ حضرات صحابہؓ کے احوال سے ان کو عشق تھا، شیخ کا تدریسی وتصنیفی انہماک اس کا موقعہ نہیں دیتا تھا کہ اچانک ۵۷ھ میں شیخ کو سخت نکسیر کا دورہ پڑا، اور ان کو چند ماہ کے لئے دماغی کام سے روک دیا گیا، وہ بغیر کام کئے رہ نہیں سکتے تھے اس زمانہ میں انھوں نے "حکایات صحابہؓ" لکھی، جو

---

[1] ملاحظہ ہو "آپ بیتی" نمبر ۲ کا آخری حصہ از ص ۱۴۴ تا ۱۶۴ اس میں خود حضرت شیخ کی زبان سے تالیفات ورسائل کا تعارف، موضوع اور ان کی ابتداء وانتہاء کی تاریخ ہے، سوانح کے اس باب میں تصنیفات پر عمومی واجمالی تبصرہ ہی پر اکتفا کیا گیا ہے۔

۱۲ر شعبان ۱۳۵۷ھ کو مکمل ہوئی، یہ کتاب بے حد مقبول ہوئی، تبلیغی جماعت کے نصاب کا اہم جزء ہونے کے علاوہ وہ دینی ودعوتی حلقوں کی مقبول ترین نصابی ودعوتی کتاب ہے، زبان سلیس وشیریں، طرزبیان دل نشین، واقعات مؤثر نہ صرف رقت انگیز، بلکہ انقلاب انگیز ہیں۔

شیخ کا بڑا کارنامہ اور ان کی سعی مشکور فضائل کے رسائل وتصنیفات کی ترتیب وتالیف ہے، ہندوستان میں تبلیغی جماعت کے داعی اول وبانی حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کا یہ اعلیٰ درجہ کا تفقّہ فی الدین، فراست ایمانی، اور دین کے عمیق فہم کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے مسلمان کی زندگی وعمل میں فضائل کی اہمیت وقوت اور سحر انگیزی کا ادراک کیا، اور انھوں نے اس حقیقت کو سمجھا کہ جو "طاقت زندگی کے پہیہ کو تیزی کے ساتھ حرکت دیتی ہے، اور جس کے دم سے دنیا کا بازار گرم اور اس کی رونق قائم ہے، وہ "نفع" پر یقین ہے، یہی وہ یقین ہے کہ جو کسان کو سخت سردی کے موسم میں اپنے بستر سے اٹھا دیتا ہے، اور اندھیرے منہ کھیت میں پہونچا دیتا ہے، اور لو کے تھپیڑوں، اور سورج کی تپش میں کھیت جوتنے اور پسینہ بہانے کی قوت بخشتا ہے، یہی یقین ایک تاجر کو گھر بار، راحت وآرام چھوڑ کر اپنے کاروبار میں مشغول ہونے پر آمادہ کرتا ہے، وہی یقین ایک فوجی کے لئے موت کو آسان اور زندگی کو دشوار بنا دیتا ہے، جو چیز اس کو اپنی محبوب اولاد کو چھوڑ کر بے تکلف میدان جنگ میں چلے جانے پر اکساتی ہے، وہ نفع کا یقین اور مستقبل میں کسی فائدہ کی توقع ہے، اور یہی وہ محور ہے جس کے گرد زندگی کی چکی گھومتی ہے۔

لیکن اس یقین کے سوا ایک یقین اور ہے، جو اپنی انقلاب آفرینی اور قوت وتاثیر میں اس یقین سے کہیں بڑھ کر ہے، جس کی مثالیں اوپر پیش کی گئی ہیں، یہ ان منافع کے حصول کا یقین ہے، جس کی خبر انبیاء کرام اس دنیا میں لے کر آئے، اور وحی اور تمام

آسمانی صحیفوں نے اس کی تصدیق اور تلقین کی جس کو ہم خدا کی خوشنودی اور دنیا اور آخرت میں اعمال کے بدلے سے تعبیر کر سکتے ہیں"[1]

فضائل کی احادیث میں اسی کو "ایمان واحتساب" سے تعبیر کیا گیا ہے اور اسی کو مؤمن کے عمل کے لئے سب سے بڑی قوتِ محرکہ ہونا چاہئے[2]۔

مولانا محمد الیاس صاحبؒ فرماتے تھے کہ "فضائل کا درجہ مسائل سے پہلے ہے فضائل سے اعمال کے اجر پر یقین ہوتا ہے جو ایمان کا مقام ہے اور اس سے آدمی عمل کے لئے آمادہ ہوتا ہے مسائل معلوم کرنے کی ضرورت کا احساس تو تب ہی ہوگا جب وہ عمل پر تیار ہوگا اس لئے ہمارے نزدیک فضائل کی اہمیت زیادہ ہے[3]"۔

شیخ نے اس ضرورت کی تکمیل کے لئے "فضائل نماز" "فضائل رمضان" "فضائل قرآن" "فضائل ذکر" "فضائل حج" "فضائل صدقات" "فضائل تبلیغ" اور "فضائل درود" لکھیں، ان میں سے اکثر کتابیں حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے ایماء و حکم سے لکھی گئیں، "فضائل قرآن" اور "فضائل درود" شاہ محمد یٰسین صاحب نگینوی (یکے از خلفائے حضرت گنگوہیؒ) کی فرمائش سے لکھی، "فضائل حج" ۳ر شوال ۱۳۶۶ھ کو شروع کی، کتاب میں بڑے شوق انگیز واقعات اور رقت انگیز اشعار ہیں، جو حج کے مقصد و روح سے خاص مناسبت

---

[1] واوین کے درمیان کی عبارت مصنف کی کتاب "ارکانِ اربعہ" کے باب "روزہ" سے ماخوذ ہے، ملاحظہ ہو عنوان "فضائل اور اس کی قوت و تاثیر" ص ۲۶۵

[2] صوم و قیام رمضان کے سلسلہ میں احادیث میں واضح طور پر یہ الفاظ آئے ہیں "من صام رمضان ایمانا واحتسابا الخ" ...... "من قام لیلۃ القدر ایمانا واحتسابا الخ"

[3] ملفوظات حضرت دہلوی۔

رکھتے ہیں، اس لئے کتاب بڑی مؤثر ہے، اس کے ساتھ شیخ کا ذوق شعری، اور حسن انتخاب بھی نمایاں ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عنان قلب و قلم دونوں ہاتھ سے چھوٹ گئے ہیں، مدینہ طیبہ حاضری کے آداب و اشواق کو دل کھول کر لکھا ہے، جس سے کتاب "کاروان مدینہ کی حدی خوان" بن گئی، اسی طرح "فضائل صدقات" میں اہل قلوب اور رجال آخرت کے ایثار و توکل، تحقیر دنیا اور شوق آخرت کے ایسے مؤثر واقعات جمع کر دیئے ہیں، جن سے مال و متاع دنیا کی حقارت، آخرت کی عظمت و اہمیت، اور شوق لقاء پیدا ہوتا ہے، غرض یہ سب کتب رسائل و فضائل بڑے مؤثر، دل پذیر اور شوق انگیز ہیں۔

شیخ کی تصنیفی جامعیت

عام طور پر جو لوگ علمی اور تحقیقی طرز کے عادی ہوتے ہیں، وہ خالص دعوتی و اصلاحی اور عام فہم طرز پر تصنیف و تالیف کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے، اور جو دوسرے طرز کے عادی ہو جاتے ہیں، وہ پہلے طرز میں اس کے آداب و معیار کو قائم نہیں رکھ سکتے، لیکن شیخ کی دونوں طرز کی تصنیفات مؤثر اور کامیاب ہیں، پہلے طرز کا نمونہ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا "اوجز المسالک" "مقدمہ لامع الدراری" "حجۃ الوداع و عمرات النبی صلے اللہ علیہ وسلم" اور علمی و تدریسی رسائل "جزء اختلافات الصلاۃ" "جزء اختلاف الائمۃ" اور "جزء المبہمات فی الاسانید والروایات" ہیں[1] دوسرے طرز کا نمونہ "حکایاتِ صحابہؓ" اور فضائل کے رسائل اور کتابیں ہیں، اور ان دونوں طرزوں کی جامع شمائل ترمذی کا ترجمہ "شرح خصائل نبویؐ" ہے، اس طرح شیخ بیک وقت مصنف و محقق بھی نظر آتے ہیں،

---

[1] افسوس ہے کہ یہ سب رسائل غیر مطبوعہ ہیں، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "آپ بیتی" نمبر ۲ ص ۱۴۹-۱۵۰

شارح حدیث اور مؤرخ بھی معلوم ہوتے ہیں، اور خالص داعی، مذکّر اور مختلف طبقات امت کے ان کی زبان میں مخاطب کرنے والے مصلح بھی نظر آتے ہیں۔

"وذلك فضل الله يؤتيه من يشاء"
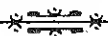
بابُ یازدہم
ارشاداتُ و افاداتُ

اس حقیقت کے پیش نظر کہ علماء ربانی و مشائخ روحانی کو اپنی زندگی کے حالات و سوانح سے زیادہ دین کی صحیح تعلیمات و ہدایات اپنے مطالعہ کے نچوڑ اور اپنی زندگی کے تجربات اور مخلصانہ مشوروں کی اشاعت کا اہتمام ہوتا ہے، جن پر عمل پیرا ہو کر وہ ان اعلیٰ مراتب تک پہونچے اور جن سے فائدہ اٹھا کر اور ان پر کاربند ہو کر دوسرے بھی دینی و روحانی ترقیات حاصل کر سکتے ہیں، اور بہت سے خطرات اور غلطیوں سے بچ سکتے ہیں، ہم یہاں حضرت شیخ کے چند ملفوظات نیز اُن کی مقبول و مشہور اردو تصنیفات و رسائل کے اقتباسات پیش کرتے ہیں، کہ جن قارئین کو ان کتابوں کے بالاستیعاب مطالعہ کا موقع نہ ملا ہو، وہ بھی ان سے فائدہ اٹھالیں، تصنیفات کے اقتباسات کے انتخاب و نقل کے سلسلہ میں ہم عزیز گرامی مولوی عتیق احمد صاحب بستوی استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ممنون ہیں۔

چند ملفوظات

تصوف کی حقیقت دو لفظوں میں

فرمایا کہ "ایک مرتبہ دس بجے صبح کو میں اوپر اپنے کمرے میں نہایت مشغول تھا، مولوی نصیر نے اوپر جا کر کہا کہ رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی آئے ہیں، رائے پور جا رہے ہیں، صرف مصافحہ کرنا ہے، میں نے کہا جلدی بلا دے، مرحوم اوپر چڑھے، اور زینے پر چڑھتے ہی سلام کے بعد مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا کر کہا رائے پور جا رہا ہوں، اور ایک سوال آپ سے کر کے جا رہا ہوں، اور پرسوں صبح واپسی ہے، اس کا جواب آپ سوچ رکھیں، واپسی میں جواب لوں گا، "یہ تصوف کیا بلا ہے؟ اس کی کیا حقیقت ہے؟" میں نے مصافحہ کرتے کرتے جواب دیا "صرف تصحیح نیت" اس کے سوا کچھ نہیں، جس کی ابتداء "إنما الأعمال بالنیات" سے ہوتی ہے، اور انتہا "أن تعبد الله كأنك تراه" ہے، میرے اس جواب پر سکتہ میں کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے دلّی سے یہ سوچتا آ رہا ہوں کہ تو یہ جواب دے گا، تو یہ اعتراض کروں گا، اور یہ اعتراض کرے گا تو یہ جواب دوں گا، اس کو تو میں نے سوچا ہی نہیں۔

"إنما الاعمال بالنیات" سارے تصوف کی ابتداء ہے، اور "أن تعبد الله کانك تراه" سارے تصوف کا منتہا ہے، اسی کو نسبت کہتے ہیں، اسی کو یاد داشت کہتے ہیں، اسی کو حضوری کہتے ہیں ؎

حضوری گر ہمی خواہی ازو غافل مشو حافظ   متی ما تلق من تھوی دع الدنیا واھملھا

میں نے کہا مولوی صاحب سارے پاپڑ اسی کے لئے بیلے جاتے ہیں، ذکر بالجہر بھی اسی کے واسطے ہے، مجاہدہ و مراقبہ بھی اسی کے واسطے ہے، اور جس کو اللہ جل شانہ اپنے لطف و کرم سے کسی بھی طرح سے یہ دولت عطا کردے، اس کو کہیں کی بھی ضرورت نہیں"۔

وقت کی قدر کی جائے

فرمایا: "اوقات بہت قیمتی ہیں، زندگی کا جو وقت مل گیا ہے اس کی قدر پہچاننی چاہیئے، حدیث میں آتا ہے" فلیتزود العبد من نفسہ لنفسہ ومن حیاتہ لموتہ ومن شبابہ لکبرہ ومن دنیاہ لآخرتہ" بندے کو چاہیئے کہ وہ اپنی زندگی میں اپنے لئے اور زندگی میں موت سے پہلے، اور نوجوانی میں اپنے بڑھاپے سے پہلے، اور اس دنیا میں آخرت سے پہلے زادِ راہ تیار کرلے ؎

تیرا ہر سانس نخلِ موسوی ہے
یہ جزر و مد جواہر کی لڑی ہے"

عبودیت و اطاعت کا ثمرہ

فرمایا: "میرے دوستو! مالک کے سامنے جھک جاؤ، تو ساری چیزیں تمہارے سامنے جھک جائیں گی، صحابہ کرام کے قصے معلوم ہیں، ایک مرتبہ افریقہ کے جنگل میں مسلمانوں کو چھاؤنی ڈالنے کی ضرورت پیش آئی، اور ایسے جنگل میں جہاں ہر قسم کے درندے اور موذی جانور بکثرت تھے، حضرت عقبہؓ امیر لشکر چند صحابہؓ کو ساتھ لے کر ایک جگہ پہونچے، اور اعلان کیا" ایہا الحشرات والسباع نحن اصحاب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فارحلوا فانا

نازلون فمن وجدناہ بعد قتلناہ" اے زمین کے اندر رہنے والے جانورو، اور درندو! ہم صحابہؓ کی جماعت اس جگہ رہنے کا ارادہ کررہے ہیں، اس لئے تم یہاں سے چلے جاؤ، اس کے بعد جس کو تم میں سے ہم پائیں گے قتل کردیں گے، یہ اعلان تھا یا کوئی بجلی تھی، جوان درندوں اور موذی جانوروں میں دوڑ گئی اور اپنے بچوں کو اٹھا اٹھا کر سب چل دیئے۔ (اشاعہ)

بوستان میں ایک قصہ ہے کہ ایک بزرگ چیتے پر سوار تھے، ایک شخص نے دیکھا تو ڈر گیا تو اس بزرگ نے کہا ؎

تو از حکم داور گردن نہ پیچ
کہ گردن نہ پیچد ز حکمِ تو ہیچ"

حیوانی معاصی سے شیطانی معاصی زیادہ خطرناک ہیں

ارشاد فرمایا: "معاصی دو قسم کے ہیں، حیوانی و شیطانی، حیوانی کھانا، پینا، شہوت وغیرہ، شیطانی تکبر، اور دوسروں کو حقیر سمجھنا، اور اپنے آپ کو اونچا سمجھنا، اس کو "رسالہ اسٹرائک" میں میں نے لکھا ہے، مفتی محمود صاحب نے اس پر اعتراض کیا تھا کہ اس سے پہلے قسم کی معاصی کی اہمیت ہلکی ہوجاتی ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ پہلے قسم کے معاصی رونے دھونے سے معاف ہوسکتے ہیں، اور دوسرے قسم میں توبہ کی توفیق کم ملتی ہے، آدمی اس کو گناہ سمجھتا ہی نہیں، اس کی معافی دیر سے ہوتی ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو درخت کے پاس جانے سے روک دیا گیا تھا، مگر وہ غلطی سے گئے، پھر توبہ کی اور وہ قبول ہوئی، ابلیس نے سجدہ سے تکبر کی بنا پر انکار کیا تھا، پہلی قسم میں افتقار پیدا ہوتا، اور دوسری میں اللہ کی کبریائی سے مقابلہ، بہت سے لوگوں کو

دیکھا کہ ان کے حالات قابلِ رشک تھے، مگر دوسروں پر تنقید و تحقیر نے انھیں گرا دیا، بہر حال اس نسبت سے اگر دوسری قسم کے معاصی مزاحم ہوئے تو معاملہ زیادہ سخت ہے۔

بزرگوں کی ابتدا (دورِ مجاہدہ) کو دیکھنا چاہیے

حضرت نے ارشاد فرمایا:۔ "ہمارے بزرگوں کا مقولہ ہے" جو ہماری انتہا کو دیکھے وہ ناکام اور جو ابتداء کو دیکھے وہ کامیاب" اس لئے کہ ابتدائی زندگی مجاہدوں میں گذرتی ہے، اور اخیر میں فتوحات کے دروازے کھلتے ہیں، اگر کوئی ان فتوحات کو دیکھ کر آخری زندگی کو معیار بنائے تو وہ ناکام ہو جائے گا"۔

مجاہدہ و قربانی ترقیِ روحانی کی شرط ہے

ارشاد فرمایا:۔ ع

"رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ رگڑ جانے کے بعد[1]

دیکھو حنا (مہدی) کی پتی جب رگڑ دی جائے تو وہ رنگین بنا دیتی ہے، اور اگر بغیر رگڑے ہوئے، اسی کے پتے رکھ دیئے جائیں تو کچھ نہ ہوگا، حضرت مدنیؒ فرماتے تھے کہ مسجدِ اجابت میں ذکر کرتا تھا، جی چاہتا تھا کہ اس کی دیواروں سے سر پھوڑ لوں"۔

اظہار و حقیقت میں فرق

فرمایا:۔ "ہم لوگ اپنی زبان اور اپنے قلم سے ناکارہ و سیہ کار لکھتے ہیں، مگر یہ رسم

---

[1] ترمیم فرمائی گھِس جانے کے بجائے رگڑ جانے سے۔

بن گئی ہے، اگر کسی مجمع میں کوئی اعتراض کردے تو سن کر دماغ کھولنے لگتا ہے، حالانکہ اگر ماننے کی بات ہے تو اس پر ناگواری کیسی؟ اس کو ضرور ماننا چاہئے، حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے "انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق" میں مکارم اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں، خصوصیت سے جو لوگ ذاکر و اجازت یافتہ ہیں، ان کے اخلاق ایسے ہونے چاہئیں کہ دوسروں کی ہدایت کا سبب بنیں، نہ کہ اکھڑنے کا، اور متنفر ہونے کا۔"

افراط و تفریط سے اجتناب

ارشاد فرمایا:۔ حدیث میں آیا ہے کہ مُردوں کا بُرائیوں کے ساتھ ذکر نہ کرو، بلکہ ان کی بھلائیوں کا تذکرہ کرو، ہم لوگ اس قدر افراط و تفریط میں مبتلا ہیں، تعریف میں تو کسی کو آسمان پر چڑھا دیتے ہیں، اور کسی کو تحت الثریٰ میں پہونچا دیتے ہیں، اللہ تعالے فرماتا ہے "وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى" کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس پر نہ آمادہ کرلے کہ تم اس کے ساتھ انصاف نہ کرو، انصاف اختیار کرو، یہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔"

ذکر الٰہی میں فتنوں سے حفاظت ہے

فرمایا:۔ آج ہمارے مدارس میں ساری خرابیاں اسٹرائک وغیرہ سب اسی خانقاہی زندگی کی کمی سے پیش آرہی ہیں، حدیث میں آیا ہے کہ اگر زمین میں اللہ اللہ کہنے والے ختم ہوجائیں تو قیامت آجائے گی، یہی حال مدرسوں کی بقا کا ہے، اللہ کا نام خواہ کتنی ہی بے توجہی سے

لیا جائے اثر کئے بغیر نہیں رہتا، ہم لوگوں میں اخلاص نہیں رہا، اللہ اللہ کرنے کے سلسلے کو بڑھاؤ، اللہ کا نام جہاں کثرت سے لیا جائے گا، وہاں فتنہ نہ ہوگا، اللہ کا ذکر حوادث وفتن میں سدِّ سکندری ہے، پہلے زمانہ میں دورۂ حدیث میں طلبہ کی ایک تعداد ذاکر ہوا کرتی تھی"۔

اللہ سے تقرب حاصل کرنے کا راستہ آسان ہے

ارشاد فرمایا:۔ "حدیث میں آیا ہے "بہت سے پراگندہ سر، غبار آلود جن کو دروازوں سے دھکا دیا جاتا ہے، اگر وہ اللہ پر قسم کھالیں تو اللہ ان کے قسم کی لاج رکھ لیتا ہے" آدمی ریاضت ومجاہدے سے یہ مقام حاصل کرسکتا ہے، دوسری حدیث میں آیا ہے" لایزال عبدی یتقرب الیّ بالنوافل الخ" آدمی نوافل کے ذریعہ برابر حق تعالےٰ کا قرب حاصل کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ میں اس کو محبوب بنا لیتا ہوں، آگے مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کے بعد اس کے ہاتھ پیر سے جو کچھ صادر ہوتا ہے، وہ حق تعالےٰ کی مرضی کے موافق ہوتا ہے"۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا:۔ "اللہ جل شانہ، کا راستہ بہت آسان ہے تجربہ بھی ہے اور لوگوں کو دیکھا بھی ہے ؎

یعلم اللہ راہِ خدا بیش از دو قدم نیست
یک قدم بر نفس خود نہ دیگرے بر کوئے دوست"

ارشاد فرمایا:۔ "بھائی دیکھو، جو کچھ کرو اللہ کی مرضی کے موافق کرو اپنے جی و مرضی کے موافق نہ کرو، کچھ کرلو، رمضان المبارک میں اس کی مشق کرلو، ہمارے بزرگوں میں سے کوئی

یہ نہیں کہتا کہ ملازمت نہ کرو، دوکان نہ کرو۔[1]"

اقتباسات ومنتخبات

تصوف کی حقیقت

"تصوف میرے اکابر کا اہم ترین مشغلہ ہے ؎

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق

ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

کے وہ سچے مصداق تھے، یہ حضرات ایک جانب فقہ، حدیث اور علوم ظاہر یہ میں اگر ائمۂ مجتہدین اور ائمۂ حدیث کے حقیقی جانشین اور سچے تبع تھے، تو دوسری جانب تصوف کے ائمہ جنیدؒ و شبلیؒ کے قدم بقدم، ان اکابر نے تصوف کو فقہ و حدیث کے ماتحت چلایا اور اپنے قول و فعل سے بتلا دیا کہ یہ مبارک فن حقیقت میں قرآن و حدیث ہی کا ایک شعبہ ہے، اور جو رسوم و بدعات اس مبارک فن میں بُعد زمانہ سے بڑھ گئی تھیں، ان کو چھانٹ دیا، تصوف کو بعض ناواقفوں نے ظاہر شریعت کا مخالف نہیں تو علیحدہ ضرور بنا دیا، یا تو غلو ہے یا جہل۔

حقیقی تصوف کو جس کا دوسرا نام احسان ہے، حضرت جبرئیل علیٰ نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام نے حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم سے اس کی حقیقت لوگوں کے سامنے

[1] منقول از "صحبتے با اولیاء" مرتبہ از مولوی تقی الدین ندوی، مظاہری۔

دریافت کرکے یہ واضح کردیا کہ یہ شریعت ہی کی روح اور مغز ہے، اور حضرت جبرئیل کے اس سوال پر کہ احسان کیا چیز ہے، سید الکونین کے اس پاک ارشاد نے "ان تعبد اللہ کانک تراہ الخ" الحدیث (تو اللہ کی عبادت ایسی کرے گویا اس کو دیکھ رہا ہے۔)

احسان کے معنی اور تصوف کی حقیقت واضح کردی، عنوانات تو اس کے جو بھی اختیار کرلئے جاویں لیکن مرجع سب کا یہی حقیقت ہے ؎

اورّی بسعدی والرباب وانما
انت الذی تعنی وانت المؤمل

شاعر کہتا ہے کہ چاہے میں مشہور محبوبہ سعدی کا نام لوں یا معروف معشوقہ رباب کا نام لوں ہر چیز سے مقصود تو ہی ہے اور تو ہی مطلوب ہے۔

یہ تو حقیقت ہے، اس کے بعد جو چیزیں ذکر و شغل، مجاہدات و ریاضات یہ حضرات تجویز کرتے ہیں، وہ حقیقت میں سب علاج ہیں، چونکہ سید الکونین صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے جتنا بُعد ہوتا جاتا ہے، اتنا ہی قلوب میں زنگ اور امراضِ ردیہ دلوں میں پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں، اور جیسا کہ یونانی اطباء اور ڈاکٹر جدید امراض کے لئے تجربات یا قواعد سے وقتی اور نئی نئی چیزیں اور دوائیاں تجویز کرتے ہیں، اسی طرح یہ روحانی اطباء قلبی امراض کے لئے ہر شخص کے حال کے موافق اور ہر زمانہ کے موافق دوائیں تجویز کرتے ہیں، حضرت مولانا وصی اللہ صاحب جو حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نور اللہ مرقدہ کے اجل خلفاء میں ہیں، ان کا ایک رسالہ "تصوف اور نسبتِ صوفیہ" مختصر اور قابل دید ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت ابو یحییٰ زکریا انصاری شافعیؒ فرماتے ہیں کہ تصوف کی اصل "حدیث جبرئیل" ہے، جس میں آیا ہے کہ "ما الاحسان: قال

ان تعبد اللہ کانک تراہ" (الحدیث) چنانچہ تصوف احسان ہی کا نام ہے[1]۔

تصوف کا لب لباب

"تصوف ایک عظیم الشان چیز تھی، جس کی تعریف علماء تصوف نے یہ فرمائی ہے کہ "ھو علم الخ" وہ ایسا علم ہے جس کے ذریعہ سے نفوس کا تزکیہ، اخلاق کا تصفیہ اور ظاہر و باطن کی تعمیر کے احوال پہچانے جاتے ہیں، جس کی غرض ابدی سعادت کی تحصیل ہے۔

اب آپ خود غور فرمایئے کہ اس میں سے کونسی چیز غلط ہے؟ نفس کا تزکیہ غلط ہے، یا اخلاق کا تصفیہ بُرا ہے، ظاہر و باطن کی تعمیر لغو ہے؟ یا سعادت ابدیہ کی تحصیل بیکار ہے؟ اسی طرح تقویم اخلاق، تہذیب نفس، نیز نفس کو اعمال دین کا خوگر بنانا اور شریعت کو نفس کے حق میں وجدان بنا لینا ان امور میں کون سی شئی مقاصد شرع کے خلاف ہے؟ ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں، بلکہ ان میں سے ہر ایک شئی کتاب وسنت کے عین مطابق اور اللہ ورسول صلے اللہ علیہ وسلم کے منشاء کو پورا کرنے والی ہے۔

غرض ہم جس تصوف کے اثبات کے قائل ہیں وہ وہی ہے، جس کو اصطلاح شرع میں احسان کہتے ہیں، یا جس کو علم الاخلاق کہا جاتا ہے، یا تعمیر الظاہر والباطن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اور یہ ایک بانظم و با اصول چیز ہے، اس میں مریدین کے لئے بھی شرائط ہیں، اور شیخ کے لئے بھی اصول و آداب ہیں، جن کی رعایت کرنے کے بعد اس کو شریعت کا مغز اور دین کا لب لباب کہنا بجا ہے، اور جب ان شرائط و آداب کا لحاظ نہ کیا جائے، بلکہ غیر تصوف کو تصوف قرار دے دیا جائے تو پھر وہ طریق ہی نہیں جو ہمارا

---

[1] اکابر کا سلوک واحسان۔ ص ۱۷-۱۸

موضوع بحث ہے، اس لئے کہ ان کی خرابیوں اور ان پر عمل کرنے کی وجہ سے سالک میں جو خرابیاں پیدا ہوں اس کا ذمہ دار کسی طرح حقیقی تصوف اور اصل طریق کو نہیں قرار دیا جاسکتا، اب اگر آپ کو تصوف سے محض اس بنا پر چڑ اور انکار ہے کہ اس کا نام محدث ہے، تو اس میں تصوف ہی منفرد نہیں، نہ معلوم کتنی چیزیں اس وقت موجود ہیں کہ آپ کا ان سے تعلق بھی ہے، جو کہ ابتداء اسلام میں ان ناموں سے معروف نہ تھیں، میں کہتا ہوں کہ اگر اس کا نام بدعت ہے تو مسمی تو اس کا بدعت نہیں، آپ اس کو احسان سے تعبیر کر لیجئے، علم الاخلاق اس کا نام رکھ لیجئے اور جو شخص کہ اس سے متصف ہو، اس کو محسن اور مقرب اور مخلص کہہ لیجئے اور احسان، محسن، متقی و مخلص کے ذکر سے قرآن بھرا ہوا ہے، حدیث شریف میں بھی اس کا ذکر آیا ہوا ہے"[1]

مسلمانوں کی نجات و ترقی کا واحد راستہ

"حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ جس وقت شام تشریف لے جارہے تھے، راستہ میں ایک جگہ کچھ گارا پانی آگیا، آپ اونٹ پر سے اتر لئے، موزے نکال کر شانہ پر رکھ لئے اور اس میں گھس کر اونٹ کی نکیل ہاتھ میں پکڑ لی، وہ ساتھ ساتھ تھا حضرت ابو عبیدہؓ بن جرّاح رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے عرض کیا آپ نے یہ ایک ایسی بات کی کہ شام والے تو اس کو بڑی ذلت کی چیز سمجھتے ہیں، میرا دل نہیں چاہتا کہ اہل شہر آپ کو اس حالت پر دیکھیں، آپ نے ان کے سینہ پر ایک ہاتھ مارا اور ارشاد فرمایا کہ ابو عبیدہ تمہارے علاوہ کوئی دوسرا ایسی بات کہتا تو میں عبرت انگیز سزا دیتا، ہم لوگ ذلیل تھے حقیر تھے، اللہ جل شانہ نے

---

[1] اکابر کا سلوک و احسان ص ۲۱-۲۲

اسلام کی بدولت عزت عطا فرمائی، پس اب جس چیز سے اللہ نے عزت دی اس کے سوا کسی چیز کے ساتھ عزت ڈھونڈیں گے تو اللہ ہم کو ذلیل کردیں گے" (مستدرک للحاکم) حقیقۃً مسلمان کے لئے اصل عزت اللہ کے یہاں کی عزت ہے، دنیا اور دنیا والوں کے نزدیک اگر ذلت ہوئی بھی تو کیا اور کے دن کی ہے

لوگ سمجھیں مجھے محروم وقار و تمکین
وہ نہ سمجھیں کہ مری بزم کے قابل نہ رہا

نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "جو شخص اللہ کی نافرمانیوں کے ساتھ لوگوں میں عزت تلاش کرتا ہے، اس کی تعریف کرنے والے اس کی مذمت کرنے والے بن جاتے ہیں" اس لئے مسلمانوں کے لئے ترقی کی راہ، عزت کی راہ، زندگی اور دنیا میں آنے کی غرض صرف اللہ کی رضا اس کی مرضیات پر عمل ہے، اس کے سوا کچھ نہیں، اگر عزت ہے تو یہی ہے منفعت ہے تو یہی ہے، حیرت ہے کہ مسلمانوں کے لئے اللہ کے پاک کلام اور اس کے رسول کے سچے ارشادات میں علوم و حکمت دارین کی فلاح و ترقی کے اسباب اور خزانے بھرے ہوئے ہیں لیکن وہ ہر بات میں دوسروں پر نگاہ رکھتے ہیں، دوسروں کا پس خوردہ کھانے کے درپے رہتے ہیں، کیا یہ چیز انتہائی بے غیرتی اور اللہ اور اس کے پاک رسول کے ساتھ اجنبیت اور مغائرت کی نہیں ہے، کیا اس کی مثال اس بیمار کی سی نہیں جس کے گھر میں ایک مرجع الخلائق حکیم ایک حاذق ڈاکٹر موجود ہو اور وہ کسی اناڑی ڈاکٹر سے علاج کرائے۔

الغرض مسلمان کے لئے صلاح و فلاح صرف اتباع مذہب اسوۂ رسول اور سلف صالحین کے طریقے میں منحصر ہے، یہی آخرت میں کام آنے والی چیز ہے، یہی دنیا میں ترقیات کا سبب ہے، اسی پر عمل کرکے پہلے لوگ بام ترقی پر پہونچے تھے جن کے احوال

واقعات آنکھوں کے سامنے ہیں، اور کوئی تاریخ سے واقف شخص اس چیز سے انکار نہیں کرسکتا، اس کے خلاف میں مسلمانوں کے لئے ہلاکت ہے بربادی ہے، آخرت کا خسارہ ہے، دنیا کا نقصان ہے تجویزیں جتنی چاہے کرلی جائیں، ریزولیشن جتنے چاہے پاس کرلئے جائیں، اخبارات کے مقالے جتنے چاہے لکھ لئے جائیں اور مزہ لے کر پڑھ لئے جائیں، سب بے سود ہیں، بیکار ہیں، مسلمان کی ترقی و فلاح کا واحد راستہ معاصی سے پرہیز ہے، اور اسلامیات کا اہتمام ہے، اس کے سوا دوسرا راستہ منزل مقصود کی طرف ہے ہی نہیں۔

یہاں ایک اور چیز پر بھی غور کرتے چلو آج اسلام کو مسخ کر دیا جائے اس کے سارے احکام کو مولویانہ اسلام، راہبانہ مذہب، ملانہ تنگ نظری کہہ دیا جائے مگر جن اسلاف نے ہزاروں فتح کئے تھے، لاکھوں کروڑوں آبادیوں کو مسلمان کرکے اسلام کی حکومت وہاں قائم کی تھی، وہ اسی مولویانہ اسلام کے عامل تھے، اور ملانوں سے زیادہ تنگ نظر تھے، وہاں دین سے ایک انچ ہٹنا بھی ہلاکت شمار کیا جاتا تھا، وہاں زکوٰۃ ادا نہ کرنے پر قتال کیا جاتا تھا، وہاں شراب کو حلال سمجھ کر پینے پر قتل کیا جاتا تھا، اور حرام سمجھنے کے باوجود پینے پر کوڑے لگائے جاتے تھے، وہ حضرات یہ فرماتے ہیں کہ ہم میں سے نماز کو ایسا منافق چھوڑ سکتا ہے جس کا نفاق بالکل واضح ہو یعنی عام منافقین کی بھی ہمت نہ ہوتی تھی کہ نماز کو چھوڑ سکیں، وہاں جب کوئی اہم مشکل اور گھبراہٹ کی بات پیش آتی تھی تو فوراً نماز کی طرف رجوع کیا جاتا تھا۔[1]

---

[1] مسلمانوں کی پریشانیوں کا بہترین علاج ص۵۳ تا ۵۷ مختصراً۔

ایک مخلصانہ نصیحت

"میری ایک نصیحت بہت غور سے سنو! ہمیشہ ایسی چیزوں پر لب کشائی کرو جس کے پورے مالۂ وما علیہ پر عبور ہو، دو شخصوں کے درمیان میں محاکمہ جب ہی ممکن ہو سکتا ہے، جب ان دونوں کے پورے دلائل پر عبور ہو، البتہ کسی شرعی منصوص کے خلاف کوئی چیز ہو تو اس میں کسی کی بھی رعایت نہیں کہ اللہ اور اس کے رسول کے خلاف کوئی قول معتبر نہیں بلکہ فقہاء سلف کے منصوص اقوال کے خلاف بھی مقلد کے لئے کوئی گنجائش نہیں، لیکن جہاں مسئلہ استنباط سے تعلق رکھتا ہو، نصوص شرعیہ ہر ایک کے ساتھ ہوں وہاں جلدی سے دخل در معقولات کر کے فوراً محاکمہ کر دینا حماقت ہے، میں تم کو بڑے زور سے روکتا ہوں کہ اہل حق پر انکار کرنے میں کبھی بھی جلدی نہ کرنا، بہت غور و فکر اور تدبر کے بعد لب کشائی کرنا جہاں تک ممکن ہو اس سے گریز کرنا۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ جن کو عمر ثانی کہا جاتا ہے، انھوں نے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی آپس کی لڑائی میں کس قدر بہترین فیصلہ کیا "تلك دماء طهر الله ايدينا منها فلا نلوث السنتنا بها" ان خونوں سے اللہ جل شانہٗ نے ہمارے ہاتھوں کو پاک رکھا، تو ہم اپنی زبان کو کیوں ان سے آلودہ کریں، اگر یہ کہا جائے کہ حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی شان اعلیٰ و ارفع ہے، دوسروں کو ان پر کیسے قیاس کیا جا سکتا ہے تو میں کہوں گا کہ وہاں لب کشائی سے بچنے والے بھی حضرت عمر بن عبد العزیزؒ ہیں، جو جلیل القدر تابعی ہیں، حضرت خضر، حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہما السلام کا قصہ مشہور ہے، قرآن پاک میں مفصل مذکور ہے، متعدد احادیث میں نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد وارد ہوا ہے کہ

اللہ جل شانہ، حضرت موسیٰ (علیٰ نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام) پر رحم فرمائیں اگر وہ سکوت کرتے تو اور بھی عجائبات حضرت خضر کے کارناموں کے معلوم ہوتے، حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مقولہ ہے کہ امور تین طرح کے ہوتے ہیں، ایک وہ جن کا رشد (ہدایت) ہونا کھلا ہوا ہو ان کا اتباع کرو، دوسرے وہ امور ہیں جن کا گمراہی ہونا کھلا ہوا ہو ان سے اجتناب کرو، تیسرے وہ ہیں جن میں اختلاف ہو ان کو ان کے عالم کے حوالہ کرو (رواہ الطبرانی ورجالہ موثوقون کذا فی مجمع الزوائد)۔

حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص فتویٰ دینے پر زیادہ جری ہے، وہ جہنم پر زیادہ جری ہے (دارمی) حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص ہر استفتاء کا جواب دے وہ مجنون ہے[۱]" (دارمی)

ایک ایمان افروز واقعہ

"حضرت سعیدؒ بن المسیب مشہور تابعی ہیں، بڑے محدثین میں شمار ہیں، ان کی خدمت میں ایک شخص عبد اللہ بن ابی وداعہؒ کثرت سے حاضر ہوا کرتے تھے، ایک مرتبہ چند روز حاضر نہ ہو سکے کئی روز کے بعد جب حاضر ہوئے تو حضرت سعید نے دریافت فرمایا کہاں تھے، عرض کیا کہ میری بیوی کا انتقال ہو گیا ہے اس کی وجہ سے مشاغل میں پھنسا رہا، فرمایا کہ ہم کو خبر نہ کی ہم بھی جنازہ میں شریک ہوتے، تھوڑی دیر کے بعد میں اٹھ کر آنے لگا، فرمایا دوسرا نکاح کر لیا؟ میں نے عرض کیا، حضرت مجھ سے کون نکاح کر دے گا، دو تین

---

[۱] الاعتدال فی مراتب الرجال ص ۲۳ تا ۲۵

آنے کی میری حیثیت ہے آپ نے فرمایا ہم کردیں گے، اور یہ کہہ کر خطبہ پڑھا اور اپنی بیٹی
کا نکاح نہایت معمولی مہر آٹھ دس آنے پر مجھ سے کر دیا (اتنی مقدار مہر کی ان کے نزدیک
جائز ہوگی، جیسا کہ بعض اماموں کا مذہب ہے حنفیہ کے نزدیک ڈھائی روپئے سے
کم جائز نہیں) نکاح کے بعد میں اٹھا اور اللہ ہی کو معلوم ہے کہ مجھے کس قدر مسرت بھی،
خوشی میں سوچ رہا تھا کہ رخصتی کے انتظام کے لئے کس سے قرض مانگوں، کیا کروں، اسی فکر
میں شام ہو گئی، میرا روزہ تھا، مغرب کے وقت روزہ افطار کیا نماز کے بعد گھر آیا چراغ جلایا
روٹی اور زیتون کا تیل موجود تھا اس کو کھانے لگا کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا میں نے پوچھا
کون ہے؟ کہا سعید ہے، میں سوچنے لگا کہ کون سعید ہے، حضرت کی طرف میرا خیال بھی
نہیں گیا کہ چالیس برس سے اپنے گھر یا مسجد کے سوا کہیں آنا جانا تھا ہی نہیں باہر آکر
دیکھا کہ سعید بن المسیبؒ ہیں میں نے عرض کیا آپ نے مجھے نہ بلا لیا، فرمایا میرا ہی آنا
مناسب تھا، میں نے عرض کیا کیا ارشاد ہے؟ فرمایا مجھے یہ خیال آیا کہ اب تمہارا نکاح
ہو چکا ہے، تنہا رات کو سونا مناسب نہیں اس لئے تمہاری بیوی کو لایا ہوں، یہ فرما کر
اپنی لڑکی کو دروازے کے اندر کر دیا اور دروازہ بند کر کے چلے گئے، وہ لڑکی شرم کی
وجہ سے گر گئی میں نے اندر سے کواڑ بند کئے اور وہ روٹی اور تیل جو چراغ کے
سامنے رکھا تھا، وہاں سے ہٹا دیا کہ اس کی نظر نہ پڑے اور مکان کی چھت پر چڑھ کر
پڑوسیوں کو آواز دی، لوگ جمع ہو گئے تو میں نے کہا کہ حضرت سعیدؒ نے اپنی لڑکی سے
میرا نکاح کر دیا ہے، اور اس وقت وہ خود ہی اس کو پہونچا گئے ہیں، سب کو بڑا تعجب
ہوا، کہنے لگے واقعی وہ تمہارے گھر میں ہے؟ میں نے کہا ہاں! اس کا چرچا ہوا میری
والدہ کو خبر ہوئی وہ بھی اسی وقت آگئیں، اور کہنے لگیں کہ اگر تین دن تک تو نے اسے چھیڑا

تو تیرا منہ نہ دیکھوں گی، ہم تین دن میں اس کی تیاری کرلیں تین دن کے بعد جب میں اس لڑکی سے ملا، تو دیکھا نہایت خوبصورت قرآن شریف کی بھی حافظ اور سنت رسولؐ سے بھی زیادہ واقف، شوہر کے حقوق سے بھی زیادہ با خبر ایک مہینہ تک نہ تو حضرت سعیدؒ میرے پاس آئے نہ میں ان کی خدمت میں گیا ایک ماہ کے بعد میں حاضر ہوا تو وہاں مجمع تھا، میں سلام کر کے بیٹھ گیا جب سب چلے گئے تو فرمایا اس آدمی کو کیسا پایا میں نے عرض کیا نہایت بہتر ہے کہ دوست دیکھ کر خوش ہوں دشمن جلیں، فرمایا اگر کوئی بات ناگوار ہو تو لکڑی سے خبر لینا میں واپس آگیا، تو ایک آدمی کو بھیجا جو بیس ہزار درم (تقریباً پانچ ہزار روپیہ) مجھے دے گیا، اس لڑکی کو عبدالملک بن مروان بادشاہ نے اپنے بیٹے ولید کے لئے جو ولی عہد بھی تھا مانگا تھا، مگر حضرت سعیدؒ نے عذر کر دیا تھا، جس کی وجہ سے عبدالملک ناراض بھی ہوا، اور ایک حیلہ سے حضرت سعیدؒ کے سو کوڑے سخت سردی میں لگوائے اور پانی کا گھڑا بھی ان پر گروایا۔[1]"

مسلمان کی غیبت اور آبروریزی

"اللہ کا راستہ صرف جہاد میں یا نوافل میں یا دوسری عبادات میں منحصر نہیں بلکہ ضروری اعمال و عبادات کرنے کے بعد جو کام بھی نیک نیتی سے کیا جائے اللہ کی رضا اس میں مقصود ہو اداء حقوق اس کی غرض ہو وہ سب اللہ ہی کا راستہ ہے، جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دینداری صرف عبادات میں مشغولی کا نام ہے، اور دنیاداری کے کاموں میں مشغول ہونا اس کے

---

[1] فضائل ذکر ص۱۵۴ تا ۱۵۵

منافی ہے وہ غلطی پر ہیں معتبر علماء میں سے کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ اسباب معیشت کو حاصل نہ کیا جائے یا ترک کر دیا جائے البتہ یہ ضرور ہے کہ ان کو دنیا کی غرض سے نہ کیا جائے ان کو بھی اللہ ہی کی رضا کے واسطے اس کے مقرر کئے ہوئے حقوق کے واسطے حاصل کیا جائے وجاہت، تفاخر، تکبر، اور لوگوں کی نگاہ میں بڑائی حاصل کرنے کے واسطے نہ کیا جائے، مگر اس سب کے باوجود دوسری جانب بھی قابل لحاظ ہے، وہ یہ کہ ہر شخص کو صاحب غرض سمجھنا یہ بھی اسلامی تعلیم کے منافی ہے، اللہ جل جلالہ کا ارشاد ہے "یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا" (سورہ حجرات رکوع ۲) اے ایمان والو بہت سے گمانوں سے بچا کرو اس لئے کہ بعضے گمان گناہ ہوتے ہیں اور (کسی کے عیب کا) تجسس بھی نہ کیا کرو اور کوئی کسی کی غیبت بھی نہ کیا کرے، ہم لوگوں کی عام حالت یہ ہے کہ جو شخص ہماری مرضی کے موافق کام کرتا ہے، وہ مخلص ہے، متقی ہے، پرہیزگار ہے، لیکن جوں ہی وہ ہماری رائے کے خلاف کوئی کام کر گزرتا ہے، وہ لوڈی ہے، انگریز پرست ہے، یا ہندو پرست ہے، خود غرض ہے، نفس پرست ہے، غدار قوم ہے، مکار ہے، دغاباز ہے، وہ انگریزوں کا وظیفہ خوار ہے، یا کانگریس کا تنخواہ دار ہے، غرض یہ کہ دنیا بھر کے عیوب اس میں جمع ہو جاتے ہیں، حالانکہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص مسلمان کی عیب پوشی کرتا ہے، حق تعالےٰ شانہ قیامت میں اس کی عیب پوشی کریں گے اور جو شخص مسلمان کی پردہ دری کرتا ہے، حق تعالےٰ شانہ اس کی پردہ دری کرتے ہیں، حتیٰ کہ وہ اپنے گھر میں (چھپ کر) کوئی عیب کرتا ہے تب بھی اس کو فضیحت کرتے ہیں۔[1]

---

[1] الاعتدال فی مراتب الرجال ص ۱۲۶ تا ۱۲۸

حج فنائیت اور عشق کا دلآویز منظر

حج درحقیقت دو منظروں کا نمونہ ہے اور اس کی ہر ہر چیز میں دو حقیقتیں پنہاں ہیں ایک یہ کہ نمونہ ہے موت کا اور مرنے کے بعد کے حالات کا اور دوسرا نمونہ ہے عشق اور محبت کے اظہار کا اور روح کو حقیقی عشق اور حقیقی محبت سے رنگنے کا ——— پہلا نمونہ موت اور اس کے مابعد کا منظر ہے کہ آدمی جس وقت گھر سے چلتا ہے، سب عزیز و اقارب گھر بار وطن، احباب کو یکلخت چھوڑ کر دوسرے ملک گویا دوسرے عالم کا سفر اختیار کرتا ہے، جن چیزوں کے ساتھ دل مشغول تھا گھر بار، کھیتی، باغ، احباب کی مجلسیں سب ہی اس وقت چھوٹ رہی ہیں جیسا کہ مرنے کے وقت سب کو یک وقت خیرباد کہنا پڑتا ہے، حج کو روانگی کے وقت یہی چیز قابل غور و فکر اور قابل عبرت و اعتبار ہے کہ جیسا آج عارضی مدت کے لئے یہ سب کچھ چھوٹ رہا ہے، بہت جلد وہ وقت بھی آنے والا ہے کہ ہمیشہ کے لئے یہ سب چیزیں چھوٹنے والی ہیں۔

دوسرا منظر اظہارِ عشق و محبت کا ہے، وہ حاجی کے حال سے ایسا ظاہر اور واضح ہے کہ اس کے لئے کسی تفصیل کی حاجت نہیں ——— بندوں کا تعلق حق تعالےٰ و تقدس کے ساتھ دو طرح کا ہے، ایک نیازمندی اور بندگی کا کہ وہ پاک ذات مالک ہے، خالق ہے، اس تعلق کا مظہر نماز ہے، جو سراسر نیاز اور اظہار عبدیت ہے، اسی لئے اس میں ساری چیزیں اسی تعلق کا مظہر ہیں کہ نہایت وقار اور سکون کے ساتھ موزوں لباس اور شاہی آداب کے مناسب حالات کے ساتھ حاضری دربار کی ہے کہ وضو اور پاک کپڑوں کے ساتھ نہایت وقار و سکون سے اول کانوں پہ ہاتھ رکھ کر عبدیت اور اللہ جل شانہ کی

بڑائی کا اقرار کرے، پھر ہاتھ باندھ کر معروضہ پیش کرے پھر سر جھکا کر تعظیم کرے اور پھر زمین پر ماتھا رگڑ کر اپنی نیازمندی اور عجز کا اظہار کرے اور آقا کی بڑائی کا زبان سے اقرار کرتا رہے اور کوئی قول و فعل اس کی بڑائی اور اپنے عجز کے خلاف نہ ہو۔

دوسرا تعلق محبت و عشق کا ہے کہ وہ مربی ہے منعم ہے محسن ہے، جمال و کمال کے جتنے اوصاف ہو سکتے ہیں، ان سب کے ساتھ متصف ہے، ادھر ہر آدمی میں فطری طور پر عشق و محبت کا مادّہ موجود ہے۔

ازل سے حسن پرستی لکھی تھی قسمت میں　　مرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا

جو چشم کہ بے نم ہو وہ ہو کور تو بہتر　　جو دل کہ ہو بے داغ وہ جل جائے تو اچھا

ترے فراق میں جینا بشر کا کام نہیں　　ہزار شکر کہ اس عمر کو دوام نہیں

اسی تعلق کا مظہر حج ہے کہ سفر کی ابتداء ہی میں سب تعلقات کو ختم کر کے، سب عزیز و اقارب گھر باہر سے منہ موڑ کر کوچۂ یار کی طرف جانا ہے، اور جنگلوں اور گلی کوچوں میں مارے مارے پھرنا ہے کہ یہی دو چیزیں عاشقوں کا کام ہیں۔

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوانِ عشق

او بصحرا رفت و ما در کوچہ ہا رسوا شدیم

اور یہ ساری وحشت اور اشتیاق کیوں ہے، یہ اضطراب و بے چینی آخر کیوں مسلط ہوئی ہے؟ اس لئے کہ محبوب کے در پر عشاق کے اجتماع کا ایک وقت مقرر ہے، وہ وقت قریب آ گیا ہے۔

اجازت ہو تو آ کر میں بھی شامل ان میں ہو جاؤں

سُنا ہے کل ترے در پر ہجوم عاشقاں ہو گا

اور جب اس ارادہ اور جذبہ سے گھر سے نکلنا ہے تو یہ خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ عشق میں مصائب ایک لازمی چیز ہے ؎

سالکِ راہِ محبت کا خدا حافظ ہے
اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

جب عشق کے طفیل یہ مبارک سفر ہے تو راستے کی سب مشقتیں اسی ذوق اور جذبہ کے ماتحت ہونا ضروری ہیں، اور اسی فریفتگی سے انھیں برداشت کرنا چاہیئے ؎

الفت میں برابر ہے جفا ہو کہ وفا ہو
ہر چیز میں لذت ہے اگر دل میں مزا ہو

اس کے بعد احرام بھی اسی عاشقانہ رنگ کا پورا مظہر ہے کہ نہ سر پر ٹوپی نہ بدن پر کرتہ، فقیرانہ صورت، نہ خوشبو نہ زینت، ایک مجنونانہ ہیئت جو کرب و بے چینی کے کمال کو ظاہر کرتی ہے ؎

نہ رکھ لباس کا الجھاؤ تن پہ دستِ جنوں
کیا ہے چاک گریباں تو پھاڑ دامن بھی

اصل یہ تھا کہ گھر سے نکلتے ہی یہ حالت شروع ہو جاتی، اس وجہ سے بعض علماء کے نزدیک گھر ہی سے احرام باندھ کر جانا افضل ہے، مگر چونکہ احرام کے بعد بہت سی چیزیں حرام ہو جاتی ہیں، اور اس قسم کے لباس کا تحمل بھی بعض ناز پروردہ لوگوں کو مشکل ہو جاتا ہے، اس لئے اللہ کی رحمت نے اس کی اجازت دے دی کہ شروع سے احرام نہ باندھا جائے کہ اس میں مشقت ہو گی، البتہ جب کوئے یار کے قریب پہنچے تو اس کا اہتمام ضروری ہے کہ اس کے کوچہ میں اسی حال میں داخل ہونا ہے کہ سر پہ بال بکھرے ہوئے ہوں از خود رفتہ عاشقوں کی سی صورت ہو، اسی کو حضورِ اقدس نے اپنے پاک ارشاد میں ظاہر فرمایا،

"الحاج الشعث التفل" اسی حالت کو حق تعالےٰ شانہٗ خود بھی تفاخر کے طور پر فرشتوں سے ظاہر فرماتے ہیں "انظروا الی زوّار بیتی قد جاء ونی شعثا غبرا" میرے گھر کے مشتاقوں کو دیکھو کہ میری طرف بکھرے ہوئے بالوں اور گرد و غبار کی حالت میں آئے ہیں۔

اسی حالت میں مستانہ وار اللھم لبیک لبیک۔ لاشریک لک لبیک کا نعرہ لگاتا ہوا روتا اور چلاتا ہوا، نالہ و فریاد کرتا ہوا پہنچتا ہے، اسی کی طرف حضور اقدسؐ نے اپنے پاک ارشاد "الحج العج والثج" میں ارشاد فرمایا کہ حج (کا کمال) خوب چلانا اور قربانی کا خون بہانا ہے، اور ظاہر بات ہے کہ نالہ و فریاد کے ساتھ چلانا عشق کی جان ہے ؎

نالہ کر لینے دیں للہ نہ چھیڑیں احباب
ضبط کرتا ہوں تو تکلیف سوا ہوتی ہے

اسی بے چینی اور اضطراب، نالہ و فریاد کے ساتھ آخر وہ محبوب کے شہر تک پہنچ جاتا ہے، اور مکۂ مکرمہ میں داخل ہو جاتا ہے ؎

جذبِ دل نے آج کوئے یار میں پہنچا دیا
جیتے جی میں گلشنِ جنت میں داخل ہو گیا

ایک دل کھویا ہوا جس کے دل میں واقعی زخم محبت ہو جب محبوب کے گھر پہنچ جاتا ہے تو اس پر کیا گذرتی ہے اور وہ کیا سوچتا ہے، یہ چیزیں الفاظ سے تعبیر نہیں ہوتیں ـــــ اس کے بعد وہ جو جو حرکتیں کرتا ہے، وہ کسی ضابطہ اور آئین کی پابند نہیں، کہیں محبوب کے گھر کے چکر کاٹتا ہے کہیں اس کے در و دیوار اور چوکھٹ کو چومتا ہے، آنکھیں ملتا ہے پیشانی اور سر رگڑتا ہے ؎

سر کو وحشت میں پہاڑوں سے بچا کر لایا
در و دیوارِ سرِ کوچۂ جاناں کے لئے

کعبہ شریف کے پردہ سے پٹنا چمٹنا بھی اسی عاشقانہ شان کا ایک خاص منظر ہے کہ محبوب کے دامن سے چمٹنا بھی عشق کے مظاہر میں سے ایک مخصوص مظہر ہے ۔

اے ناتوانِ عشق تجھے حُسن کی قسم
دامن کو یوں پکڑ، کہ چھڑایا نہ جا سکے

اس کے بعد صفا مروہ کے درمیان دوڑنا بھی اسی مجنونانہ انداز کا ایک پرکیف منظر ہے، کہ ننگے سر، نہ کرتہ نہ پائجامہ ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر بھاگے بھاگے پھر رہے ہیں ۔

اب نہیں دل کو کسی صورت قرار
اس نگاہِ ناز نے کیا سحر ایسا کر دیا

اس سب کے بعد منیٰ میں شیاطین کے پتھر مارنا اس جنون و وحشت کے آخری حصہ کا نظارہ ہے، جو عشاق کو پیش آتا ہے، عاشق کا جنون جب حد سے تجاوز کرتا ہے تو وہ ہر اس شخص کے پتھر مارا کرتا ہے جس کو وہ اپنے کام میں مخل سمجھتا ہے ۔ ع

میں اسے سمجھوں ہوں دشمن جو مجھے سمجھائے ہے

اور سب سے آخر میں قربانی جو حقیقۃً اپنی جان کی قربانی ہے، اللہ جل شانہ نے اپنی غایتِ رحمت اور رافت سے اس کو جانور کی یعنی مال کی قربانی سے بدل دیا ہے، یہی عشق کا منتہا اور آخری حال ہے ۔

موت ہی ہے علاج عاشق کا
اس سے اچھی نہیں دوا کوئی[1]

---

[1] فضائل حج از صا۴۱ تا ۵۲ مختصراً

مقامِ صحابہؓ

"بعض صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے بعض بڑی خطائیں سرزد ہو جانے پر کبھی بھی کوئی خلجان طبیعت میں نہیں آیا، جب کہ مشائخ عظام سے ایسی خطاؤں کا صدور بعید تر ہے، اور کوئی بڑے سا بڑا شیخ بھی ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی کے برابر نہیں ہو سکتا تو ان کی معاصی کی روایات پر اللہ کے فضل سے مجھے کبھی اشکال نہیں ہوا، اکابر کی جوتیوں اور احادیث کی برکت سے ان سب کے متعلق ہمیشہ یہی ذہن میں رہا کہ یہ افعال ان حضرات سے تعلیم کی تکمیل کے لئے تکوینی طور سے کرائے گئے۔ ع

تو مشق ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

ان انفاس قدسیہ نے اپنے آپ کو پیش کیا کہ آپ اپنی شریعت مطہرہ کی تکمیل کیجئے ہم اس کے لئے سنگسار ہونے کو تیار ہیں، ہاتھ کٹانے کو تیار ہیں، کوڑے کھانے کو تیار ہیں یہی میرے نزدیک مصداق ہے قرآن کریم کی آیت "فاؤلئك يبدّل الله سيّاٰتهم حسنات" کا (بس یہی لوگ ہیں کہ اللہ تعالےٰ ان کے گناہوں کو نیکیوں سے بدل دے گا) اور یہی مصداق ہیں ان احادیث مغفرت کے جس میں ہے کہ بعض خوش نصیبوں کو کہا جا گا، کہ "ہر گناہ کے بدلے میں ایک نیکی دے دو"۔

یہاں ایک بات نہایت قابل اہتمام یہ ہے کہ یہ مراحم خسروانہ کہلاتے ہیں کہ مراحم خسروانہ میں قاتلوں کو پھانسی کی سزا سے بھی معاف کر دیا جاتا ہے لیکن اس اطمینان پر کہ میں تو مراحم خسروانہ میں چھوٹ جاؤں گا، قتل کی ہمت کوئی نہیں کرتا، البتہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق مجھے یقین ہے کہ انشاء اللہ صحابۂ کرامؓ سب ان میں داخل ہیں، اس لئے کہ

ان کے معاصی کے جو قصے احادیث میں آتے ہیں، وہ انھیں مراحم خسروانہ کے مستحق ہیں، حضرت ماعزؓ سے زنا صادر ہو جاتا ہے، حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرتے ہیں کہ یا رسول اللہؐ مجھے پاک کر دیجئے، حضور اقدسؐ نے فرمایا: جا استغفار کر توبہ کر، وہ تھوڑی دور جاتے ہیں، بے چینی غالب ہوتی ہے، پھر آکر یہی عرض کرتے ہیں اور حضور اقدسؐ کا یہی جواب ہوتا ہے، چار دفعہ یہی واقعہ پیش آتا ہے کہ حضور اقدسؐ انھیں توبہ و استغفار کی تاکید کر کے واپس کر دیتے ہیں، چوتھی دفعہ میں حضور اقدسؐ حسب قواعد شرعیہ سنگسار کرنے کا حکم فرماتے ہیں۔

اس پر دو صحابہ نے یوں کہا کہ اس شخص کے گناہ پر اللہ تعالےٰ نے پردہ ڈالا، مگر اس نے اپنے آپ کو پیش کیا حتی کہ کتے کی طرح سے رجم کیا گیا، حضور اقدسؐ نے یہ سن کو سکوت فرمایا اور آگے تھوڑی دیر چلے تھے کہ ایک گدھا مرا پڑا تھا، اور اس کا پیٹ پھولا ہوا تھا جس کی وجہ سے اس کی ایک ٹانگ ابھر گئی تھی، حضور اقدسؐ نے فرمایا کہ فلاں فلاں کہاں ہیں؟ انھوں نے کہا ہم حاضر ہیں، حضور اقدسؐ نے فرمایا اس مردار میں سے کھاؤ، انھوں نے کہا کہ اس میں سے کون کھا سکتا ہے، حضور اقدسؐ نے فرمایا کہ تم نے جو مسلمان بھائی کی آبروریزی کی وہ اس سے زیادہ سخت ہے، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، وہ اس وقت جنت کی نہروں میں غوطہ لگا رہا ہے۔

احادیث کی کتاب الحدود میں متعدد روایات ان قصوں کی وارد ہوئی ہیں، ہم میں سے بڑے سے بڑا بھی کوئی ایسا ہے، جو گناہ پر اتنا بے چین ہو جائے جتنا یہ حضرات ہوتے تھے۔؟

اللہ جل شانہ عالم الغیب ہیں، وہ سب کے گناہوں کو بھی جانتے ہیں، اور

گناہوں کے بعد ان کے حالات کو بھی اسی لئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں باوجود معاصی کے بھی اپنی رضا اور خوشنودی کے پروانے جگہ جگہ ارشاد فرماتے ہیں "وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ" (اور جو مہاجرین اور انصار سابق اور مقدم ہیں، اور جتنے لوگ اخلاص (احسان) کے ساتھ ان کے پیرو ہیں، اللہ تعالےٰ ان سب سے راضی ہوا، اور وہ سب اس سے راضی ہوئے، اور اللہ تعالےٰ نے ان کے لئے ایسے باغ مہیا کر رکھے ہیں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی، جن میں ہمیشہ رہیں گے، اور یہ بڑی کامیابی ہے[1] ۔ بیان القرآن)"

اختلاف صحابہ کے اسباب اور اس کی ضرورت وافادیت

"یہاں ایک اشکال یہ وارد ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم جبکہ تعلیم امت ہی کے لئے مبعوث ہوئے تھے، اور یہی بڑی غرض حضور کی تشریف آوری سے وابستہ تھی، تو آپ نے جملہ احکام شرعیہ کو مفصل وواضح ممتاز حالت میں کیوں نہ ارشاد فرما دیا جس سے یہ الجھن ہی یکسر اٹھ جاتی اور کسی قسم کی خلش ہی باقی نہ رہتی، ظاہری صورت میں تو یہ اشکال بہت ہی واضح ہے لیکن حقیقت میں نہایت ہی مہمل خدشہ ہے، جو احکام شرعیہ پر قلتِ نظر سے وارد ہوتا ہے، اور فی الواقع حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا امت کے حال پر غایت درجہ کرم اور شفقت تھی کہ ان معمولی فروعی مسائل کا ایسا انضباط نہیں فرمایا کہ جس کی وجہ سے امت کو تنگی پیش آئے بلکہ احکام دینیہ کو دو حصوں پر منقسم فرما دیا ایک وہ احکام ہیں، جن میں غور وخوض

---

[1] شریعت وطریقت کا تلازم ص۱۲ تا ۱۷ مختصرا۔

وبحث ومباحثہ غیر پسندیدہ قرار فرمادیا دوسرے وہ احکام ہیں، جن میں اختلاف کو رحمت کا سبب قرار دیا، اور سہولت امت کے لئے ہر فعل کو خواہ وہ غلط ہی کیوں نہ ہو باعث اجر قرار دے دیا، بشرطیکہ محض لاپرواہی سے غلط روی اختیار نہ کی ہو، دوسرے الفاظ میں یہ سمجھنا چاہیئے کہ شریعت نے احکام کو دو طریقوں پر منقسم کر دیا، ایک قطعی جن میں کرنے والوں کے فہم و سمجھ کا دخل نہیں رکھا، واضح الفاظ میں بیان فرمادیئے اوران میں توجیہ وتاویل کی بھی گنجائش نہیں رکھی، تاویل سے بھی انحراف کرنے والے کو خاطی وگمراہ قرار دیا، دوسرے وہ احکام ہیں، جن میں شریعت نے تنگی نہیں فرمائی بلکہ اس میں امت کے ضعف پر نظر فرماتے ہوئے امت کی سہولت کو مدنظر رکھا اور اس میں توجیہ وتاویل کی وجہ سے عمل نہ کرنے والوں کو خاطی اور بد دین سے تعبیر نہیں فرمایا قسم اول کو اعتقادیات سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور قسم ثانی کو جزئیات، فرعیات، شرعیات وغیرہ وغیرہ اسمأ سے پکارا جاتا ہے، اس دوسری نوع میں حقیقۃ الامر یہ ہے کہ شریعت نے اس میں خود ہی تنگی نہیں فرمائی، اس لئے اس کو تفصیل کے ساتھ کہ ارکان وواجبات وغیرہ خود شارع کی جانب سے ممیز و مفصل ہو جاتے تو یہ بھی نوع اول میں داخل ہو کر امت کے لئے سخت تنگی کا سبب ہو جاتا اور حقیقت یہ ہے کہ اس وقت بھی اختلاف سے خلو مشکل ہوتا اس لئے کہ وہ حقائق سب کے سب الفاظ ہی کے ذریعہ سے ارشاد فرمائے جاتے، اور الفاظ میں پھر مختلف محامل نکلنا قریب تھا، الغرض شریعت مطہرہ نے احکام کو اصول وفروع دو امر میں منقسم فرما کر امر اول میں اختلاف کی سختی سے ممانعت فرمادی، چنانچہ آیت مقدسہ "شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ الآية" میں اختلاف فی الدین کی ممانعت ہے، اور قسم دوم میں اختلاف کو امت کے لئے رحمت کا سبب قرار دیا،

اور اسی وجہ سے اس نوع کے اختلافات میں جس کے سیکڑوں واقعات نبوی دور مقدس میں گذرے ہیں، تشدد نہیں فرمایا، امثلہ کے طور پر دوٌ واقعات کی طرف اشارہ کرتا ہوں کہ نسائی نے طارق کے واسطے سے دو صحابہ کا قصہ نقل فرمایا کہ وہ دونوں جنبی ہوئے ان میں سے ایک نے پانی نہ ملنے کی وجہ سے نماز نہیں پڑھی (غالباً تیمم کا نزول اس وقت تک نہیں ہوا ہوگا یا ان کو نہیں پہنچا ہوگا) حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کی تصویب فرمائی دوسرے صحابی نے تیمم سے نماز ادا فرمائی حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کی بھی تصویب فرمائی اسی طرح حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک جماعت کو قبیلہ بنو قریظہ میں نماز عصر پڑھنے کا حکم ارشاد فرمایا، اس پر عمل کرنے والوں میں سے بعض نے وہاں عصر پڑھنے کے حکم کو اصل قرار دیا، اور راستہ میں نماز نہ پڑھی اگرچہ نماز کو تاخیر ہوئی مگر ان لوگوں نے ظاہری امتثال امر کو ضروری خیال فرمایا، دوسری جماعت نے اسی امر کا حقیقی مقصد بعجلت پہونچنا سمجھ کر راستہ میں عصر کی نماز اپنے وقت پر ادا فرمائی، حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے دونوں فریق پر اعتراض نہیں فرمایا، بخاری میں یہ مفصل قصہ موجود ہے، اسی طرح کے اور بہت سے واقعات ہیں، بالجملہ فرعی اختلاف اور چیز ہے، اور اصولی اختلاف اور ہے، جو لوگ اس اختلاف کو اصولی اختلاف کے مشابہ سمجھ کر ایسی روایات و آیات کو اس پر چسپاں کرنا چاہتے ہیں، جو اختلافِ مذموم کے بارہ میں وارد ہوئی ہیں، وہ ان کی ناواقفیت یا دھوکہ دہی ہے اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ شریعت مطہرہ نے اس فرعی اختلاف میں بڑی وسعت و سہولت رکھی ہے، اگر یہ صورت نہ ہوتی تو امت کے لئے اسقدر تنگی پیش آجاتی کہ تحمل سے باہر ہو جاتا، اسی وجہ سے ہارون رشید نے جب بھی امام مالکؒ سے یہ درخواست کی کہ موطا امام مالک کو بیت اللہ شریف پر لٹکا کر امت کو اس پر عمل کا امر کردیں

تاکہ افتراق نہ رہے تو امام مالک رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے یہ بھی اس کو قبول نہیں فرمایا اور ہمیشہ یہی جواب دیا کہ صحابہ مسائل فرعیہ میں مختلف ہیں، اور وہ سب مصیب ہیں، بلاد متفرقہ میں دونوں کے اقوال ومسالک معمول بہا ہیں، ان کو روکنے کی کوئی وجہ نہیں، ایسے ہی جب منصور نے حج کیا اور امام مالک سے درخواست کی کہ آپ اپنی مؤلفات مجھے دے دیجئے تاکہ میں ان کی نقلیں بلاد اسلامیہ میں شائع کردوں اور مسلمانوں کو حکم کردوں کہ ان سے متجاوز نہ ہوں، تو آپ نے فرمایا کہ امیر المؤمنین! ایسا ہرگز نہ کیجئے، لوگوں کے پاس احادیث واقوال صحابہ پہونچے ہوئے ہیں، وہ ان پر عامل ہیں، ان کو اسی کے موافق عمل کرنے دیجئے، یہی منشا ہے حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا کہ میری امت کا اختلاف رحمت کا سبب ہے، اور یہی وہ کھلی رحمت ہے، جو آنکھوں سے نظر آتی ہے، آج ہر امام کے نزدیک مختلف فیہ مسائل میں دوسرے کے مذہب پر شرعی ضرورت کی وجہ سے فتویٰ دینا جائز ہے لیکن اگر یہ اختلاف نہ ہوتا تو کسی ضرورت سے بھی اجماعی اور متفق علیہ مسئلہ کو چھوڑنا جائز نہ ہوتا، غرض حقیقت میں یہ اختلاف ائمہ شرعاً مطلوب ہے جس میں ایک ہی فائدہ نہیں جو مذکور ہوا اس کے علاوہ بھی بہت سے فوائد مستتر ہیں۔[1]

اختلافات صحابہؓ کے مفید ثمرات

"حضرت عمر بن عبد العزیز جن کا لقب عمر ثانی ہے، اور ان کی خلافت خلافت راشدہ کے گویا برابر سمجھی جاتی ہے، ارشاد فرماتے ہیں کہ "ماسرّنی لوان اصحاب محمد لم یختلفوا الا انھم لو لم یختلفوا لم تکن رخصۃ" (مجھے اس بات سے مسرت نہ ہوتی کہ

---

[1] اختلاف ائمہ صنہ۳۰ تا ۳۳

حضورؐ کے صحابہ میں اختلاف نہ ہوتا اس لئے کہ ان میں اگر اختلاف نہ ہوتا تو گنجائش نہ رہتی) (زرقانی علی المواہب) دارمی نے بھی اس قسم کا مقولہ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کا نقل کیا ہے، اور اس کے بعد لکھا ہے کہ پھر حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے اپنی سلطنت میں یہ احکام بھیج دیئے کہ ہر قوم اس کے موافق عمل کرے جو وہاں کے علماء کا فتویٰ ہو، عونؒ بن عبداللہ تابعی جو بڑے قرّاء اور بڑے عابدین میں ہیں کہتے ہیں کہ مجھے یہ بات پسند نہیں کہ حضرات صحابہ کرامؓ میں اختلاف نہ ہو اس لئے کہ اگر وہ حضرات کسی چیز پر مجتمع ہوں اور پھر کوئی شخص اس کے خلاف کرے تو وہ تارک سنت ہے، اور اگر ان میں اختلاف ہو پھر کوئی شخص ان کے اقوال میں سے کسی پر عمل کرلے تو وہ حدود سنت سے نہیں نکلتا (دارمی) عبداللہ بن مبارکؒ جو جلیل القدر امام ہیں، کہتے ہیں کہ قرآن وحدیث کے مقابلہ میں کسی کا قول معتبر نہیں نہ صحابہ کے اجماعی قول کے مقابلہ میں، ہاں جس چیز میں صحابہ میں اختلاف ہے، اس میں ہم اس چیز کو اختیار کریں گے جو قرآن وحدیث کے زیادہ قریب ہوگی، دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں، صحابہ کے اقوال سے باہر نہیں جائیں گے (مقدمہ اوجز) درمختار اور شامی میں لکھا ہے کہ مجتہدین کا اختلاف رحمت ہے، اور جتنا بھی اختلاف زیادہ ہوگا رحمت زیادہ ہوگی اور میں پوچھتا ہوں کہ علماء کا اختلاف کب نہیں ہوا، کون سا دور، کون سا وقت ابتداءِ اسلام بلکہ ابتدائے عالم سے ایسا گزرا ہے، جس میں علماء کا اور اہلِ حق کا اختلاف نہیں ہوا، خود حق جل وعلا نے سارے ہی انبیاء پر کیا ایک ہی دین اتارا، اصول دین میں اتحاد رہا اور فروع میں ہمیشہ اختلاف رہا، کیا داؤدؑ اور حضرت سلیمان علیٰ نبینا وعلیہما السلام کے متعدد فیصلوں میں اختلاف نہیں ہوا، اور باوجود اس اختلاف کے حق تعالیٰ شانہٗ نے دونوں کی مدح نہیں

فرمائی ہے"۔[1]

احکام دین کا استخفاف

"......نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "جو شخص قصداً بلا کسی شرعی عذر کے ایک دن بھی رمضان کے روزہ کو افطار کر دے غیر رمضان کا روزہ چاہے تمام عمر کے روزے رکھے اس کا بدل نہیں ہو سکتا"۔

بعض علماء کا مذہب جن میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ وغیرہ حضرات بھی ہیں اس حدیث کی بناء پر یہ ہے کہ جس نے رمضان المبارک کے روزہ کو بلا وجہ کھو دیا، اس کی قضا ہو ہی نہیں سکتی چاہے عمر بھر روزے رکھتا رہے، مگر جمہور فقہاء کے نزدیک اگر رمضان کا روزہ رکھا ہی نہیں تو ایک روزے کے بدلے ایک روزہ سے قضا ہو جائیگی، اور اگر روزہ رکھ کر توڑ دیا تو قضاء کے ایک روزہ کے علاوہ دو مہینہ کا روزہ کفارہ کے ادا کرنے سے فرض ذمہ سے ساقط ہو جاتا ہے البتہ وہ برکت ہاتھ نہیں آسکتی کہ جو رمضان شریف میں روزہ رکھنے سے حاصل ہوتی یہ سب کچھ اس حالت میں ہے کہ بعد میں قضا بھی کرلے اور اگر سرے سے رکھے ہی نہیں جیسا کہ اس زمانہ کے بعض فساق کی حالت ہے تو اس کی گمراہی کا کیا پوچھنا، روزہ ارکانِ اسلام سے ایک رکن ہے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ارشاد فرمائی ہے، سب سے اول توحید و رسالت کا اقرار اس کے بعد اسلام کے چاروں مشہور رکن نمازؔ، روزؔہ، زکوٰۃؔ، حجؔ کتنے مسلمان ہیں جو مردم شماری میں مسلمان شمار ہوتے ہیں، لیکن ان پانچوں میں سے ایک بھی کرنے والے نہیں،

---

[1] الاعتدال فی مراتب الرجال ص۱۹۷ تا ۱۹۸

سرکاری کاغذات میں وہ مسلمان لکھے جائیں مگر اللہ کی فہرست میں وہ مسلمان شمار نہیں ہو سکتے، حتیٰ کہ حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں ہے کہ اسلام کی بنیاد تین چیز پر ہے، کلمۂ شہادت اور نماز، روزہ جو شخص ان میں سے ایک بھی چھوڑ دے وہ کافر ہے، اس کا خون کر دینا حلال ہے، علماء نے ان جیسی روایات کو انکار کے ساتھ مقید کیا ہو یا کوئی تاویل فرمائی ہو مگر اس سے انکار نہیں کہ نبی کریمؐ کے ارشادات ایسے لوگوں کے بارے میں سخت سے سخت وارد ہوئے ہیں، فرائض کے ادا کرنے میں کوتاہی کرنے والوں کو اللہ کے قہر سے بہت زیادہ ڈرنے کی ضرورت ہے کہ موت سے کسی کو چارہ نہیں، دنیا کی عیش و عشرت بہت جلد چھوٹنے والی چیز ہے، کار آمد چیز صرف اللہ کی اطاعت ہے، بہت سے جاہل تو اتنے ہی پر کفایت کرتے ہیں، کہ روزہ نہیں رکھتے لیکن بہت سے بددین زبان سے بھی اس قسم کے الفاظ بک دیتے ہیں، کہ جو کفر تک پہونچا دیتے ہیں، مثلاً روزہ وہ رکھے جس کے گھر کھانے کو نہ ہو، یا ہمیں بھوکا مارنے سے اللہ کو کیا مل جاتا ہے وغیرہ وغیرہ، اس قسم کے الفاظ سے بہت ہی زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے، اور بہت غور و اہتمام سے ایک مسئلہ سمجھ لینا چاہیئے کہ دین کی چھوٹی سے چھوٹی بات کا تمسخر اور مذاق اڑانا بھی کفر کا سبب ہوتا ہے، اگر کوئی شخص عمر بھر نماز نہ پڑھے کبھی بھی روزہ نہ رکھے اسی طرح کوئی اور فرض ادا نہ کرے بشرطیکہ اس کا منکر نہ ہو، وہ کافر نہیں جس فرض کو ادا نہیں کرتا اس کا گناہ ہوتا ہے، اور جو اعمال ادا کرتا ہے اس کا اجر ملتا ہے، لیکن دین کی کسی ادنیٰ سے ادنیٰ بات کا تمسخر بھی کفر ہے، جس سے اور بھی تمام عمر کے نماز، روزہ نیک اعمال ضائع ہو جاتے ہیں، بہت زیادہ قابل لحاظ امر ہے، اس لئے روزہ کے متعلق بھی کوئی ایسا لفظ ہرگز نہ کہے، اور اگر تمسخر وغیرہ نہ کرے تب بھی بغیر عذر افطار کرنے والا فاسق ہے حتیٰ کہ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ جو شخص رمضان میں علی الاعلان بغیر عذر کے کھاوے

اس کو قتل کیا جاوے لیکن قتل پر اگر اسلامی حکومت نہ ہونے کی وجہ سے قدرت نہ ہو کہ یہ کام امیر المؤمنین کا ہے تو اس فرض سے کوئی بھی سبکدوش نہیں کہ اس کی اس ناپاک حرکت پر اظہار نفرت کرے اور اس سے کم تو ایمان کا کوئی درجہ ہی نہیں کہ اس کو دل سے برا سمجھے"[1]

اسلامی اور غیر اسلامی نکاح

"علماء نے لکھا ہے کہ دو عبادتیں ایسی ہیں کہ جو حضرت آدم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام سے شروع ہو کر قیامت تک بلکہ جنت میں بھی باقی رہیں گی، ایک ایمان، دوسری نکاح، نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نکاح کو اپنی سنت قرار دیا اور ارشاد فرمایا کہ نکاح میری سنت ہے جو میری سنت سے اعراض کرے وہ مجھ سے نہیں، مگر ہم لوگوں نے اس بابرکت سنت کو بے حد لغویات اس میں شامل کر کے اس کو ایک مصیبت عظمیٰ بنا لیا حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اور آپ کے بعد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانے میں یہ سنت ہی کا درجہ رکھتا تھا، یہ لغویات جو ہم نے شامل کر لی ہیں، ان کا شائبہ بھی اس زمانے میں نہیں تھا، صحابہ کرام کو جو عشق حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے تھا، وہ کسی سے مخفی نہیں اس کے کچھ نمونے میں اپنے رسالہ "حکایات صحابہ" میں لکھ بھی چکا ہوں، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضؓ ایک مشہور صحابی ہیں، عشرۂ مبشرہ میں ہیں، حضور کے جانثاروں میں ہیں، مگر اپنی شادی میں حضورؐ کو بلانا تو درکنار خبر بھی نہ کی، جب حضورؐ نے ان کے کپڑوں پر کچھ صفرہ کا اثر دیکھا، یہ ایک قسم کی خوشبو ہے، جو اس زمانے میں شادیوں کے موقعہ پر استعمال

---

[1] فضائل رمضان صـ۳۲ تا ۳۳

کی جاتی تھی، اس کو دیکھ کر حضورؐ نے دریافت فرمایا کہ یہ کیا ہے کیا تم نے شادی کر لی،
انھوں نے عرض کیا جی حضورؐ، حضورؐ کا پاک ارشاد ہے "جو نکاح بہت ہلکا پھلکا ہو وہ
بہت مبارک ہے" مگر افسوس ہے کہ ہم نے اس مبارک سنت کو اپنی رسوم کی بدولت
مشکل ترین بنا دیا نہ معلوم کتنی نمازیں اس کی نظر ہو جاتی ہیں، بعض جگہ تو مصیبت یہ ہے کہ
عین نماز کے وقت بارات رخصت ہوتی ہے کہ جس سے دولہا دلہن اور سارے باراتیوں
کی جماعت فوت ہوتی ہے جس کی ابتدا اس نحوست سے ہوتی ہو اس کی انتہا پر آپس میں
لڑائیاں، فتنہ، فساد، جتنا ہو وہ کم ہی ہے، علماء نے لکھا ہے کہ جو حمل اس صحبت سے
ٹھہرے جو نماز کے وقت میں کی گئی ہو یعنی اس سے نماز فوت ہوئی ہو تو اس سے جو بچہ
پیدا ہوگا وہ عاق بالوالدین ہوتا ہے، یعنی والدین کا نافرمان اور ان کو تکلیف پہونچانے والا
ہوتا ہے، اللہ تعالےٰ ہماری اصلاح فرماوے، اور ہم کو ہدایت سے نوازے اور اس سے
بڑھ کر مصیبت یہ ہے کہ ان ہی لغویات کی وجہ سے لڑکیاں ایک لمبی عمر تک بیٹھی رہتی
ہیں، شادی کا انتظام نہیں ہو سکتا، اور اس سے زیادہ بڑھ کر مصیبت یہ ہے کہ بعض
جگہ اس مصیبت کے لئے سود پر روپیہ لینا پڑتا ہے جس کے متعلق قرآن پاک میں
اللہ تعالےٰ اور اس کے رسول سے لڑائی اور اعلان جنگ بتلایا گیا ہے، اللہ سے لڑائی
اور اس کے پاک رسول سے اعلان جنگ کے بعد کون پنپ سکتا ہے، اور ان ساری
مصیبتوں کا عذر اور مجبوری یہ بتلائی جاتی ہے کہ ناک کٹ جاتی ہے، میں نے تو سیکڑوں
اکابر و احباب کو ان خرافات کے بغیر سادگی کے ساتھ نکاح کرتے دیکھا مگر کسی ایک کی بھی
ناک کٹی ہوئی نہ دیکھی۔[1]

---

[1] آپ بیتی نمبر۳ یا یادِ ایام نمبر۲ ص۱۳۸ تا ۱۴۰

صحبت کا اثر

"حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد ہے کہ مسلمان کے علاوہ کسی کے ساتھ مصاحبت اور ہم نشینی نہ رکھو اور تیرا کھانا غیر متقی نہ کھائے" ف: اس حدیث پاک میں حضور اقدس ؐ نے دو آداب ارشاد فرمائے' اول یہ کہ ہم نشینی اور نشست وبرخاست غیر مسلم کے ساتھ نہ رکھو اگر اس سے کامل مسلمان مراد ہے' تب تو مطلب یہ ہے کہ فاسق فاجر لوگوں کے ساتھ مجالست اختیار نہ کر' دوسرے جملہ میں چونکہ متقی کا ذکر ہے' اس سے اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے' نیز اس سے بھی تائید ہوتی ہے کہ ایک حدیث میں حضور کا ارشاد ہے کہ نہ داخل ہوں تیرے گھر میں مگر متقی لوگ (کنز) اور اگر اس سے مطلقاً مسلمان مراد ہے' تو مطلب یہ ہے کہ کافروں کے ساتھ بے ضرورت مجالست اختیار نہ کی جائے اور ہر صورت میں تنبیہ مقصود ہے اچھی صحبت اختیار کرنے پر اس لئے کہ آدمی جس قسم کے لوگوں میں کثرت سے نشست وبرخاست رکھا کرتا ہے' اسی قسم کے آثار آدمی میں پیدا ہوا کرتے ہیں' اسی بنا پر حضورؐ کا وہ ارشاد ہے' جو ابھی گذرا کہ تیرے گھر میں متقیوں کے علاوہ داخل نہ ہوں' یعنی ان سے میل جول ہو گا تو ان کے اثرات پیدا ہوں گے' حضور اقدس ؐ کا پاک ارشاد ہے کہ صالح ہم نشیں کی مثال مشک بیچنے والے کی ہے' اگر اس کے پاس بیٹھا جائے تو وہ تجھے تھوڑا سا مشک کا ہدیہ بھی دیدیگا تو اس سے بھی خرید لے گا' اور دونوں باتیں نہ ہوں تو پاس بیٹھنے کی وجہ سے مشک کی خوشبو سے دماغ معطر رہے گا (اور فرحت پہونچتی رہے گی) اور بُرے ساتھی کی مثال لوہار کی بھٹی کے پاس بیٹھنے والے کی ہے کہ اگر اس کی بھٹی سے کوئی چنگاری اڑ کر لگ گئی تو کپڑے جلا دے گی اور یہ بھی نہ ہو تو بدبو اور دھواں تو کہیں گیا ہی نہیں (مشکوٰۃ) ایک اور حدیث میں ہے کہ آدمی

اپنے دوست کے مذہب پر ہوا کرتا ہے، پس اچھی طرح غور کر لے کہ کس سے دوستی کر رہا ہے (مشکوٰۃ) مطلب یہ ہے کہ پاس بیٹھنے کا اور صحبت کا اثر بے ارادہ رفتہ رفتہ آدمی میں سرایت کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ آدمی اس کا مذہب بھی اختیار کر لیا کرتا ہے، اس لئے پاس بیٹھنے والوں کی دینی حالت میں اچھی طرح سے غور کر لینا چاہئے، بددینوں کے پاس کثرت سے بیٹھنے سے بددینی آدمی میں پیدا ہوا کرتی ہے، روزمرہ کا تجربہ ہے کہ شراب پینے والوں کے شطرنج کھیلنے والوں کے پاس تھوڑے دن کثرت سے اٹھنا بیٹھنا ہو تو یہ مرض آدمی کو لگ جاتے ہیں، ایک اور حدیث میں ہے، حضور اقدس ﷺ نے حضرت ابو رزین رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ "میں تجھے ایسی چیز بتاؤں جس سے اس چیز پر قدرت ہو جائے جو دارین کی خیر کا سبب ہو، اللہ کا ذکر کرنے والوں کی مجلس اختیار کر اور جب تو تنہا ہوا کرے تو جس قدر بھی تو کر سکے اللہ کے ذکر سے اپنی زبان کو حرکت دیتا رہا کر اور اللہ کے لئے دوستی کر اور اسی کے لئے دشمنی کر" (مشکوٰۃ) یعنی جس سے دوستی یا دشمنی ہو وہ اللہ ہی کی رضا کے واسطے ہو، اپنے نفس کے واسطے نہ ہو، امام غزالی فرماتے ہیں کہ جس شخص کی مصاحبت اختیار کرے اس میں پانچ چیزیں ہونا چاہئیں، اول صاحب عقل ہو، اس لئے کہ عقل اصل رأس المال ہے، بے وقوف کی مصاحبت میں کوئی فائدہ نہیں ہے، اس کا مآل کار وحشت اور قطع رحمی ہے، حضرت سفیان ثوری سے تو یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ احمق کی صورت کو دیکھنا بھی خطا ہے، دوسری چیز یہ ہے کہ اس کے اخلاق اچھے ہوں کہ جب آدمی کے اخلاق خراب ہوں تو وہ عقل پر بسا اوقات غالب آجاتے ہیں، ایک آدمی سمجھ دار ہے، بات کو خوب سمجھتا ہے لیکن غصہ، شہوت، بخل وغیرہ اس کو اکثر عقل کا کام نہیں کرنے دیتے، تیسری چیز یہ ہے کہ وہ فاسق نہ ہو، اس لئے کہ جو شخص اللہ جل شانہ سے بھی نہ ڈرتا ہو اس کی دوستی کا کوئی اعتبار نہیں، نہ معلوم کس جگہ کس مصیبت میں

پھنسا دے، چوتھی چیز یہ ہے کہ وہ بدعتی نہ ہو کہ اس کے تعلقات سے بدعت کے ساتھ متاثر ہو جانے کا اندیشہ ہے اور اس کی نحوست کے متعدی ہونے کا خوف ہے، بدعتی اس کا مستحق ہے کہ اس سے تعلقات اگر ہوں تو منقطع کر لئے جائیں نہ یہ کہ تعلقات پیدا کئے جائیں، پانچویں چیز یہ ہے کہ وہ دنیا کمانے پر حریص نہ ہو کہ اس کی صحبت سم قاتل ہے اس لئے کہ طبیعت تشبہ اور اقتداء پر مجبور ہوا کرتی ہے اور مخفی طور پر دوسرے کے اثرات لیا کرتی ہے (احیاء).... اثرات کا لینا آدمیوں ہی کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ جس چیز کے ساتھ آدمی کا تلبس زیادہ ہوا کرتا ہے اس کے اثرات مخفی طور پر آدمی کے اندر آجایا کرتے ہیں حضور اقدس سے نقل کیا گیا کہ بکریوں والوں میں مسکنت ہوتی ہے اور فخر و تکبر گھوڑے والوں میں ہوتا ہے، اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ان دونوں جانوروں میں یہ صفات پائی جاتی ہیں اونٹ اور بیل والوں میں شدت اور سخت دلی بھی وارد ہوئی ہے، دوسرا ادب حدیث بالا میں یہ ہے کہ تیرا کھانا متقی لوگ ہی کھائیں یہ مضمون بھی متعدد روایات میں آیا ہے ایک حدیث میں آیا ہے کہ اپنا کھانا متقی لوگوں کو کھلاؤ اور اپنے احسان کا مومنوں کو مورد بناؤ (اتحاف) علماء نے لکھا ہے کہ اس سے مراد دعوت کا کھانا ہے حاجت کا کھانا نہیں ہے، چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ اپنے کھانے سے اس شخص کی ضیافت کرو جس سے اللہ کی وجہ سے محبت ہو (اتحاف) دفع حاجت کے کھانے میں حق تعالےٰ شانہ نے قیدیوں کے کھلانے کی بھی مدح فرمائی ہے اور قیدی اس زمانے کے کافر تھے (مظاہر)

احادیث کے سلسلے میں

گذر چکا ہے کہ ایک فاحشہ عورت کی محض اسی وجہ سے مغفرت ہوئی کہ اس نے ایک پیاسے کتے کو پانی پلایا تھا، اور بھی متعدد روایات میں مختلف مضامین سے اس کی تائید ہوتی ہے، حضور نے تو قاعدہ اور ضابطہ فرما دیا کہ ہر جاندار میں اجر ہے اس میں متقی غیر متقی، مسلم کافر، آدمی

حیوان سب ہی داخل ہیں لہٰذا احتیاج اور ضرورت کے کھانے میں یہ چیزیں نہیں دیکھی جاتیں وہاں تو احتیاج کی شدت اور قلت دیکھی جاتی ہے جتنی زیادہ احتیاج ہو اتنا ہی زیادہ ثواب ہوگا یہ کھانا دعوت اور تعلقات کا ہے اس میں بھی اگر کوئی دینی مصلحت ہو خیر کی نیت ہو تو جس درجہ کی وہ خیر اور مصلحت ہوگی اسی درجہ کا اجر ہوگا البتہ اگر کوئی دینی مصلحت نہ ہو تو پھر کھانے والا جتنا زیادہ متقی ہوگا اتنا ہی زیادہ اجر کا سبب ہوگا۔"[1]

داعیوں اور مبلغوں کی ذمہ داری

"ایک خاص مضمون پر تنبیہ مقصود ہے وہ یہ کہ جس طرح اس زمانہ میں نفس تبلیغ میں کوتاہی ہو رہی ہے اور عام طور پر لوگ اس سے بہت زیادہ غافل ہو رہے ہیں، اسی طرح بعض لوگوں میں ایک خاص مرض یہ ہے کہ جب وہ کسی دینی منصب تقریر، تحریر، تعلیم، تبلیغ، وعظ وغیرہ پر مامور ہو جاتے ہیں تو دوسروں کی فکر میں ایسے مبتلا ہو جاتے ہیں کہ اپنے سے غفلت ہو جاتی ہے، حالانکہ جس قدر دوسروں کی اصلاح کی ضرورت ہے اس سے بہت زیادہ اپنے نفس کی اصلاح کی احتیاج ہے، نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے متعدد مواقع میں بہت زیادہ اہتمام سے منع فرمایا ہے کہ لوگوں کو نصیحت کرتا پھرے اور خود مبتلائے معاصی رہے۔

آپ نے شب معراج میں ایک جماعت کو دیکھا جن کے ہونٹ آگ کی قینچیوں سے کترے جاتے تھے آپ نے دریافت فرمایا کہ یہ کون لوگ ہیں، تو حضرت جبرئیل نے عرض کیا کہ یہ لوگ آپ کی امت کے واعظ و مقرر ہیں کہ دوسروں کو نصیحت کرتے تھے، خود اس پر عمل نہیں کرتے تھے۔ (مشکوٰۃ شریف)

---

[1] فضائل صدقات اول ص ۱۱۶ تا ۱۱۸

ایک حدیث میں وارد ہے کہ اہل جنت کے چند لوگ بعض اہل جہنم سے جاکر پوچھیں گے کہ تم یہاں کیسے پہونچ گئے، ہم تو جنت میں تمہاری ہی بتائی باتوں پر عمل کرنے کی بدولت پہنچے ہیں، وہ کہیں گے کہ ہم تم کو تو بتلاتے تھے، مگر خود عمل نہیں کرتے تھے' ایک دوسری حدیث میں وارد ہے کہ بدکار قراء (علماء) کی طرف عذابِ جہنم زیادہ سرعت سے چلے گا، وہ اس پر تعجب کریں گے کہ بت پرستوں سے بھی پہلے ان کو عذاب دیا جاتا ہے' تو جواب ملے گا کہ جاننے کے باوجود کسی جرم کا کرنا انجان ہو کر کرنے کے برابر نہیں ہو سکتا"[۱]

قرآن کی حفاظت واشاعت میں سربراہان قوم کی مجرمانہ غفلت

"بیجا نہ ہوگا اگر میں یہاں پہونچ کر سربرآوردگانِ قوم کی شکایت کروں کہ قرآن پاک کی اشاعت میں آپ کی طرف سے کیا اعانت ہوتی ہے' اور یہی نہیں بلکہ خدارا ذرا غور سے جواب دیجئے کہ اس کے سلسلے کو بند کرنے میں آپ کا کس قدر حصہ ہے' آج اس کی تعلیم کو بے کار بتلایا جاتا ہے' اضاعتِ عمر سمجھا جاتا ہے' اس کو بے کار دماغ سوزی اور بے نتیجہ عرق ریزی کہا جاتا ہے' ممکن ہے کہ آپ اس کے موافق نہ ہوں لیکن ایک جماعت جب ہمہ تن اس میں کوشاں ہے تو کیا آپ کا سکوت اس کی اعانت نہیں ہے' مانا کہ آپ اس خیال سے بیزار ہیں مگر آپ کی اس بیزاری نے کیا فائدہ دیا ؎

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن
خاک ہوجائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

آج اس کی تعلیم پر بڑے زور سے اس لئے انکار کیا جاتا ہے کہ مسجد کے ملّاؤں نے اپنے

---

[۱] فضائل تبلیغ ص۱۹-۲۰

ٹکڑوں کے لئے دھندا کر رکھا ہے گویہ عامۃً نیتوں پر حملہ ہے جو بڑی سخت ذمہ داری ہے اور اپنے وقت پر اس کا ثبوت دینا ہوگا مگر میں نہایت ہی ادب سے پوچھتا ہوں کہ خدارا ذرا اس کو تو غور کیجئے کہ ان خود غرض ملّانوں کی ان خود غرضیوں کے ثمرات آپ دنیا میں کیا دیکھ رہے ہیں، اور آپ کی ان بے غرضانہ تجاویز کے ثمرات کیا ہوں گے، اور نشر و اشاعتِ کلام پاک میں آپ کی ان مفید تجاویز سے کس قدر مدد ملے گی، بہرحال حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد آپ کے لئے قرآن شریف کے پھیلانے کا ہے، اس میں آپ خود ہی فیصلہ کر لیجئے کہ اس ارشاد نبوی کی کس درجہ امتثال آپ کی ذات سے ہوا اور ہو رہا ہے، دیکھئے ایک دوسری بات کا بھی خیال رکھیں بہت سے لوگوں کا یہ خیال ہوتا ہے کہ ہم اس خیال میں شریک نہیں تو ہم کو کیا، مگر اس سے آپ اللہ کی پکڑ سے نہیں بچ سکتے، صحابہ نے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا " انُهلكُ وفينا الصّالِحُونَ قَالَ نَعم اِذا کثر الخُبثُ" (کیا ہم ایسی حالت میں ہلاک ہو جائیں گے، کہ ہم میں صلحاء موجود ہوں، حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ ہاں جب خباثت غالب ہو جاوے) اسی طرح ایک روایت میں آیا ہے کہ حق تعالےٰ شانہٗ نے ایک گاؤں کے الٹ دینے کا حکم فرمایا حضرت جبرئیلؑ نے عرض کیا کہ اس میں فلاں بندہ ایسا ہے کہ جس نے کبھی گناہ نہیں کیا ارشاد ہوا کہ صحیح ہے، مگر یہ میری نافرمانی ہوتے ہوئے دیکھتا رہا اور کبھی اس کی پیشانی پر بل نہیں پڑا، درحقیقت علماء کو یہی امور مجبور کرتے ہیں کہ وہ ناجائز امور کو دیکھ کر ناگواری کا اظہار کریں جس کو ہمارے روشن خیال تنگ نظری سے تعبیر کرتے ہیں آپ حضرات اپنی اس وسعت خیالی اور وسعت اخلاق پر مطمئن نہ رہیں کہ یہ فریضہ صرف علماء ہی کے ذمہ نہیں ہر اس شخص کے ذمہ ہے، جو کسی ناجائز بات کا وقوع دیکھے اور اس پر ٹوکنے کی قدرت رکھتا ہو پھر نہ ٹوکے[1]!

[1] فضائل قرآن مجید ص ۶۲-۶۳

INDEX

اشاریہ

"سوانح شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا سہارنپوریؒ"

مرتبہ

محمد غیاث الدین ندوی

شخصیات

(اصل نام حروف تہجی کے اعتبار سے ہیں القاب و خطابات بریکٹ میں ہیں)

غ

ف

کتابیات

مقاماتٌ

متفرقات

ادارے، تحریکات اور مدارس:

خانقاہیں اور سلسلۂ تصوف:

مطابع، نشریاتی ادارے اور کتبخانے:

مساجد:

دیگر متفرقات:

مکتبۂ اسلام کی دیگر اہم مطبوعات

• سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ۔ از مولانا ابوالحسن علی ندوی
عہد حاضر کی مشہور دینی شخصیت اور عارف باللہ حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ
کے حالاتِ زندگی، ان کی شخصیت، ان کے نمایاں صفات، ان کا اندازِ تربیت
توازن وجامعیت، تعلق باللہ، خلوص ومحبت، فیض وتاثیر اور معرفت وسلوک
کا ایمان افروز اور دلآویز تذکرہ۔ قیمت

• مطالعۂ قرآن کے اصول ومبادی از مولانا ابوالحسن علی ندوی قیمت

• حیاتِ خلیل از مولانا محمد ثانی ندوی مظاہریؒ
حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری کی مفصل سوانح حیات، خاندان اور وطن،
علمی وسیاسی ماحول، مشہور شخصیتیں اور خانوادے، تعلیمی، تدریسی اور تنظیمی سرگرمیاں،
صفات وکمالات، علمی ودینی خدمات، تزکیۂ نفوس، ارشادات وملفوظات،
تصنیفات وتالیفات، ہم عصر علماء ومشائخ کی رائیں، خلفا ومجازین کا
تذکرہ اور مظاہر العلوم کی مختصر تاریخ۔ قیمت

• زادِ سفر مترجمہ امۃ اللہ تسنیم
امام نووی رحمۃ اللہ علیہ شارح صحیح مسلم کی مقبول کتاب "ریاض الصالحین" کا سلیس
ترجمہ، ضروری حواشی وتشریحی عنوانات کے ساتھ۔ حدیث شریف کا ایک چھوٹا
سفری کتب خانہ، اور منزلِ آخرت کا بہترین زادِ سفر۔ مکمل دو جلدوں میں قیمت

دعوت و تبلیغ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ایک نادر اور مفید تحفہ

سوانح

حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی

تالیف	مقدمہ
مولانا محمد ثانی حسنی	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ

داعی اِلی اللہ حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک مکمل اور مستند سوانح حیات، اس مجاہد کی داستان جس نے اپنی جان اللہ کے راستہ میں دے دی

○ خاندان کاندھلہ جھنجھانہ کے حالات ○ حضرت مولانا محمد الیاس کا تذکرہ ○ تبلیغی جماعت کے مجاہدوں اور سفروں کی مکمل سرگزشت اور مکمل جائزہ

یہ کتاب حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمہ اللہ — کی زیرنگرانی لکھی گئی ہے ○ آخری باب حضرت شیخ الحدیث رح کے حالات پر ہے جس کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ نے مرتب کیا ہے۔

قیمت

وتزودوا فان خیر الزاد التقویٰ

زادِ سفر

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ شارح صحیح مسلم کی مقبول کتاب "ریاض الصالحین"

کا سلیس ترجمہ ضروری حواشی و تشریحی عنوانات کے ساتھ

مترجمہ

امۃ اللہ تسنیم مرحومہ

ہمشیرہ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی